ہندوستان اور ملّیت

ایک پنجابی

سنہ ۱۹۳۶ء

SIR FAZL-I-HUSAIN IN THE MAKING.

Being

A Diary of his young days.

(1898-1902)

in the Press.

ہندوستان اور ملّیت

ایک پنجابی

سنہ ۱۹۳۶ء

(جملہ حقوق محفوظ)

ملنے کا پتہ

(۱) دفتر "ادبی دنیا" کمرشل بلڈنگس مال روڈ۔ لاہور

(۲) شیخ مبارک علی اینڈ سنز تاجران کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

(۳) ۳۹۔ ایمپرس روڈ لاہور

قیمت { مجلد دو روپیہ آٹھ آنہ
غیر مجلد دو روپیہ ۔

فضل حسین

بیاد

ڈاکٹر میاں سر فضل حسین صاحب

کے سی - ایس - آئی + کے سی - آئی - ای + نائٹ -

۲

"سوال ہو سکتا ہے کہ میرے سیاسیات کے متعلق لکھنے کی وجہ کیا ہے۔ کیا میں کوئی والیِ ملک ہوں یا مقنن؟ میرا جواب ہے کہ میں ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی نہیں ہوں۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں سیاسیات کے متعلق خامہ فرسائی کر رہا ہوں۔ اگر میں والیِ ملک یا مقنن ہوتا تو یہ کہنے میں اپنا وقت ضائع نہ کرتا کہ یہ ہونا چاہئے اور وہ ہونا چاہئے۔ میں یا تو کر دکھاتا ورنہ خاموش ہو رہتا۔"

رُوسو

تمہید

ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات اس امر کے متقضی ہیں کہ عوام کی واقفیت میں اضافہ کرنے کی خاطر مغربی علوم کو ہندی زبانوں کے سانچہ میں ڈھالا جائے۔ یہ ایک بہت بڑا کام ہے لیکن افسوس ہے کہ اس بارہ میں ابھی تک کامیابی کے ساتھ کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ اقتصادیات سیاسیات۔ طبعیات۔ فلسفہ۔ طب اور ادب ایسے علوم ہیں کہ ان کو ہندی زبانوں میں منتقل کرنے کا مسئلہ تعلیم یافتہ طبقہ کی توجہ کا محتاج ہے۔ سیاسیات کے ماتحت۔ ملیت، جمہوریت سوشلزم۔ کمیونزم۔ فاسیت۔ سرمایہ داری۔ اور ناجریت ایسے موضوع ہیں کہ اُن کے متعلق ضخیم کتابیں لکھنا ہر روشن دماغ شخص کا فرض ہے "تاکہ ابنائے وطن اُن کے مطالعہ سے تمتع اندوز ہو سکیں۔ میں نے اس کتاب میں ملیت کے نظریہ پر بحث کرتے ہوئے قیامِ ملت کے مقصد کے پیشِ نظر جمہور کے سامنے ہندوستانی حالات کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اس کے لکھنے کی وجہ اقتضائے وقت اور احساس فرض کے سوا کچھ نہیں۔ عصرِ حاضر دورِ انقلاب ہے۔ ہمارا ہر شعبۂ زندگی انقلاب پذیر ہو رہا ہے جس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا مستقبل ہمارے عہدِ گذشتہ اور عہدِ حاضر دونوں سے مختلف ہوگا اور نئی قسم کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی ذمہ داریاں ملک پر عائد ہوں گی۔ عوام میں ان آئندہ عائد ہونے والی ذمہ داریوں کے متحمل ہونے کی صلاحیت اور طاقت پیدا کرنا فوری توجہ کا منتظر ہے۔ ملک آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا ہے اور

سیاسی انقلاب کی رو میں سب بہے جا رہے ہیں۔ اگرچہ معدودے چند اپنی حالت نیز ارد گرد کی حالات سے بخوبی واقف ہیں لیکن لوگوں کی ایک کثیر جماعت بے خبری کے عالم میں اس رو کے ساتھ بہی جا رہی ہے۔ اس تصنیف کا مقصد ان لوگوں کو اپنی حالت سے آگاہ کرنا ہے تاکہ وہ اپنے باہمی اختلافات کو سمجھیں، اپنی کمیوں کو پورا کریں، خامیوں سے آگاہ ہوں اور اگر ہو سکے تو قابلِ فخر مشترکہ ملی خصوصیات کو جلا دیں۔

چونکہ ہماری موجودہ سیاسی ترقی مغربی ممالک کی تقلید اور مغربی سیاسی خیالات کے تابع عمل میں لائی جا رہی ہے اس لیے یہ بھی ضروری خیال کیا گیا کہ مغربی تہذیب کے معانی، اس کے بنیادی اصول اور نشو و ارتقا کے مختلف مراحل کے متعلق بھی چند ملفوظات ہدیۂ ناظرین کر دیے جائیں چنانچہ کتاب کے اخیر میں مغربیت اور مغربی تہذیب کی تصریح کر دی گئی ہے۔ ضمنی طور پر جمہوریت کا بھی مختصراً تذکرہ کیا گیا ہے۔

اِس کتاب میں بعض امور پر بخوفِ طوالت تفصیلاً بحث نہیں کی گئی۔ امید ہے کہ قارئین کرام اس کمی کو اپنے تعقل و تفکر سے خود پورا کر لیں گے۔ نیز یہ بھی گذارش ہے!

"خردہ بر مینا مگیر اے ہوشمند

دل بذوقِ خردۂ مینا بہ بند"

آخر میں مجھے اپنے محترم بزرگ آنریبل میاں سر فضل حسین صاحب مغفور کا شکریہ ادا کرنا ہے موصوف نے ان اوراق کے مطالعہ کے بعد نہ صرف میری حوصلہ افزائی فرمائی بلکہ چند بیش قیمت مشوروں سے بھی سرفراز کیا۔ نیز حضور نے اس کتاب کا دیباچہ لکھنے کے سوال پر غور فرمانے کا وعدہ کیا۔ لیکن افسوس ان کی بے وقت موت نے مجھے یہ شرف حاصل نہ ہونے دیا۔ مرحوم اکثر دریافت فرماتے کہ طباعت کا کام کس مرحلہ تک پہنچا ہے۔ نیز تاکید کرتے کہ کتاب چھپ کر بہت جلد تیار ہو جانی چاہیئے۔ مگر

لتھوگرافی کی دقتیں سدراہ بنیں اور کتاب اُن کی زندگی میں چھپ کر تیار نہ ہو سکی۔ اور مجھے عقیدتمندانہ اِسے اُن کی خدمتِ عالیہ میں پیش کرنے کی حسرت رہ گئی + کاش وہ چند سال اور زندہ رہتے + ملک وملت کو ضرورت تھی + مجھ سے بینواؤں کو ضرورت تھی + ان کی رہبری کی اور ان کی اعلیٰ شخصیت کی + فقید المثال نکتہ رس تھے - آزمودہ کار تھے - روشن دماغ اور دردمند دل لائے تھے + اللہ تعالیٰ اُن کی پاک روح کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے - آمین!

مصنّف

اس تصنیف میں حسب ذیل انگریزی کتب سے استفادہ

کیا گیا ہے :۔

۱۔ نیشنلزم اینڈ انٹر نیشنلزم مصنفہ ریمزے میور

۲۔ انڈین نیشنلزم مصنفہ ایڈون بیون

۳۔ انڈین پرابلمز مصنفہ بشپ وائٹ ہیڈ

۴۔ انڈین نیشنلٹی مصنفہ آر۔ این۔ گل کرائیسٹ

۵۔ ڈیموکریسی مصنفہ برنیز

۶۔ ڈیموکریسی اینڈ دی کراسویز مصنفہ ہیرن شا

۷۔ انڈیا اے نیشن مصنفہ اینی بیسنٹ۔

مشمولات

تمہید
صفحہ۔۳

نیشنلزم
صفحہ۔۱۳

ہندوستانیوں کی نسل
صفحہ۔۵۹

ہندوستانیوں کی زبانیں
صفحہ۔۶۷

ہندوستانیوں کے مذہب
صفحہ۔۸۷

ذات پات کی تمیز
صفحہ۔۱۱۹

حکومت برطانیہ کے ماتحت سیاسی اتحاد
صفحہ۔۱۴۹

چند مباحث
صفحہ۔۱۸۵

ضمیمہ:۔

مغربی تہذیب
صفحہ۔۲۵۳

جمہوریت
صفحہ۔۲۶۱

"فرد قائم ربطِ ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں، اور بیرونِ دریا کچھ نہیں"

اقبال

بابِ اوّل

نیشنلزم

(ملیت)

نیشنلزم

(ملیت)

دنیا کی ترقی کا دارومدار انسانی تجربہ کی کامیابی پر ہے زندگی کے لیے جد وجہد کے طریقے انسانی دماغ کے مخترعات ہیں اور ایسا ہر طریق بموجب حالات بنی نوع انسان کو عناصرِ قدرت کے عمل اور انسان کی اپنی فطری بہیمیت سے محفوظ رکھتا ہے۔ تسخیرِ قدرت کا مطلب قوانینِ قدرت کی دریافت سے قدرت کو رام کرنا اور پھر اُسی کی مدد سے بقا حاصل کرنا ہے۔ سائنس کی اصل غرض وغایت بھی تسخیرِ قدرت ہے۔ جہاں انسانی زندگی کو عناصرِ قدرت کی طرف سے خطرہ ہے وہاں اُس کو انسان کی فطری حیوانیت سے بھی کچھ کم خطرہ نہیں ہے۔ اسی خطرہ سے نجات حاصل کرنے کی خاطر جماعتی نظام قائم ہوا اور جماعت کے افراد کو مجلسی حقوق عطا کیے گئے جن سے چند فرائض بصورت اوامر و نواہی خود بخود اُن پر عاید ہو گئے۔ سوسائٹی کے زمانۂ طفولیت میں یہ حقوق مختلف قبیلوں اور گروہوں میں عوایدِ رسمیہ کے طور پر جاری رہے۔ لیکن جب سوسائٹی شاہراہِ ترقی پر ذرا اور آگے بڑھی تو مختلف قبیلوں نے مل کر اپنی حفاظت کے لیے ایک جماعت کی طرح ڈالی۔ بعدازاں اس جماعت کو قیامِ امن کی اشد ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ ان عوایدِ رسمیہ کو قانون کی شکل دے دی گئی۔ مقصد یہ تھا کہ جب جماعت کے افراد کے مابین حقوق یا فرائض کے بارے میں کسی قسم کا جھگڑا پیدا ہو تو اصل رسم و رواج کے متعلق اختلافِ رائے پیدا نہ ہو سکے اور توقف یا تضیع اوقات کے بغیر قانونی چارہ

جوئی کی جا سکے۔ لیکن اگر ایک جماعت کے افراد کی زندگی ان کے اپنے ہاتھوں ہی غیر محفوظ ہو سکتی ہے تو اس کی ہستی کسی دیگر ہمسایہ جماعت کی موجودگی سے بھی معرضِ خطر میں پڑ سکتی ہے۔ اجتماعیات کی وہ شاخ جس سے ایک جماعت اپنی ہمسایہ جماعت کی دست بُرد سے نیز اندرونی تفرقات و تخریب سے مصئون و مامون رہ سکتی ہے علمِ سیاسیات کہلاتی ہے۔ جہاں انسانی تجربے نے علم کی اور راہیں کھولیں وہاں سیاسیات نے بھی ترقی کی اور سیاسی تجربے کی بنا پر اقوامِ عالم بتدریج شاہراہِ ترقی پر گامزن رہیں حتیٰ کہ حکومت کے کئی نظام معرضِ وجود میں آ گئے۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ مشہور دو ہی ہیں۔ ایک ملوکیت اور دوسرا جمہوریت۔ ان ہر دو نظامہائے حکومت کے ماتحت چند اور تحتی نظام ہیں۔ عام طور پر قرونِ وسطےٰ سے پیشتر اور بعد ازاں بھی اُنیسویں صدی تک جابرانہ ملوکیت کا دور دورہ رہا۔ انیسویں صدی میں جمہوریت کو فروغ ہونا شروع ہوا اور مطلق العنان حکومتوں کے تختے الٹنے لگے۔ جمہوریت کی تحریک سب سے پہلے یورپ میں شروع ہوئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک نیا خیال پیدا ہوا۔ یہ نیشن (ملت) کا خیال تھا۔ انیسویں صدی میں انقلابِ فرانس نے اس خیال کو مزید تقویت دی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں اس کو عام قبولیت نصیب ہوئی لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ خیال اُنیسویں صدی کی پیدائش تھا تو ہمارا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس سے پیشتر دنیا میں یہ خیال موجود ہی نہ تھا۔ دنیا میں اس سے پہلے بھی نیشن (ملتیں) موجود تھے اور وہ نیشنل (ملی) حیثیت میں اپنی جداگانہ خصوصیتوں اور سرگرمیوں کے باعث ایک دوسرے سے ممیز بھی تھے۔ ہمارا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اس سے پیشتر دنیا میں یہ جذبہ نمایاں طور پر کارفرما نہیں ہوا تھا۔ اور اُسے انیسویں صدی میں جو مقبولیتِ عامہ حاصل ہوئی وہ پہلے کبھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ اس جذبہ کی تخلیق و تربیت جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے یورپ میں ہوئی۔ اس سے پیشتر دنیا بھر میں ملوکیت کا دور دورہ تھا۔ ممالک اور اُن کے باشندے بادشاہوں کی ملکیت متصور ہوتے تھے۔ چنانچہ اس نظریہ کے ماتحت کسی خاص علاقہ کا کسی دوسرے ملک کے ساتھ

الحاق عمل میں آتا تھا اور ایسی صورت میں اس علاقے کے باشندوں کی خواہشات کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا خواہ اُن میں اور اُن کے نیئے بادشاہ کی رعایا میں بہ لحاظِ مذہب، نسل، زبان اور تہذیب کس قدر ہی اختلاف کیوں نہ ہوتا۔ باشندے بھی اپنے آپ کو بادشاہ کی موروثی جائداد تصور کرتے ہوئے چوں وچرا نہ کرتے۔ اکثر ملک اور صوبے فروخت بھی کر دیے جاتے۔ لیکن انیسویں صدی کے آغاز کے بعد بادشاہوں کے لیے اس قسم کی خودسرانہ کاروائیاں ناممکن ہوگئیں۔ زبان نسل تہذیب اور تمدن کی یکسانیت کی بدولت ایک ملک کے باشندوں میں اجتماعیت کا جذبہ اس قدر مستحکم ہوا کہ ان کے حصے بخرے کرنا تو در کنار اُس کا خیال کرنا بھی ناممکن ہوگیا۔ اس جذبہ ملی کی وسعت میں جہاں اضافہ ہوا وہاں اُس کے ساتھ ہی اس خیال نے بھی جڑ پکڑی کہ آزادی ہر ملک کے باشندوں کا پیدائشی حق ہے اور کوئی غیر ملک انہیں اس حق سے محروم نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس نظریے کی بدولت یورپ کے مختلف ممالک نے غلامی سے نجات حاصل کی۔

نیشنلزم کی کوئی مکمل اور جامع تعریف کرنا بے حد مشکل ہے کیونکہ اُن حالات کی تخصیص جن کی موجودگی سے یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے عمل میں نہیں آسکتی۔ عملی طور پر ملیت کنبہ کے تصور کو اتنا وسیع کرتا ہے کہ وہ ایک خاص حد بستِ ملک کے ان تمام باشندوں پر حاوی ہو جائے جو بلحاظ نسل، زبان، مذہب، تہذیب و تمدن یکساں ہوں اور جن کی قومی روایات بھی ایک ہوں۔ ملت میں اقلیتوں کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو کنبہ میں متبنے اشخاص اور ازدواجی قرابت داروں کی ہوا کرتی ہے۔ نظری طور پر ملیت سے مراد کسی خاص ملک کے باشندوں کی اپنے یکساں و متشابہ ہونے کے متعلق متفق الخیالی ہے جس کی بنا پر وہ غیر اقوام کے مستعمرانہ اقدامات سے اپنا تحفظ کرتے ہیں تاکہ ہر فردِ ملت کو فطرت کی طرف سے ودیعت کردہ ذہنی استعداد و بدنی قوائے کی پوری پوری نشوو ارتقا کا موقع مل سکے۔ نیشن کا مصدر نیٹس ہے اس کے معنی پیدائش کے ہیں۔ اس سے ایک عام خیال جو ذہن میں آتا ہے وہ کسی شخص کا کسی خاص ملک میں پیدا ہونا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر واضح کریں گے نیشن کے لیے صرف پیدائش کی شرط کافی

نہیں ہے۔ نیشن کی تعریف کرنا اس لیے بھی مشکل ہے کیونکہ نیشن اور نیشنلٹی میں فرق ہے۔ اگرچہ یہ دونوں الفاظ عام طور پر ایک دوسرے کے مترادف خیال کیے جاتے ہیں لیکن نیشن بہت وسیع اور نیشنلٹی مقابلۃً بہت محدود ہوتی ہے۔ ایک نیشن کئی نیشنلٹیوں پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ مثلاً انگلش نیشن میں تین بالکل مختلف نیشنلٹیاں شامل ہیں سکاچ ویلش اور برٹین۔ اس کے علاوہ نیشن اور نیشنلٹی میں ایک اصطلاحی فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ کسی قوم کے لیے نیشن کا لفظ صرف اس وقت استعمال کیا جاتا ہے جبکہ اس کے ملک میں اس کی اپنی حکومت قائم ہو۔ حکومت کے بغیر وہ محض ایک نیشنلٹی ہوتی ہے یا کئی نیشنلٹیوں کا مجموعہ۔ گویا کہ بالفاظِ دیگر نیشنلٹی اور حکومت مل کر نیشن بنتا ہے۔ نیشن ایک وسیع جامد اور عام طور پر ساکت سی چیز ہے جو کبھی کبھار حرکت میں آتی ہے۔ نیشنل حکومت کو ہمیشہ ہوشیار اور بیدار مغز رہنا پڑتا ہے تاکہ نیشن کے مفاد کی حفاظت ہو سکے۔ نیشنلٹی سے مراد وہ جماعت ہے جس کے افراد میں بلحاظِ عادات اور خدوخال وغیرہ یکسانیت پائی جاتی ہو۔ اور جو اپنی نسلی و ملکی خصوصیات کی بنا پر اور جماعتوں سے مختلف ہو۔ نیشنلٹی کے لیے اپنی حکومت کا ہونا لازمی نہیں یعنی نیشنلٹی اور آزاد حکومت لازم و ملزوم نہیں ہیں۔ البتہ نیشنلٹی کی یہ خواہش ضرور ہوتی ہے کہ اس کی اپنی حکومت ہونی چاہیے۔ جب تک اس کی یہ خواہش برقرار رہتی ہے اور وہ اس بارے میں جدوجہد بھی کرتی رہتی ہے اس کا وجود قائم رہتا ہے۔ لیکن بعض ایسی نیشنلٹیاں بھی ہوتی ہیں کہ ان کو اپنی حکومت قائم کرنے کی خواہش نہیں رہتی ایسی حالت میں ان نیشنلٹیوں کا وجود یا تو فنا ہو رہا ہوتا ہے یا اُن کی ہستی کسی نیشن میں جذب ہو رہی ہوتی ہے۔ سکاٹ لینڈ کے باشندے انگلستان کے لوگوں سے مختلف ہیں لیکن باوجود اس کے وہ انگلستان سے الگ ہو کر اپنی حکومت قائم کرنا نہیں چاہتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی نیشنلٹی کافی حد تک انگلش نیشن میں جذب ہو چکی ہے اور عنقریب وہ قدرتی اختلافات کہ جن کی بنا پر وہ اس وقت انگلستان کے باقی باشندوں سے ممیز ہیں مٹ جائیں گے اور کچھ عرصے کے بعد ایک دوسرے سے ان کی پہچان اتنی آسان نہیں ہوگی

ضمنی کہ اس وقت ہے۔

وہ عنصر جن کی بالعموم موجودگی نیشنلزم کی روح کو متحرک کر کے کسی نیشن کو معرض وجود میں لاتی ہے آٹھ ہیں۔ اول نسل۔ دوم وطن۔ سوم زبان۔ چہارم تہذیب و تمدن۔ پنجم مذہب۔ ششم قومی روایات و قومی مشاہیر۔ ہفتم مشترکہ اقتصادی مفاد۔ ہشتم غیر ملکی حکومت کی بنا پر سیاسی اتحاد۔ لیکن ہم ان تمام عناصر کی بالعموم موجودگی کو ایک قاعدۂ کلیہ کے مترادف خیال کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ بعض قومیں ایسی بھی ہیں کہ مذکورہ عناصر میں سے کسی ایک اہم عنصر کے فقدان کے باوجود بھی ان میں ملیت کا جذبہ بدرجۂ اتم ہوتا ہے۔ چونکہ کسی ایک عنصر کی بالعموم موجودگی کو لازمی قرار نہیں دیا جا سکتا اس لیے ہم ان میں سے ہر ایک عنصر پر علیحدہ علیحدہ روشنی ڈال کر یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ ان کی موجودگی یا عدم موجودگی نیشنلزم پر کہاں تک اثر انداز ہوتی ہے۔ نیشن اور نیشنلٹی ایسی سیاسی اصطلاحات کے معانی بیان کرتے ہوئے ان میں جو فرق ہے چونکہ وہ بیان کر دیا گیا ہے اس لیے اب لفظ نیشن کے لیے لفظ ملت اور لفظ نیشنلزم کے لیے لفظ ملیت استعمال کیا جائے گا۔

ملیت اور نسل

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جذبۂ ملیت کے لیے ایک ہی نسل سے ہونا بے حد لازمی ہے لیکن دنیا میں شاید ہی کوئی قوم ہو جس کے متعلق وثوق سے یہ کہا جا سکے کہ اس کے افراد ایک ہی نسل سے ہیں یعنی کہ جذبۂ ملیت کی تولید کے لیے کسی ملک کے باشندوں کا ایک ہی نسل سے ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر ان کو محض اس امر کا یقین ہو کہ وہ ایک ہی نسل سے ہیں تو ان کے اسی یقین پر ملیت کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ دنیا میں اکثر ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک ملک کے باشندوں میں بلحاظ نسل بہت اختلاف ہے لیکن وہ اپنے آپ کو ایک ہی نسل سے سمجھتے ہیں۔ آپ ریاستہائے متحدہ امریکہ پر غور کریں۔ وہاں کی آبادی

انگریز ڈچ پرتگیز ہسپانوی اور فرانسیسی وغیرہ ہر یورپی قوم کی اولاد پر مشتمل ہے لیکن وہ اپنے آباؤ اجداد کو بھول چکے ہیں۔ ان کے نسلی اختلافات بھی مٹ چکے ہیں۔ اس وقت وہ صرف امریکی ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے۔ انہیں اپنے امریکی ہونے کا فخر ہے اور اس فخر نے ان میں باہمی ربط پیدا کر دیا ہے جس سے ان کے جذبہ ملیت کو تقویت پہنچتی ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان کے باشندوں کی مثال موجود ہے۔ یہاں قریباً سب لوگوں کو آریوں کی اولاد ہونے کا یقین ہے لیکن اس نسلی یکسانیت کے باوجود ان میں ملت پرستی کا وہ جذبہ موجود نہیں جو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے باشندوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ ہندوستانیوں میں ذات پات کی تمیز موجود ہے جس کے افتراق انگیز اثرات کے باعث ملیت کا جذبہ پورے طور پر نشوونما نہیں پا سکا۔ اسی ضمن میں انگریزوں کی مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ برطانیہ کی آبادی مختلف النسل لوگوں پر مشتمل ہے۔ سکاٹ لینڈ کے باشندے انگلستان کے باشندوں سے مختلف ہیں اور ان میں وہ نسلی فرق بھی موجود ہے جس کی بنا پر مختلف جماعتوں میں تمیز کی جاتی ہے۔ لیکن باوجود اس کے وہ اپنے آپ کو ایک ہی ملت کے افراد سمجھتے ہیں اور ان میں احساس ملی یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔ ویلز کے لوگ سکاٹ لینڈ اور انگلستان کے باشندوں سے مختلف ہیں لیکن جہاں تک ملیت کا تعلق ہے یہ تینوں ایک ہیں۔ لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ ملت کے افراد کا ایک نسل سے ہونا ضروری نہیں۔ اگر لوگ ایک ہی نسل سے ہوں تو ملیت کا استحکام مقابلتاً جلد عمل میں آ سکتا ہے۔ صدی یا نصف صدی تک ایک ہی جگہ میں رہنے کے بعد جب دو مختلف نسلوں کے لوگ آپس میں خلط ملط ہو جاتے ہیں تو ان میں ایک خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد ایک ہی نسل سے تھے اور ان کی نسل بھی ایک ہی ہے جذبہ ملیت کے لیے اس خیال کا پیدا ہو جانا ہی کافی ہوتا ہے۔ خواہ حقیقت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم جو کمزور ہو وہ اپنی ہستی کو کسی دوسری قوم میں جو مقابلتاً زیادہ متمدن ہو کھو دیتی ہے اور اس کے رسم و رواج اور تہذیب و تمدن کو اختیار کر لیتی ہے۔ ہندوستان میں باہر سے

آنے والے مختلف نسلوں کے لوگ یہاں کے باشندوں کے ساتھ اس طور پر خلط ملط ہو گئے گویا کہ وہ ایک ہی نسل سے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کے باشندے مقابلتاً زیادہ مہذب اور متمدن تھے۔ پس ظاہر ہوا کہ نسلی اختلاف جذبہ ملیت کے مانع نہیں البتہ اگر لوگوں کی کوئی خاص جماعت اپنی نسلی و آبائی روایات کو اہمیت دے کر دوسرے کے مقابلے میں اپنے تئیں اعلیٰ اور برتر خیال کرتی ہو تو یہ امر ملیت کے جذبہ کی تخلیق اور اس کی توسیع میں سدِ راہ ہو سکتا ہے۔ برہمنوں اور کھشتریوں کا ذاتی تفاخر و تفوق نیچ اقوام کے جذبات کو ٹھکراتا ہے۔ لہٰذا یہ امر ہندوستان کے باشندوں کے باہمی اتحاد و اتفاق کے منافی ہے یہی حال ملک ہنگری کا ہے۔ وہاں کی آبادی تین مختلف جماعتوں پر مشتمل ہے۔ مغیار سلاف اور رومانوی۔ مغیار برسرِ اقتدار ہیں اور اپنے آپ کو سلاف اور رومانوی لوگوں کے مقابلے میں برتر اور اعلیٰ سمجھتے ہیں اور ان کا یہ تفوق جذبہ ملیت کے مانع ہے۔ اس حالت میں جبکہ کسی ملک کے باشندوں کی مختلف جماعتیں بلحاظ تہذیب و تمدن اپنے تئیں ہم پلہ خیال کریں اور اس خیال کے ماتحت ان کا میل جول بھی ہو اور آپس میں رشتے ناتے بھی ہوتے ہوں تو وطنیت کی روح زیادہ جلدی پھیلتی اور بڑھتی ہے۔ مزید براں اگر کسی ملک کے قبیلے اور جماعتیں جن پر اس ملک کی آبادی مشتمل ہوتی ہے اپنے خصوصی رسم و رواج اور بود و باش کے طریقوں کے تحفظ پر سختی سے مصر نہ ہوں تو اس سے بھی ان کے باہمی اختلاط میں مدد ملتی ہے اور وہ جلدی آپس میں گھل مل جاتے ہیں۔

یہاں یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دورِ حاضر میں ملیت اور نسلیت میں فرق سمجھا جاتا ہے۔ ملیت میں ہمسایہ اقوام کے حقوق ملی کی پائمالی کا خیال شامل نہیں ہوتا لیکن نسلیت کی خوبی یا برائی یہی ہے کہ ہمسایہ اقوام کے ممالک پر قبضہ کر کے ہر ممکن فائدہ اُٹھایا جائے۔ ملیت کے متعلق جب یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے دنیا میں کبھی امن قائم نہیں رہ سکتا تو اس وقت ملیت نہیں بلکہ نسلیت پیشِ نظر ہوتی ہے۔ نسلیت یعنی کسی ایک قوم کا یہ خیال کہ وہ باقی ہمسایہ اقوام کے مقابلے میں ہر لحاظ سے برتر ہے

ہمسایہ قوام میں بدظنی اور عناد پیدا کر دیتا ہے۔ وہ قومیں جنہیں برتری کا خیال رہتا ہے دیگر اقوام پہ دست تطاول دراز کرنا یا اُن کے ممالک اور مقبوضات پر یورش کرنا معیوب خیال نہیں کرتیں وہ اس فکر میں رہتی ہیں کہ جس طرح ہو سکے دیگر اقوام کو مغلوب کر کے اُن کی ملکی دولت سے متمتع ہوں۔ اقوام کی اس قسم کی جبر پسندی امن سوزِ عالم ثابت ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ بعض اوقات ملیت کے خلاف اس قسم کا الزام عائد کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب ایک خاص ملک کے باشندے ملیت پر مبنی باہمی اتحاد سے پوری پوری سیاسی طاقت حاصل کر لیتے ہیں تو وہ بھی اپنی اس طاقت کے بل بوتے پر دیگر ملکوں کی آزادی چھیننے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ یہ الزام اُس وقت تک کچھ وقعت رکھتا تھا جب تک کہ اطالوی محبِ وطن میزنی نے ملیت کے متعلق اپنا نقطۂ نظر بیان نہیں کیا تھا۔ بقول میزنی ملیت سے مراد یہ ہے کہ آزادی ہر ملک کے باشندوں کا جہاں تک اُس کے داخلی و خارجی معاملات کا تعلق ہے پیدائشی حق ہے اور کوئی غیر ملک ان پر حکمرانی نہیں کر سکتا بشرطیکہ وہاں ایک ملت معرضِ وجود میں آ چکی ہو اور لوگوں میں ملیت کا جذبہ پیدا ہو چکا ہو۔ ملیت کی اس تعریف کے پیش نظر امن سوزئ عالم کا الزام بے بنیاد ہے۔ برعکس اس کے نسلیت طاقت پکڑنے کے بعد عسکریت میں بدل جاتی ہے۔ جب کسی ملک میں نسلیت کے خیال کو عام مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے تو وہاں کے لوگ یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ باقی تمام اقوام پر انہیں حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔ چنانچہ ان کی حریص نظروں میں جس کی لاٹھی اُسی کی بھینس ایک معقول اور مناسب اصول بن جاتا ہے اور وہ اس کے مطابق عمل کرنے لگتے ہیں۔ یہی خیال پین جرمن تحریک کا محرک تھا۔ جرمن غاصبانہ نسلیت کے قائل ہیں اور ان میں ان خیالات کی ترویج کی ذمہ واری میکاولی نیٹشے اور ہوسٹن سٹیورٹ چیمبرلین کے سے مصنفین و حکما پر عائد ہوتی ہے۔ میکاولی کی تصنیف "پرنس" (شہزادہ) میں پرنس کی ایک ایسی شخصیت ظاہر کی گئی ہے جسے ہر ممکن سیاسی اقتدار حاصل ہے اور جو سیاہ و سفید کا مالک ہے تصنیفِ مذکور میں اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ جہاں تک دیگر اقوام کا تعلق ہے بے آئینی اور تمام اخلاقی

پابندیوں کو بالائے طاق رکھنا ہی آزادی ہے۔ نیٹشے کا سُپر مین (فوق الانسان) جس کے سامنے باقی انسانوں کی حیثیت معمولی پالتو جانوروں کی حیثیت سے زیادہ نہیں ہوگی ایک مشہورِ عالم نصب العین ہے نیٹشے اور میکاولی کے نظریوں میں فرق صرف اس قدر ہے کہ ایک کے خیال میں عام سیاسی طاقت پرنس یا شخصی حاکمِ وقت کے ہاتھ میں ہونی چاہیے اور دوسرے کے خیال میں یہ سب طاقت حکومت کو حاصل ہونی چاہیے تاکہ وہ تمام ہمسایہ اقوام کو مغلوب کر کے ان پر اپنا تسلط قائم کرے۔ اسی طرح جرمنی میں جنگِ عظیم کے آغاز کے وقت ہوسٹن کے خیالات کو حد درجہ مقبولیت حاصل تھی۔ جرمنی کو اپنی برتری کا خیال اپنے علم و فضل کی افزونی کے باعث پیدا ہوا تھا اور اس عام خیال کی وجہ سے جرمن لوگ خاص کر ایسی حالت میں جب کہ اُن کے پاس کوئی وسیع مقبوضات نہ تھے دنیا پر حکمرانی کرنا اپنا حق سمجھتے تھے اور اسی لیے غلبہ پسند حکما کے نظریے ان کے نزدیک معتبر اور معقول تھے۔ پین جرمن تحریک ایک نسلی تحریک تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ تمام علاقے جو کسی وقت ٹیوٹانک فاتحین کے زیرنگیں تھے یا جن میں کم از کم اس وقت بھی ٹیوٹانک زبان بولی جاتی ہے جرمنی کے قبضے میں ہونے چاہئیں۔ جرمنی کے نقطۂ نظر سے ایسے علاقوں میں ہالینڈ ڈنمارک اور بلجیم بھی شامل تھے۔ اگرچہ ان ملکوں کی قومی روایات میں بے حد تغیر و تبدل ہو چکا تھا اور ان میں سے ہر ایک میں ایک الگ ملت معرضِ وجود میں آ چکی تھی۔

حامیانِ نسلیت کا یہ دعوٰے ہے کہ مختلف نسلوں میں جو قدرتی فرق ہوتا ہے اس کی بنا پر جہاں وہ ایک دوسرے سے متنفر ہوتی ہیں وہاں بعض امتیازی خصوصیات کی بنا پر ایک دوسرے کے مقابلے میں برتر بھی ہوتی ہیں۔ ایسے ہی نسلی امتیازات کی بنا پر ایک نسل کے باشندوں کو دیگر قوموں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے اکسایا جاتا ہے اور یہ بات ملیت کے اصولوں کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ ملیت کے دعویدار اس امر پر زور دیتے ہیں کہ ایک ملت میں مختلف نسلوں کی جماعتیں شامل ہو سکتی ہیں اور اُن میں ایک ایسی قرابت اور مؤانست بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ اُس کی بدولت وہ ایک دوسری

پر اعتبار کرنے لگتی ہیں اور اُن کا یہ باہمی اعتبار بالآخر باہمی ہمدردی کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس سے وہ اپنے فطری اختلافات کو بھول کر ایسی متحد ہو جاتی ہیں کہ گویا وہ ایک ہی نسل سے ہیں نپولین نے فرانس میں نیلیت کو عسکریت میں بدل کر فتح یورپ کی ٹھانی لیکن اس کی فتوحات نے دیگر ممالک میں احساس ملی پیدا کر دیا۔ نپولین کی عسکریت ہسپانیہ، جرمنی، آسٹریا اور اٹلی میں ملیت کی روح پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے۔ انگریزوں میں جذبۂ ملیت نپولین کے خوف سے اور بھی زیادہ مستحکم ہو گیا تھا۔ دنیا میں جس قدر حکومتیں اس وقت قائم ہیں ان میں سے بہت کم ایسی ہوں گی جو اصل اصول ملیت پر کاربند ہوں۔ یورپی ممالک جہاں تک یورپ کا تعلق ہے اصل اصول ملیت کے پابند ہیں۔ لیکن جہاں تک باقی دنیا کا تعلق ہے ان کے جذبۂ ملیت میں غصب و غلبہ کے عنصر داخل ہیں۔ انگریزوں کی ملک گیری کی ہوس چونکہ یورپ سے باہر وسیع مقبوضات کی وجہ سے پوری ہو چکی تھی اس لیے یورپ میں ان کی ہستی سے کبھی کسی کو خطرہ نہیں ہوا اور اسی لیے اہل یورپ ان کی ملیت اصلی اور اصولی خیال کرتے رہے ہیں اور وہ بھی یورپ کے مختلف ممالک کی قومی آزادی کو برقرار رکھنے اور انہیں کسی زبردست غلبہ پسند طاقت سے بچانے میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ اس وقت اٹلی ہالینڈ۔ بلجیم۔ ڈنمارک سویڈن وغیرہ ممالک کی حکومتوں کو کسی حد تک ملیت کے اصولوں کے مطابق کہا جا سکتا ہے۔ یورپ کے ممالک کو اگر کبھی کوئی خطرہ ہو سکتا ہے تو وہ جرمنی کے ہاتھوں۔ کیونکہ باوجود اس قدر اندرونی استحکام حاصل ہونے کے اس پر اپنی مملکت کی مزید توسیع کے سب دروازے بند ہیں۔ اگرچہ اپنی مختلف بگڑی ہوئی صورتوں میں ملیت جنگ و جدل کی محرک ہوتی ہے۔ لیکن دنیا بھر کے امن و امان کے نصب العین کے نقطۂ نظر سے ہر ایک ملت مشترکہ دولت عالمیان میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے تاکہ تقسیم کار کے اصول کے مطابق دنیا کی تنسیق آسان ہو سکے۔

ملّیت اور وطن

کسی ملّت کے معرضِ وجود میں آنے کے لیے عام طور پر یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کا کوئی ملک یا وطن بھی ہو۔ ملّت کی تشکیل اس صورت میں جلد عمل میں آتی ہے جبکہ اس کے افراد ایک خاص خطۂ ارض پر آباد ہوں جو جغرافیائی لحاظ سے اور ملکوں سے مختلف اور الگ واقع ہو۔ اکثر ملتیں جو دنیا میں معرضِ وجود میں آئیں اپنے وطن یا ملک کی بدولت کامیاب ثابت ہوئیں۔ وہ لوگ جو ایک عرصے سے ایک خاص ملک میں آباد چلے آتے ہوں بالآخر باہمی طور پر متحد ہو کر ایک ملت کی خصوصیات اپنے میں پیدا کر لیا کرتے ہیں۔ وطن کی محبت اور وطنی فضا میں پرورش اور تربیت انہیں متحد کر دیتی ہے۔ لیکن ہم وطن ہونے کی قید بھی ایسی لازمی نہیں کیونکہ دنیا میں کئی ایسی ملتوں کی مثالیں موجود ہیں جن کا کوئی وطن نہیں یا جن کو وطن سے نکلے صدیاں گذر گئی ہیں اور جن کے افراد روئے زمین پر پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن باوجود اس امر کے کہ ان کا کوئی خاص وطن یا ملک نہیں ان میں احساسِ ملّی بدستور موجود ہے۔ مثلاً یہودیوں کی جماعت ہے ان کو اپنے وطن سے نکلے صدیاں گذر چکی ہیں دنیا کے ہر کونے میں وہ موجود ہیں۔ انہیں کسی خاص خطۂ ارض سے کوئی لگاؤ نہیں لیکن پھر بھی وہ ایک ملت ہیں۔ احساسِ ملّی نے انہیں قومی استحکام دے کر صدیوں سے ایک جداگانہ حیثیت بخش رکھی ہے۔ حالانکہ یہودیوں کا کوئی وطن نہیں لیکن پھر بھی تعصب ملی کی وجہ سے ان کی ہستی ابھی تک کسی دیگر قوم میں جذب نہیں ہوئی۔ اسی طرح پولینڈ کے باشندے بھی ایک ملّت کے افراد ہیں اگرچہ ان کے ملک کی حدود واضح نہیں ہیں۔ اہلِ جرمنی نے ان کی ملّیت کو مٹانے کی اگرچہ کئی بار کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اہلِ پولینڈ کا احساسِ ملّی ایسا مستقل اور پائیدار واقع ہوا ہے کہ اپنی نظیر نہیں رکھتا اس کے خلاف ملکِ ہنگری کے اردگرد ایسے سلسلہ ہائے کوہ موجود ہیں جنہوں نے اُسے تمام یورپی ممالک سے الگ کر رکھا ہے۔ لیکن باوجود اس علیحدگی کے اس کے باشندوں میں وہ یکجہتی اور اشتراکِ عمل پیدا نہیں ہوا جس پر کہ ایک ملّت

کی بنیاد قائم ہوا کرتی ہے۔ منیار سلاف اور رومانوی لوگ ایک دوسرے سے الگ الگ پہچانے جا سکتے ہیں۔ یہی حال ہندوستان کا ہے۔ شمال میں کوہستانِ ہمالہ اور شمال مغرب میں بھی دشوار گذار سلسلہ ہائے کوہ موجود ہیں جن کی وجہ سے یہ ملک باقی برِاعظم سے بالکل الگ تھلگ نظر آتا ہے۔ لیکن باوجود اس جغرافیائی پوزیشن کے اس کے باشندوں میں احساسِ ملّی کا فقدان ہے۔ ملک یا وطن کے ہونے سے احساسِ ملّی کی نشو و نما تو ہوتی ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے بغیر ملت کا معرضِ وجود میں آنا ہی ناممکن ہے۔ خانہ بدوش لوگوں میں وطنیت کا جذبہ موجود نہیں ہوتا لیکن اگر ایک دفعہ وہ کسی ملک میں ربع صدی یا نصف صدی تک کسی مجبوری کی وجہ سے آباد رہیں تو اس کے بعد جب کبھی اُن کی کوئی نسل خانہ بدوش زندگی اختیار کرے گی تو اس میں جذبۂ وطنیت موجود ہوگا جو اُن کو ایک جداگانہ حیثیت دیدے گا۔ ترکِ وطن یا ہجرت سے ملیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور اسی وجہ سے یہودیوں میں جذبۂ ملیت پایا جاتا ہے۔ ملیت کو جذبۂ وطنیت سے استحکام حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ ملکی حالات اور آب و ہوا کی یکسانیت سے لوگوں کا طرزِ بود و ماند۔ ان کی تہذیب و تمدن نیز ان کی ذہنیت اور عام تجرباتِ زندگی ایک سے ہوتے ہیں جن کی وجہ سے ان میں اخوت و مودت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں کسی تارک الوطن جماعت میں حب الوطنی کی بنا پر جو احساسِ ملی موجود ہوتا ہے کچھ عرصہ کے گذرنے کے بعد اس میں اکثر کمی آنی شروع ہو جاتی ہے اور وہ بالآخر بالکل مٹ بھی سکتا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی آبادی تمام یورپی ممالک کی اقوام پر مشتمل ہے۔ جرمن انگریز ہسپانوی فرانسیسی وغیرہ۔ لیکن دو دو تین تین پشتوں کے گذرنے کے بعد یہ اپنے آبائی وطنوں کو بھول گئے۔ اور پہلی ملتوں کو چھوڑ کر امریکن بن گئے۔ اسی طرح ہن اور سیتھین اقوام کے لوگ زمانۂ سلف میں ہندوستان میں آکر یہاں کے قدیم باشندوں میں گھل مل گئے اور اب چونکہ ایک طویل عرصہ ان کو یہاں آئے گذر چکا ہے اس لیے ان کو تمیز کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ افغانوں مغلوں اور عربوں کو بھی ہندوستان میں آئے کئی پشتیں گذر چکی ہیں۔ وہ سب اب ہندی بن چکے ہیں۔ لیکن چونکہ اُن کا

مذہب اور تمدن ہندوؤں کے مذہب اور تمدن سے بالکل مختلف ہے بلکہ اس کے متضاد ہے۔ اس لیے وہ ابھی تک اپنی آبائی روایات پر قائم ہیں۔ ان کی ہستی ہندوؤں سے بالکل علیحدہ اور الگ نظر آتی ہے۔ ہندو انہیں اپنے میں جذب نہیں کر سکے۔ لیکن جہاں تک مسلم راجپوت جاٹ اور دیگر ایسی کثیر التعداد ہندی اقوام کا تعلق ہے جنہوں نے اسلامی تہذیب و تمدن کو قبول کر لیا تھا ان سے افغانوں مغلوں اور عربوں کو الگ کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ لیکن باوجود ان سب باتوں کے ملیت پر وطنیت کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اکثر ملتوں کو ان کے وطنوں کے نام دیے جاتے ہیں۔ مثلاً جاپانی چینی۔ امریکی۔ فرانسیسی اطالوی۔ انگریز۔ مصری وغیرہ۔ برعکس اس کے بہت کم مثالیں ایسی ملیں گی کہ کسی ملک کو وہاں کی ملت کے نام سے پکارا جاتا ہو۔

ملیت اور زبان

جذبۂ ملیت کے استحکام کے لیے ایک زبان کا ہونا بھی بے حد مفید ہوتا ہے۔ اگر کسی ملک کے باشندوں کی زبان ایک ہو گی تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ ان میں ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھنے اور ان کا مناسب طور پر احترام کرنے کی پوری پوری اہلیت موجود ہے۔ نیز یہ کہ ان کا علم و ادب بھی ایک ہے اور اس کے اثر سے ان کی سیرت ذہنیت اور شخصیت بھی ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے جب دو مختلف نسلوں کے لوگوں کا زبان کا اختلاف دور ہو جاتا ہے اور وہ آپس میں بغیر دقت اظہار خیال کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو اس سے بیگانگی کی جو ان میں تضاد نسلی کی وجہ سے موجود ہوتی ہے بیخ کنی ہوتی ہے اور وہ حالات پیدا ہونے شروع ہوتے ہیں جو بالآخر انہیں آپس میں ملا کر ایک کر دیتے ہیں۔ ایک زبان کی وجہ سے ہم وطنوں کا آپس میں نہ صرف اتحاد و اتفاق بڑھتا ہے بلکہ ایک دوسرے پر اعتماد بھی پیدا ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے لیے ہمدردی کا احساس کرنے لگتے ہیں لیکن

کئی ایسی مثالیں موجود ہیں جن سے اس عام اصول کی تردید بھی ہوتی ہے۔ جب دو مختلف قوموں میں مذہبی اور تہذیبی اختلافات موجود ہوں تو زبان کے ایک ہونے سے ان میں اشتراکِ عمل کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس وقت ہمارا اشارہ ہندوستانی جماعتوں کی طرف ہے۔ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان آباد ہیں ان کی زبانیں مختلف ہیں لیکن ہندوستان کے اُن حصوں میں جہاں ایک جماعت کی اکثریت اور دوسری جماعت کی اقلیت ہے اگرچہ زبان ایک ہے لیکن زبان کے ایک ہونے سے وہ ایک نہیں ہوئے۔ پنجاب (جس میں ریاستیں بھی شامل ہیں) صوبجاتِ متحدہ اور شمال مغربی سرحدی صوبہ ہندوستان میں ایک ایسا خطہ ہے کہ اس میں زبان ایک ہے لیکن اس کے باوجود ہندو مسلم کی تمیز موجود ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جہاں زبان نے باشندوں کے باہمی اختلافات کو مٹا کر اُن کو متحد کرنے کی خدمت سرانجام دی وہاں مذہب اور تمدن کے اختلافات نیز اس حقیقت کے احساس نے بھی کہ ہمسایہ علاقوں اور خطوں میں ان میں سے ہر ایک کو بھاری اکثریت حاصل ہے ان کے باہمی اختلاط کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے سے روکا۔ بنگال میں بھی یہی حالت ہے اور اس کی وجہ صرف مذہبی و تمدنی بنیادی اصولوں کا اختلاف ہے۔ بنگال کے سب باشندے بنگالی ہیں اور بنگلہ اُن کی زبان ہے لیکن پھر بھی ہندو ہندو ہیں اور مسلم مسلم۔ اس کے علاوہ اُن مذہبوں کی مثال ہے جو ہند میں پیدا ہوئے اور ہندی زبانوں میں سے کسی ایک کے ذریعے ان کی تبلیغ و اشاعت عمل میں آئی۔ بدھ مت ہند میں پیدا ہوا۔ اس کا بانی یعنی مہاتما بدھ ہندی تھا۔ ہندوستان بھر میں بدھ مت پھیل گیا اور یہ ہندو دھرم سے مختلف تھا۔ لیکن اس کے پیروؤں کی تہذیب و تمدن اور زبان ہندی تھی اور اس نسبت کی بنا پر بدھ مت اور ہندو دھرم کے پیروؤں میں ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے سے ہمدردی کرنے کی اہلیت بدستور قائم رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب بدھ مت کا زور گھٹا تو اس کے پیروؤں اور وشنو کے پجاریوں میں تمیز کرنا ناممکن ہو گیا۔ حتیٰ کہ اس وقت بدھ مت کو ہندو دھرم کی ایک شاخ تصور کیا جانے لگا ہے۔

یہی سکھ مذہب کا حال ہے۔ سکھ مذہب کو اپنانے اکثر پیرو ہندوؤں سے ملے اور چونکہ ماسوائے مذہبی اصولوں کے ان میں اور باقی ہندوؤں میں کوئی فرق نہ تھا اس لیے ایک زبان ہونے کی وجہ سے نیز اس امر سے مترتب ہونے والے دیگر نتائج کی بدولت وہ ہندوؤں سے چنداں مختلف نہیں ہیں سکھوں کی ہندوؤں سے راہ ورسم بدستور قائم ہے اور عین ممکن ہے کہ بدھ مت کی طرح کسی وقت سکھ مذہب بھی ہندو دھرم کی ایک شاخ تصور ہونے لگے۔ بلحاظِ مذہب سکھ مسلمانوں کے زیادہ قریب ہیں لیکن جو رابطہ انہیں ہندوؤں سے ہے وہ مسلمانوں سے نہیں۔ اس کی وجہ وہی ہے جو بیان کر دی گئی ہے یعنی چونکہ ان کی اور ہندوؤں کی زبان ایک تھی، تہذیب و تمدن ایک تھا اس لیے ان کی ذہنیت اور سیرت ہندوؤں کی سی ہے۔ چنانچہ ان کو ہندوؤں سے اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔

دنیا کے باہمی رابطہ اتحاد کے راستے میں کبھی دریاؤں۔ سمندروں اور پہاڑوں کو حائل سمجھا جاتا تھا۔ لیکن سائنس کی ترقی اور رسل ورسائل کے جدید ذرائع کی دریافت سے یہ رکاوٹیں اب کسی حد تک دور ہو گئی ہیں۔ لیکن ایک بڑی رکاوٹ جو اب تک سدِ راہ ہے زبان کی دقت ہے۔ مختلف ملکوں کے باشندوں کی زبانیں مختلف ہیں اور اس وجہ سے اُن کے باہمی میل جول میں دقتیں پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہمدردانِ بنی نوعِ انسان اس کوشش میں مصروف ہیں کہ کوئی مشترکہ زبان ایجاد کی جائے جس کے ذریعے دنیا بھر کے لوگ ایک دوسرے کے سامنے اظہارِ خیال کر سکیں اور اس طرح ان میں ایک گونہ تعلق پیدا ہو جائے۔ مثال کے طور پر اسپرانٹو ایک نئی زبان ہے جسے رائج کیا جا رہا ہے ان تمام کوششوں سے اگر کچھ نہیں تو کم از کم یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ کسی ملک کے باشندوں کے باہمی اتحاد کے لیے ایک زبان کا ہونا کس قدر ضروری ہے۔

ایک یہ بھی نظریہ ہے کہ جن لوگوں کی زبان ایک ہوگی ان کی نسل بھی ایک ہوگی۔ اسی نظریے کے ماتحت جرمن میں جرمن تحریک کا آغاز ہوا تھا۔ اس تحریک کے بانی یہ خیال کرتے تھے کہ اُن سب

علاقوں کے باشندے جن میں جرمن زبان بولی جاتی ہے بلحاظِ نسل جرمن ہیں۔ لیکن اس نظریے میں حقیقت بہت کم ہے۔ کیونکہ فاتح قوم کے افراد مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کی زبان سیکھ جاتے ہیں اور مفتوحین کو بھی فاتحین کی زبان سیکھنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ افغانوں اور مغلوں کے عہد میں ہندوستانیوں نے فارسی بولنا سیکھ لیا تھا اور افغان اور مغلوں نے ہندوستانی بولنا شروع کر دیا تھا۔ اب انگریزی زبان بھی اسی طرح سیکھی اور سکھائی جا رہی ہے۔ جب دو مختلف ملتوں کے لوگ آپس میں ملتے ہیں تو زیادہ متمدن اور زیادہ مہذب ملت کی زبان مقابلتہً کم متمدن اور کم مہذب ملت اختیار کر لیا کرتی ہے اس میں ایک کے فاتح اور دوسری کے مفتوح ہونے کو دخل نہیں ہوتا۔ کیونکہ خوبی بذاتِ خود ایک کشش ہے خواہ یہ فاتح قوم میں ہو یا مفتوح میں۔

احساسِ ملّی پیدا کرنے کے لیے قومی راہنماؤں کو کسی ایسی زبان کی ضرورت ہوتی ہے جسے عوام کے سب طبقے بخوبی سمجھ سکتے ہوں۔ اس وقت ہندوستان میں اُردو اور ہندی کے متعلق دعوٰے کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان بھر کی مشترکہ زبانیں ہیں۔ یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ مختلف صوبوں کے باشندے کم و بیش اُردو یا ہندی کو سمجھ سکتے ہیں لیکن احساسِ ملّی کی تخلیق کے لیے اس زبان کی ضرورت ہے جو باشندوں کی روزمرہ کی زبان ہو اور جس سے اُن کے جذبات سے اپیل کی جا سکے۔ مادری زبان کی بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے بولنے والے اس زبان میں سوچتے ہیں۔ سوچنا دل میں باتیں کرنے کے مترادف ہوا کرتا ہے۔ وہ زبان جس میں اس وقت جبکہ خاص جذبات طربیہ یا حزنیہ کی کیفیت طاری ہو سوچا یا بالفاظِ دیگر دل میں باتیں کی جائیں مادری زبان ہوتی ہے اور خیالات کے پیدا ہوتے وقت ان کی ذہنی اشکال اسی زبان کے الفاظ کی صورتیں اختیار کر کے آنکھوں کے سامنے آتی ہیں۔ وہ زبان جس کو لوگ اپنے خیالات کی ترجمانی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس میں سوچ بچار نہیں کرتے اُن کی مادری زبان نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ایسی زبان کے ذریعے اُن کے ملی

جذبات سے پورے طور پر اپیل نہیں کی جا سکتی۔ ملیت کا احساس پیدا کرنے کے لیے باشندوں کی مادری زبان استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ جب روایاتِ ملی کا ذکر ان کی اپنی زبان میں کیا جاتا ہے تو جذبات کو جلد اور فوری اپیل ہوتی ہے۔ قومی جذبات اور احساسات کا اظہار جس خوبصورتی سے مادری زبان میں کیا جا سکتا ہے وہ کسی غیر ملکی زبان کے ذریعے سے ممکن نہیں ہو سکتا۔ قومی گیت جیسے ملکی زبان میں موثر ثابت ہو سکتے ہیں ویسے کسی دیگر زبان میں موثر نہیں ہو سکتے۔ اردو اور ہندی کی جس زور شور سے اس وقت مسلمان اور ہندو بہ ترتیب حمایت کر رہے ہیں اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو ممکن ہے کہ ایک دن ان میں سے وہ زبان جس کو بالآخر کامیابی نصیب ہوئی تمام باشندوں کی مشترکہ زبان بن جائے اور ہندیوں میں احساسِ ملیت کو پیدا کرنے میں ممد ثابت ہو۔

لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ کسی ایک ملت کے افراد صرف ایک ہی زبان بولتے ہوں۔ سکاٹ لینڈ کے باشندے کچھ انگریزی بولتے ہیں اور کچھ گیلک۔ سوئٹزرلینڈ کے باشندے بھی تین زبانیں بولتے ہیں۔ بعض فرانسیسی بولتے ہیں بعض جرمن اور بعض اطالوی۔ لیکن باوجود اس امر کے وہ ایک ہی ملت کے افراد ہیں۔ لہٰذا زبان اگرچہ تشکیلِ ملیت میں بہت بڑی مدد دیتی ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔

ملّیت اور تہذیب و تمدن

اگر کسی ملک کے باشندوں کی مختلف جماعتیں ایک ہی تہذیب و تمدن کے تابع ہوں تو اس سے بھی احساسِ ملی کی بیداری عمل میں آتی ہے۔ تمدنی و معاشرتی طریقوں کی یکسانیت اُس احساسِ اجنبیت اور بیگانگی کو دور کرتی ہے جو عوام کی مختلف جماعتوں میں اُن کے دیگر اختلافات کی بنا پر موجود ہوتا ہے۔ بعض اوقات دو ہمسایہ اقوام میں تعصب ملّی محض اس بنا پر قائم رہتا ہے

کہ ان کے بود و باش کے طریقوں اور عام اخلاقی معیار میں فرق ہوتا ہے جس کی بنا پر وہ ایک دوسرے سے اس قدر بیگانگی اور نفرت محسوس کرتی ہیں جو اکثر صدیوں تک دور نہیں ہوتی۔ ملک ترکی مغربی ممالک کی سرحد پر واقع ہے لیکن مشرقیت کا علمبردار ہے۔ اس کا تمدن مغربی تمدن سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا طرز بود و ماند اور مذہب بھی ان سے مختلف ہے۔ ان اختلافات کی وجہ سے وہ مغرب والوں کی نظر میں خار کی طرح کھٹکتا رہا ہے۔ جہاں تک ترک قوم کا تعلق ہے مغرب کی نظروں میں ان قومی اختلافات کا ظاہری نشان لباس تھا اور لباس میں کلاہِ لالہ رنگ ان کے تعصباتِ ملی کو مشتعل کرنے کے لیے خاص اہمیت رکھتی تھی۔ سالہا سال سے ترک اور یونانی ایک دوسرے کے ہمسائے چلے آتے ہیں لیکن عیسائیت کے حکم "ہمسایہ سے محبت کرو" پر یونان کے عیسائی باشندے کاربند نہ ہو سکے اور بلحاظِ مذہب باقی مغربی ممالک کو یونانیوں سے جو قرابت اور موانست تھی اس کی بنا پر ترکی ٹوپی یورپ بھر کی نظروں میں خون آشام وحشی فطرت کا ایک نشان سمجھی جاتی رہی۔ مصطفےٰ کمال کی نگاہِ حقیقت بین نے جب اس عناد فی سبیل اللہ کو دیکھا جو اہلِ مغرب کو ترکوں سے تھا تو اس نے تبدیلی لباس کا حکم دیدیا تاکہ مغربی ممالک اس تنگ نظری کی وجہ سے خواہ مخواہ اتنی سی بات کے لیے ترکوں کے درپے تخریب نہ رہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ ان تمام ممالک کی جہاں ایک ہی قسم کی تہذیب و تمدن جاری ہو اس مشترکہ خصوصیت کی بنا پر ایک ہی ملّت ہو یا اس یکسانیت کے باعث ان سب کا اجتماع بالآخر ایک ملت کی صورت اختیار کر سکے۔ یورپ کے تمام ممالک کی تہذیب و تمدن ایک ہے لیکن پھر بھی ان میں مختلف ملتیں آباد ہیں اور یہ سب ملتیں اپنی ملی خصوصیات کی بنا پر ایک دوسری کی متباین ہیں۔ تہذیب کی یکسانیت انہیں ایک نہیں کر سکی۔ البتہ اس یکسانیت سے ان میں اس قسم کا ایک جذبہ پیدا ہو گیا ہے کہ مشرق مغرب سے مختلف ہے۔ اور وہ سب اس کے مقابلے میں ایک ہیں۔ تحریک پین اسلامزم اور

زرد اقوام کے ارتقا سے تمام مغرب یکساں طور پر ہراساں رہتا ہے ۔

زیادہ مہذب ملت بمقابلتاً کم مہذب ملت کو اپنے میں جذب کرنے کی بدرجۂ اتم اہلیت رکھتی ہے ۔ موجودہ مغربی تہذیب نے یونانی الاصل رومانوی تہذیب کو اپنے میں جذب کر کے یورپ سے باہر پھیلنا شروع کیا اور اب یہ مشرقی تہذیبوں یعنی اسلامی ہندی اور چینی تہذیبوں پر اثر انداز ہو رہی ہے ۔ مشرقی ممالک میں جہاں کہیں مغربی اقوام موجود ہیں وہاں مشرقی لوگ مغربیت کے رنگ میں رنگے جا رہے ہیں ۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا احساس ملی نابود ہو رہا ہے ۔ اس قسم کی تقلید کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک قوم میں قدرتی طور پر یہ خواہش پائی جاتی ہے کہ وہ بھی زینۂ ترقی پر قدم رکھے ۔ جب اسے کسی ایسی قوم کی نظیر ملتی ہے جو ترقی کر رہی ہو تو وہ قدرتاً ترقی کرنے کی خواہش کی بنا پر اس قوم کے طریقوں کو اختیار کرنا شروع کرتی ہے اور اس تقلید کی تہ میں یہ خیال مضمر ہوتا ہے کہ شاید ان طریقوں اور اصولوں پر کاربند ہونے سے وہ بھی بام ترقی پر پہنچ جائے ۔ زیرک اقوام تو کامیاب قوم کی سیرت کے ان خواص کو اپنے میں پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں جن کی بنا پر اس کی تمام تر ترقی ممکن ہوئی ہو ۔ لیکن پس ماندہ اقوام اس کے ظواہر کی نقل کرنے میں اپنا وقت کھو دیتی ہیں ۔ جاپان نے پہلے مغربی اقوام کے طریق کار کو سمجھنے کی کوشش کی اور پھر اس پر کاربند ہو کر خود بھی بام ترقی پر پہنچ گیا ایشیا کی باقی کئی اقوام ایک مدت سے اہل مغرب کے ظواہر کی تقلید میں بے معنی طور پر اپنے قیمتی وقت دولت اور قوت کار کو ضائع کر رہی ہیں لیکن ابھی تک پس ماندہ ہیں ۔

بہتر تہذیب کا اثر اس امر سے واضح ہو سکتا ہے کہ ترکوں نے بغداد فتح کیا وہاں کے حاکم بن گئے اور ان کو تمام سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا لیکن اسلامی تہذیب تمدن کی برتری کے سامنے انہیں سر تسلیم خم کرنا پڑا ۔ چنانچہ ترکوں نے اسلام قبول کیا اور من حیث القوم ملت اسلامیہ میں شامل ہو گئے ۔ اسی طرح ہندی تمدن کے زیر اثر کئی غیر ملکی فاتح اقوام بالآخر ہندوؤں

میں مل گئیں۔

ملّیت اور مذہب

ہر مذہب تخلیقِ کائنات کے مقصد کو پورا کرنے کی غرض سے اس کے خالق کے ساتھ اشتراکِ عمل کی ایک مخلصانہ کوشش ہے اور ملّیت بغرضِ حفظِ زندگی ملک کے باشندوں کے باہمی جذباتِ اتحاد و اتفاق کی عملی صورت۔ مذہب کا نصب العین وسیع اور عالمگیر ہے۔ ملّیت کا مطمحِ نظر محدود و داور تنگ۔ مذہب اقوامِ عالم کو آپس میں ملا دینا چاہتا ہے اور ان میں انس و محبت کے جذبات پیدا کر کے دنیا کو پیغامِ امن دیتا ہے۔ ملّیت ایک وطن کے باشندوں کو ایک مرکز پر لا کر انہیں بقائے زندگی کا تحفہ پیش کرتی ہے۔ عیسائیت نے مغرب میں تمام سلطنتوں کو ایک کر کے وعدۂ امن و امان دیا۔ لیکن ان ہی مختلف سلطنتوں کے احساسِ ملی نے اس ہمہ گیر مسیحائی نصب العین کی بیخ کنی کی اور پھر اسی احساسِ ملّی کی بنا پر انھوں نے اس قدر ترقی کر لی کہ اُن میں سے ہر ایک کی ہستی الگ الگ جلوہ گر نظر آنے لگی۔ مذہبِ اسلام نے مشرق میں عالمگیر اخوت کا درس دے کر مختلف ملکوں کو سیاسی طور پر ملا دیا۔ لیکن ملّیت کے ہاتھوں یہ رشتۂ اتحاد ٹوٹ گیا اور خلافت کا شیرازہ بکھر گیا۔ مگر اس پراگندگی سے وہ نتائج برآمد نہ ہوئے جو مغرب میں پاپائے روم کے اقتدار کے کم ہو جانے کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ پراگندگی نے مشرقی اسلامی ممالک پر عزل و انحطاط کی ذلتیں مسلط کر دیں۔

"اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے"

ملّیت کا اصل منشا یہ ہوتا ہے کہ ہر ملک سیاسی استحکام حاصل کرنے کے بعد آزادانہ ترقی کے راستہ پر گامزن ہو۔ اصلی ملّیت غصب و غلبہ، جبر و استبداد اور تصرفِ بیجا کے عناصر سے پاک ہوتی ہے اور اس

پردہ الزام عائد نہیں ہوسکتا جس کی طرف مذکورہ بالا شعر میں اشارہ کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کی اس نظم میں وطنیت سے مراد ایسی وطن پرستی ہے جو تعصباتِ قومی اور عنادِ سیاسی سے مملو ہو اور قومیت سے اُن کی مراد وہ جذبۂ اتحاد و اتفاق ہے۔ جو مختلف ملکوں کے مسلمانوں میں بوجہ مذہب پیدا ہو گیا تھا۔

مذہبی یگانگت احساسِ ملی کو پختہ کرتی ہے۔ اور اگر کسی ملک کے باشندوں کا مذہب ایک ہو تو اُن کا احساسِ ملیت پائیدار ہوتا ہے۔ لیکن اگر وہ باشندے دو ایسی جماعتوں پر مشتمل ہوں جن میں مذہبی اختلاف موجود ہو تو ان میں احساسِ ملیت اگر پیدا بھی ہو جاتا ہے تو دیرپا نہیں ہوتا۔ مذہب اتحاد و اتفاق سکھاتا ہے۔ لیکن خود غرض انسانی فطرت لڑائی کی طرف آمادہ کرتی ہے۔ اگر ہندوستان میں ہندو مسلم کا جھگڑا ہے تو ایران میں اسی شدت سے مسلمانوں کے دو بڑے فرقوں یعنی سنیوں اور شیعوں میں افتراق و انشقاق ہے۔ اور اگر کچھ اور آگے بڑھیں اور یورپ کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ قرونِ وسطیٰ میں وہاں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عیسائی اسی شد و مد سے آپس میں گلوگیر ہوتے رہے ہیں۔ مذہب کی بنا پر جو فتنے اور فساد کھڑے کیے جاتے ہیں وہ دراصل لوگوں کے مختلف گروہوں کے سیاسی و اقتصادی مفاد کی ٹکر ہوتی ہے۔ مذہب کو وہ محض حربہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ خود غرض۔ خود پسند۔ جاہ طلب صاحبِ اقتدار اشخاص مذہب کی آڑ میں اپنی مطلب برآری کے لیے اس قسم کے جھگڑے برپا رکھتے ہیں۔ ملیت اور مذہب ہر دو ان جھگڑوں سے بالاتر ہیں۔ نہ ملیت سے اس قسم کی تلقین ہوتی ہے نہ مذہب یہ تعلیم دیتا ہے۔ اگر ہندوستان میں صرف ایک قوم آباد ہوتی مثلاً ہندو تو آریہ سماجیوں اور سناتنیوں میں اسی قسم کے جھگڑے جاری رہتے جو یورپ میں عرصۂ دراز تک کیتھولکس اور پروٹسٹنٹس کے درمیان جاری رہے اور جن کی وجہ سے ہزاروں بندگانِ خدا نہایت سفاکی سے موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔ نہ ملیت ملکوں کو آپس میں لڑاتی ہے نہ مذہب خلقت کو آپس میں صف آرا ہونے

کا حکم دیتا ہے۔ درا صل اقتدار قائم رکھنے یا اقتدار حاصل کرنے کی خواہش بندگان خدا کا خون کراتی ہے ملیت کی اپیل اخلاص۔ شرافتِ نفس فراخ دلی۔ گویا فطرتِ انسانی کے ارفع اور نیک عنصر سے ہوتی ہے۔ اور مذہب بھی پاکیزہ انسانی جذبات سے اپیل کرتا ہے۔ مذہبی اختلافات کسی ملک کے باشندوں کے جذبہ ملیت کی ناپائیداری کی وجہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن جب شرارت پسند اور کوتاہ اندیش لوگ مذہبی اختلافات کو آلۂ کار بنا کر اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ملیت کی بنیادیں ہل جاتی ہیں لیکن مذہبی اختلافات کی بنا پر شرارت کا امکان صرف اُس وقت تک ہو سکتا ہے جب تک سیاسی۔ تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے باشندوں کی پس ماندگی قائم رہتی ہے اور وہ اپنی بُرائی بھلائی خود سوچنے کے قابل نہیں ہو جاتے۔ جب ہر لحاظ سے باشندوں کی تربیت مکمل ہو جاتی ہے تو خود غرضی اور ذاتی مفاد کے لیے مذہبی اختلافات کا حربہ بھی بے کار ہو جاتا ہے۔

ملیت صرف اُس وقت مختلف ممالک کے اتحاد و اتفاق پر جو مذہب کی وجہ سے معرضِ وجود میں آتا ہے چوٹ کرتی ہے جب ان میں سے کوئی ایک ناجائز طور پر اقتدار حاصل کر کے دوسروں سے تحقیر آمیز سلوک روا رکھنا شروع کر دے۔ یا اُن کے مفاد کو سرمایۂ استحصال سے ٹھکرا کر جابر اور غاصب بننے کی کوشش کرے۔ مذہب ایک اچھی چیز ہے لیکن جب اس کی آڑ میں ایک ملک دوسرے ملک کو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ظاہرًا یا در پردہ نقصان پہنچانا شروع کر دے تو اُس وقت ملیت کی روح خود بخود بیدار ہو جاتی ہے اور پھر انصاف کا تقاضا ان کے باہمی رشتہ اتحاد کو جو مذہب کی وجہ سے قائم ہوا ہوتا ہے توڑ دیتا ہے۔ اس کے بعد اگرچہ دونوں ملکوں میں وہی مذہب جاری رہتا ہے لیکن وہ تمام نسلی و ملکی اختلافات جن کو مذہب نے دبا رکھا تھا ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان میں مختلف ملتیں معرضِ وجود میں آجاتی ہیں۔ مشرق اور مغرب میں یہی ہوا۔ لیکن مغربی ممالک میں مختلف ملتوں کے پیدا ہونے سے ترقی کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی اس کے

برعکس مشرق میں جب ملتِ بیضا کا شیرازہ بکھر گیا اور اسلامی ممالک نے اپنی جُدا جُدا ملتیں قائم کرلیں تو ان کا انحطاط شروع ہو گیا اور ترقی کی وہ لہر جو ان ممالک سے اٹھی تھی فوراً رُک گئی۔

تاریخ شاہد ہے کہ ایک ہی ملک میں رہنے والے اور ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں میں جذبۂ ملی قائم بھی رہ سکتا ہے اور نہیں بھی رہ سکتا۔ انگلستان کے لوگوں نے ملکہ الزبتھ کے عہد میں کیا بلحاظ پروٹسٹنٹ اور کیا بلحاظِ کیتھولک یکساں طور پر ہسپانوی حملہ کی مدافعت کی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ایک ہی مذہب کے دو فرقوں میں یہ جذبہ پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن ایسی صورت میں جب کہ دو جماعتوں کے بنیادی اُصولوں میں اختلاف ہو ملت کا معرض وجود میں آنا نہایت مشکل ہوگا۔ اور اگر وہ معرض وجود میں آ بھی جائے گی تو اس کو استحکام حاصل نہیں ہو سکے گا۔ اس کے شیرازے کے بکھرنے کا ہر وقت امکان ہوگا۔ البتہ ایسی حالت میں جب کہ ہر دو جماعتوں میں سے ایک کو بہت زیادہ اکثریت حاصل ہو اور دوسری کو حد درجہ اقلیت۔ اتنی اقلیت کہ وہ نظر انداز کی جا سکتی ہو تو ان کے مذہبی اختلافات کے باوجود ملیت کا احساس پیدا ہو سکتا ہے۔ برعکس اس کے اگر وہ بلحاظ آبادی برابر ہوں یا اُن میں تھوڑا فرق ہو تو ملت قائم کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ آئرلینڈ کے باشندوں میں جو مذہبی اختلاف ہے وہ ان کے سیاسی اتحاد کے راستہ میں کئی صدیوں تک رکاوٹ بنا رہا۔ ڈچ اور بلجین بلحاظِ نسل آپس میں بہت ملتے جلتے ہیں اور ان کی زبان بھی ایک ہے لیکن مذہبی عقیدہ کے اختلاف کی بنا پر ان کا ایک جگہ رہنا مشکل ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اُن کو علیحدہ ہونا پڑا۔ مصر میں عیسائیوں اور مسلمانوں میں بہت کچھ مذہبی اختلاف موجود ہے۔ لیکن وہاں عیسائیوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے اور وہ اقلیت میں ہیں اس لیے ان میں اتنی خود اعتمادی نہیں کہ باقی مسلم اہالیانِ وطن سے عہدہ برآ ہونے کا خیال کبھی اُن کے دماغ میں سما سکے۔ یہی وجہ تھی کہ زاغلول پاشا نے انہیں سادہ چیک پیش کر دیا تھا اور یہ اکثریت کی خود اعتمادی کا ثبوت تھا۔ ہندوستان میں دونوں بڑی جماعتوں میں سے ہر ایک آبادی کے لحاظ سے

کثیر التعداد ہے۔ اس لیے وہ ایک دوسری سے خوف کھاتی ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو بھی اتنی خود اعتمادی حاصل نہیں کہ وہ زاغلول پاشا کی طرح جرأت سے کام لے کر دوسری جماعت کو سادہ چیک پیش کر دے۔ اگر کسی ملک کے باشندے مختلف مذہبوں کے پیرو ہوں تو اُن میں احساس ملی اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جبکہ اشاعتِ تعلیم اور مشترکہ اقتصادی مفاد کی بنا پر ان کے تعصبات مذہبی کی بیخ کنی ہو جائے اور وہ باہمی طور پر متحمل اور بُردبار ہو جائیں۔

ملّیت اور روایات و مشاہیر

ملّت پر نسل۔ زبان اور مذہب کا اثر خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کی پُرانی روایات اور اُن نامور ہستیوں کے جنگی و معاشرتی کارنامے جو پہلے گذر چکی ہوتی ہیں انہیں ایک ایسے رشتۂ محکم میں جوڑ دیتے ہیں جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا ہے۔ کسی بڑی مصیبت کی یاد جو سب پر یکساں طور پر نازل ہوئی ہو۔ یا ایسا واقعہ جس کا اثر سب کے دل و دماغ پر کالنقش فی الحجر ہو چکا ہو تمام فرزندانِ وطن کو ہمیشہ کے لیے ایک کر دینے کا اعجاز رکھتا ہے۔ قومی بہادروں اور ملکی شجاعوں کے کارنامے سب کی مشترکہ دولت ہوتے ہیں۔ ایسی جاں باز ہستیاں اپنے ہموطنوں کی عام ذہنیت اور خصوصیات کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ ان پر فخر کرنا گویا کہ اپنے پر فخر کرنا ہوتا ہے۔ ملک بھر میں ان کے کارہائے نمایاں کی تعریف نظموں اور قصّوں کی صورت میں کی جاتی ہے۔ رامائن اور مہابھارت ہندوستان کی مشترکہ دولت ہیں۔ یہ کتابیں مشعلِ ہدایت ہیں۔ اور قوم کے افراد ان کو پڑھ پڑھ کر حوصلہ اور سبق حاصل کرتے ہیں۔ رام اور کرشن کی سی شخصیتیں ملک کا نصب العین بن جاتی ہیں اور اس سے لوگوں میں اتفاق و اتحاد کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ترانۂ ہندی جن جذبات کا عکس ہے ان سے بھلا کون سا ہندی متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔

"یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا
اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں — معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا"

آخری شعر میں الفاظ "دردِ نہاں" سے جن حالات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اُن کے احساس سے ہر سچے خیر خواہِ وطن کو دلی صدمہ ہوتا ہے۔

"چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا — نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا"

اس شعر کو پڑھ کر اہلِ ہند چشتی اور نانک کی شخصیتوں پر فخر کرتے ہیں۔ اور یہ بات اُنہیں حب الوطنی کا سبق دیتی ہے۔ کیونکہ جس ملک میں ایسی شخصیتیں پیدا ہوئی ہوں وہ واقعی محبت کے قابل ہے۔

ترانہ ہندی۔ قومی گیت۔ رام۔ نانک۔ سوامی رام تیرتھ کی سی نظمیں ان ہی جذبات کی آئینہ دار اور احساسِ ملی کی محرک ہیں۔ اسی طرح اقبال کی صقلیہ اور بلادِ اسلامیہ ایسی نظمیں ملتِ اسلامیہ کے زمانۂ ماسبق کی یاد کو تازہ کرتی ہیں۔ اور اس سے افراد کے جذباتِ ملی میں ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ صرف نقطۂ نظر کے بدلنے کی دیر ہے بہت جلد سب ہندوستانی جماعتیں یکساں طور پر کہہ سکیں گی کہ کورو اور پانڈو ہم ہی تھے۔ کرشن۔ ارجن۔ بھیم ہمارے ہی بہادر تھے۔ چندر گپت بکرماجیت۔ اننگ پال اور پرتھوی راج کی سی قابلِ ناز ہستیاں ہم ہی میں سے تھیں۔ مہا بیر رانا سانگا کے جسم کے بیسیوں زخم ہماری قومی بہادری اور عزم و استقلال کے نشان تھے۔ اس مایۂ ناز ہندوستانی جلال الدین اکبر کی کوہ وقار ہستی ہمارے لیے باعثِ صد افتخار ہے۔ کیونکہ وہ ہمارے قومی تدبر اور جاہ و حشمت کی دلیل ہے اور شاہ جہان۔ جہانگیر۔ اورنگ زیبِ عالمگیر کی شخصیتیں بھی اس خطہ کی مردم خیزی کی دلیل ہیں۔

ڈچ نسل۔ زبان اور مذہب وغیرہ کے اعتبار سے جرمنوں سے بہت زیادہ ملتے جلتے

ہیں اور قرونِ وسطےٰ میں یہ جرمنوں میں شامل تھے۔ لیکن باوجود ایسی قرابت کے ان کی ایک علیحدہ ملت ہے۔ قومی آزادی کے تحفظ کی خاطر ہسپانیہ کے ساتھ انہیں جو معرکے پیش آئے وہ ان میں جذبۂ ملّیت پیدا کرنے کے محرک ہوئے۔ اسی آزادی کے بچانے کے لیے بحری طاقت جو اُن کو اپنی جرأت اور جاں بازی کی بدولت حاصل ہوئی تھی اس کے فخر نے انہیں باہمی طور پر متحد کر دیا۔ جو قربانیاں اُنہیں ان جنگوں کے دوران میں کرنی پڑیں اُن سے ان کی ایک انفرادی حیثیت قائم ہو گئی جس کی بدولت سترھویں صدی میں ان کے علم و ادب اور فنونِ جمیلہ مثلاً مصوری نے شہرتِ دوام حاصل کی اور اب ماضی کی یہی خوشگوار یادگاریں انہیں اپنی ہستی کو علیحدہ طور پر برقرار رکھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ورنہ اُن کے اقتصادی مفاد اسی میں ہیں کہ وہ جرمنی کے ساتھ مل جائیں۔ بعینہٖ سکاٹ لینڈ والوں کی اہلِ برطانیہ کے خلاف معرکہ آرائیاں زندۂ جاوید یادگاریں ہیں۔ اِسی طرح ۱۸۱۳ء میں نپولین کے دورِ استبداد کی بدولت اہلِ جرمنی میں حبّ الوطنی کے جذبات پیدا ہو گئے۔ ژاں دارک اور نپولین کے نام اہلِ فرانس کی ملّیت کے نشان ہیں۔ انگریزوں کو الفرڈ کرامول۔ ملکہ الزبتھ ولنگٹن اور نیلسن کی سی شخصیتوں نے دائمی طور پر متحد کر دیا۔ اور ان کی یادگار ملت کے لیے اس مضبوط رسی کا کام دے رہی ہے جو پتلی پتلی اور کمزور لکڑیوں کو یک جا باندھ کر اسے ایک بھاری اور ناقابلِ شکست گٹھا بنا دیتی ہے۔

امرت سر میں حادثہ جلیانوالہ باغ پنجاب کے ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے لیے کوئی مہنگا سودا نہ تھا۔ اس کی دلخراش یاد اس صوبہ کے باشندوں نیز ان کی آئندہ نسلوں کو ایک عرصہ تک اتحاد و اتفاق کا سبق دیتی رہے گی۔ اس واقعہ نے پنجاب کے ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں میں کئی قوم پرست لیڈر پیدا کر دیے اور کم از کم عوام پر یہ حقیقت کھول دی کہ موت کے سامنے ہندو، مسلم کی تمیز جاتی رہتی ہے۔ اس قسم کے واقعاتِ حزنیہ بھی قوم میں زندگی پیدا کرتے ہیں اور اگر

کسی ملک کے باشندوں کے دلوں پر ایک دفعہ اس قسم کے نہ مٹنے والے تاثرات پڑ جائیں تو آئندہ کے لیے اُن کی ایک ملت معرضِ وجود میں آجاتی ہے اس لیے ایسے واقعات جو سب کے لیے یکساں طور پر قابلِ فخر اور اُن کی متفقہ کوششوں کا نتیجہ ہوں اتحاد و اتفاق کی داغ بیل ڈال دیتے ہیں۔ جنگِ عظیم میں اتحادیوں کی فتح ان میں سے ہر ایک کے لیے قابلِ فخر واقعہ ہے یہ فتح فرانسیسی انگریز اور امریکی وغیرہ ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ طور پر ایک قومی فتح ہے اور اس کی یاد اُن کے جذباتِ ملیت کو تقویت دیتی ہے۔ جنگ کا اثر چونکہ تمام آبادی پر پڑتا ہے اور سب کو یکساں طور پر (خواہ جنگ میں اپنی شمولیت سے یا احباب و اقارب کی شمولیت سے) نقصان پہنچتا ہے۔ اس لیے اگر انجام کار فتح ہو تو یہ خوشگوار نتیجہ سب کے لیے باعثِ اطمینان ہوتا ہے۔ جہاں ان کو اپنے نقصانات کی یاد تازہ رہتی ہے وہاں یہ بھی فخر ہوتا ہے کہ ہم نے دشمن کو شکست دی تھی۔ اہلِ سوئٹزرلینڈ تین ہمسایہ اقوام سے مل کر ایک ملت بنے ہیں اور اُن کی ملت کے معرضِ وجود میں آنے کا سبب سوائے اس جنگِ آزادی کے جو ان کو لڑنی پڑی اور کچھ نہ تھا۔ اس جنگ کی وجہ سے اُنھوں نے مردانہ وار بہت سے مصائب برداشت کیے۔ چنانچہ ابتلا و آزمائش کے زمانہ کی تلخ یاد نے سوئٹزرلینڈ کے باشندوں کو دائمی طور پر متحد کر دیا اور اب اُن کی ایک علیحدہ ملت قائم ہے۔

ملیت اور مشترکہ مفاد

دورِ جدید کا ایک یہ بھی نظریہ ہے کہ ہر انسانی تحریک کی تہ میں ضرور کوئی اقتصادی غرض پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس نظریہ کی صحت سے ہمیں واسطہ نہیں لیکن یہ انسانی مشاہدہ میں آچکا ہے کہ اگر کسی ملک کے لوگ بلحاظِ پیشہ خواہ وہ تجارت ہو یا صنعت و حرفت۔ دوسرے ممالک کے لوگوں سے مختلف

ہوں تو ان میں ملیت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں یعنی جب عوام کے مشترکہ مفاد کی نوعیت ایک ہو تو اُن میں ایسے تعلقات قائم ہو جاتے ہیں جو بالآخر قیامِ ملت پر منتج ہوتے ہیں۔ مشترکہ مفاد اتحادِ ملی کو قائم کرنے میں مدد دیتے ہیں لیکن بذاتِ خود اتحاد کے بنیادی اصول نہیں بن سکتے۔ ڈچ اور بلجین ملتوں کو ان کے مشترکہ مفاد کی وجہ سے کافی مدد ملی۔ ۱۸۰۷ء میں جب سکاٹ لینڈ اور انگلستان کا باہمی الحاق عمل میں آیا تو اُس وقت ان دونوں ملکوں کے سیاسی و اقتصادی مشترکہ مفاد پیشِ نظر تھے۔ لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے مشترکہ مفاد خود ملت کی بنا نہیں ڈال سکتے۔ سلطنتِ برطانیہ کے مقبوضات میں علیحدہ علیحدہ ملتیں قائم ہو رہی ہیں اگرچہ ان سب کا سیاسی مفاد ایک ہی ہے۔ جہاں ملیت کا خیال پہلے ہی سے لوگوں میں پیدا ہو چکا ہو وہاں مشترکہ مفاد سے اس نصب العین کے حصول میں مدد ملتی ہے۔ ہندوستان میں ملیت کا خیال پیدا ہو چکا ہے اور عین ممکن ہے کہ آئندہ مشترکہ زرعی مفاد کی بنا پر قصرِ ملت کی تعمیر و تکمیل عمل میں آئے اور ہندو مسلم سکھ جماعتوں کی باہمی تمیز اُٹھ جائے اور ان کی بجائے تمام آبادی دو بڑے سیاسی گروہوں زمیندار اور غیر زمیندار میں منقسم ہو کر منصۂ شہود پہ جلوہ گر ہونے لگے۔ زرعی مفاد کے پیشِ نظر (کیونکہ اس وقت زراعت کی ترقی پر زور دیا جا رہا ہے) ملک میں عوام کی تقسیم کسی حد تک "دیہاتی آبادی" اور "قصباتی آبادی" میں عمل میں آ چکی ہے۔ قصباتی آبادی کا پیشہ زیادہ تر تجارت یا صنعت و حرفت ہے اور دیہاتی آبادی کا زراعت۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس ملک میں ایک "زمیندار ملت" قائم ہو۔ کیونکہ قلتِ زر اور موجودہ کساد بازاری سے سب آبادی پر یہ واضح طور پر ثابت ہو گیا ہے کہ عوام کا گذارہ خواہ وہ صناع ہوں یا تاجر زراعت پر ہے اور زراعت ہی ملک کی سب سے بڑی قومی خصوصیت ہے۔ اسی تعلق کی بنا پر دیہاتی آبادی کو جب سے نئی اصلاحات شروع ہوئی ہیں حکومت اور سیاسیات میں حصہ دیا جانے لگا ہے۔ اقتصادی اغراض کی یکسانیت کی وجہ سے ملتوں کے قائم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

لیکن اقتصادی اغراض کی خاطر کسی ملت کو فنا کرنا محال ہوتا ہے جرمنی نے اہلِ پولینڈ کے جذبہ ملی کو مٹانے کی غرض سے وہاں پر شیا کے کاشتکاروں کو بے جا آباد کر دیا۔ لیکن یہ اقتصادی خود غرضی بجائے اس کے کہ اہلِ پولینڈ کی ملی حیثیت کو نیست و نابود کرتی اُن کے جذبہ ملیت کو اور زیادہ مستحکم کرنے کی ایک معقول وجہ بن گئی اور اس کی یہ کارروائی اہلِ پولینڈ کے احساسِ ملی کو تباہ نہ کر سکی۔

ملیت اور سیاسی اتحاد

اگر کوئی ملک ایک طویل عرصہ سے ایک ہی حکومت کے ماتحت ہو اور وہ حکومت عدل و انصاف پر مبنی ہو اور سب لوگوں سے یکساں سلوک روا رکھتی ہو نیز اُس نے لوگوں کو مکمل مذہبی آزادی بھی عطا کر رکھی ہو تو وہاں یکجہتی اور یگانگت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ جب اس کے باشندوں کی آپس میں وابستگی بڑھتی جاتی ہے اور اُن کے باہمی لگاؤ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے تو وہ بالآخر ایک ملت کی صورت اختیار کرنے لگتے ہیں۔ نارمن اور انجیون خاندانوں کے بادشاہوں نے انگلستان میں معدلت گستری کا ایک ایسا اعلیٰ معیار قائم کیا کہ اس سے وہاں کی غیر منظم آبادی میں اپنے ایک ہونے کا احساس پیدا ہو گیا اور بالآخر وہ ایک عظیم الشان ملت بن گئے۔ اسی طرح فرانس میں فلپ آگسٹس کے بعد جتنے خود مختار بادشاہ گزرے ان کے ماتحت وہاں کے باشندے متحد ہو گئے۔ علیٰ ہذا القیاس چارلس پنجم اور فلپ دوم شاہانِ سپین نے ملک کی مختلف ریاستوں کو ملا کر عوام میں جذبۂ اتحاد پیدا کر دیا۔ بادشاہ کی ہستی ایک ایسے نقطۂ جاذب کے مترادف ہوتی ہے جس پر کہ ملک کے مختلف طبقے اور حصے ایک دوسرے سے آکر ملتے ہیں۔ تخت کے گرد سب جمع ہو سکتے ہیں اور بادشاہ غیر ممالک کے سامنے اپنے ملک کی ایک واحد حیثیت میں نمائندگی کرتا ہے۔ لیکن جب یہ مرکز اپنی جگہ سے ہٹ جاتا ہے تو ملک کی متحدہ نمائندگی کے لیے کوئی نہیں رہتا اور [illegible] کی نظر کسی ایسی شخصیت پر

نہیں پڑتی جس میں ملک کے سب طبقے اور خطے مرکوز ہوں اور جو اُن کو کسی قسم کی ناجائز جبات، حق تلفی یا مداخلتِ بیجا کے کرنے سے مانع ہو۔ ایسی حالت میں ملت کے اجزا درہم برہم ہوجاتے ہیں سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے بعد ایسا ہی ہوا۔ اور انگریزوں نے ان بکھرے ہوئے اجزا کو پھر اکٹھا کرکے اپنے آپ کو نقطۂ جاذب بنالیا۔ عہدِ مغلیہ میں زمانہ کے خیالات کے مطابق ہندوستان کی ایک واحد شخص کے ذریعہ نمائندگی ہوسکتی تھی لیکن سلطنتِ مغلیہ کا تختہ الٹتے ہی تمام اجزائے سلطنت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ باشندوں کے مختلف طبقے اور ملک کے مختلف حصے ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔ لیکن عہدِ برطانیہ میں ان سب کی نئے سرے سے شیرازہ بندی ہوئی اور اس سیاسی اتحاد کی بنا پر انہیں ازسرِنو اپنی واحد حیثیت قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور چونکہ زمانہ کی روش کا اثر سب پر ہوتا ہے۔ اِس لئے ہندوستان میں بھی اب دورِ جدید کے خیالات کے مطابق ایک ملت قائم کرنے کا خیال پیدا ہوگیا ہے۔ اِس ملیت کی تخلیق و تربیت انگریزوں کی موجودگی میں بخیر و خوبی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہے اور اب اس کا احساس بھی عوام میں شدید طور پر پیدا ہوچکا ہے۔ یہ نکتہ کہ سیاسی اتحاد کا ملیت پر کیا اثر ہوتا ہے معمولی تجربہ اور مشاہدہ سے واضح ہوسکتا ہے۔ جب کبھی کسی ضلع کی تحصیلوں میں تغیر و تبدل کیا جاتا ہے یعنی ایک ضلع کی کسی تحصیل کو کسی دوسرے ضلع میں شامل کر دیا جاتا ہے تو اس تبدیلی کے فوراً بعد اس تحصیل کے باشندوں کا پُرانے ضلع سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے اور وہ اپنے نئے ضلع کے معاملات میں دلچسپی لینے لگتے ہیں اور چونکہ ان کے مقدمات کی سماعت اب نئے ضلع کی عدالتوں میں ہونے لگتی ہے اس لیے نیا ضلع ہی عام گفتگو کا موضوع بن جاتا ہے اور تھوڑے عرصہ کے بعد ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ ان کا اپنے پہلے ضلع کے ساتھ کبھی کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ ان کے رشتے ناتے بھی نئے ضلع میں ہونے شروع ہوجاتے ہیں۔ یہی حال بڑے پیمانے پر ایک ملک کا ہوتا ہے۔

عدل وانصاف کی حکومت اگر عوام کو ملیت کا سبق سکھاتی ہے تو دورِ استبدادیت بھی لوگوں کو باہمی طور پر متحد ہونے کا درس دیتا ہے۔ اگر کسی ملک میں کوئی ایسی غیر ملکی حکومت قائم ہو جس کی بنیاد عدل وانصاف پر مبنی نہ ہو اور جس کی طرف سے لوگوں پر طرح طرح کے ظلم وستم ڈھائے جاتے ہوں تو ان مشترکہ مصائب سے جو حکومت کی طرف سے ان پر نازل ہوتی ہیں انہیں آپس میں مل جانے اور متحد ہونے کا خیال پیدا ہوتا ہے اگر وہ انقلاب یا بغاوت سے اس حکومت کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر ان کے ایک ملت بن جانے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ امکانات ایک واقعہ کی صورت اختیار کر لیں۔ اس کے ساتھ ان دیگر موافق حالات کی موجودگی جن کا ذکر کیا جا چکا ہے ضروری ہے۔ مثلاً اگر افغانستان اور ہندوستان میں ایک ہی حکومت قائم ہو جائے تو اس سیاسی اتحاد کی بنا پر جو افغانستان اور ہندوستان کے مابین اس طرح عمل میں آئے گا ان ملکوں کی ایک ملت نہیں بن سکے گی خواہ ہندوستان کی تمام آبادی مسلم ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ ایک مذہبی مشترکہ خصوصیت کے مقابلہ میں دیگر باہمی اختلافات اس کے مانع ہوں گے۔ ایسی حالت میں جبکہ تخلیقِ ملت کے لیے دیگر موافق اور ضروری حالات کسی حد تک معرضِ وجود میں آچکے ہوں کسی ظالم بے انصاف حکومت کے تابع سیاسی اتحاد کی وجہ سے جذبۂ ملی کا پیدا ہو جانا ممکن ہو سکتا ہے۔ ورنہ چین ہندوستان اور ایشیا کے دیگر ممالک میں ایک ہی حکومت قائم کرنے سے خواہ وہ مبنی بر انصاف ہو یا نہ ہو ان سب میں ایک ملت معرضِ وجود میں نہیں آسکتی جونہی مشترکہ حکومت کا وجود ان کے درمیان سے اُٹھ جائے گا وہ جُدا جُدا ہو جائیں گے۔

سیاسی اتحاد کی بنا پر لوگوں کا آپس میں جو تعلق پیدا ہوتا ہے اس کی وضاحت اس ایک معمولی واقعہ سے ہو سکتی ہے جو چند روز ہوئے لاہور میں پیش آیا۔ ایک سینما ہوس کے سامنے سڑک پر چند اینگلو انڈین موٹر کار میں سوار تھے غالباً سینما دیکھ کر واپس گھر جا رہے تھے۔ ان کا ایک ساتھی موٹر کو سٹارٹ کر رہا

تھا۔ ایک برقعہ پوش عورت جو سڑک پر چلی جا رہی تھی ٹھہر گئی اور اُس سے بھیک مانگنے لگی وہ خاموش رہا لیکن جب عورت نے دوبارہ اور سہ بارہ سوال کیا تو اُس نے جھنّا کر کہا جاؤ اپنے بھائیوں سے جا کر خیرات مانگو" ایک نوجوان تعلیم یافتہ پنجابی قریب سے گذر رہا تھا وہ یہ الفاظ سُن کر رک گیا اور اینگلو انڈین سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "آخر تم بھی تو اس کے بھائی ہو۔ تم اسے کیوں بھیک نہیں دیتے؟" اس پر اینگلو انڈین جو جھکا ہوا تھا سیدھا کھڑا ہو گیا اور ایک بلند بانگ قہقہہ لگا کر پوچھنے لگا "وہ کیسے ہم اس کے کیونکر بھائی ہوئے؟"

پنجابی نوجوان نے پر تمکنت لہجہ میں اور نہایت شگفتہ مزاجی سے جواب دیا کہ ہم ایک ہی ملک میں رہتے ہیں۔ آپ غالباً یہیں پیدا ہوئے اور یہیں آپ نے پرورش پائی۔ ہماری عدالتیں ایک ہیں۔ ہماری حکومت ایک ہے اور اس کا آئین ایک ہے۔ ہم ایک ہی قانون کے تابع ہیں اور ہم سب کا ایک ہی فرمانروا ہے۔ اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو سب یکساں طور پر اُس کا شکار ہوتے ہیں۔ غالباً آپ جنگِ عظیم کو بھولے نہیں۔ موجودہ کساد بازاری اور اقتصادی انحطاط کی وجہ سے جیسے ہم پریشان ہیں ویسے آپ بھی پریشان ہیں۔ ہم کو بھی ملازمتوں سے نکالا جا رہا ہے اور آپ کو بھی ہم اور آپ یکساں طور پر بے روزگاری کا شکار ہو رہے ہیں۔ کیا ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے ہمارے بھائی بھائی ہونے میں شک رہ جاتا ہے؟ آپ ایک معمولی امتیاز اور ذاتی شیخی کی بنا پر حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔ پنجابی نے یہ الفاظ کچھ ایسے انداز اور خلوص سے کہے کہ اینگلو انڈین جس کے ہاتھ پتلون کی جیبوں میں جا چکے تھے اور جو تحکمانہ انداز میں اکڑا کھڑا تھا۔ اب ڈھیلا پڑ گیا۔ اُس نے جیب میں سے ہاتھ نکالا اور پنجابی کی طرف بڑھا دیا۔ دونوں نوجوانوں نے ہاتھ ملائے اور اپنی اپنی راہ لی۔ ان کے گرد لوگوں کا جو ایک چھوٹا سا حلقہ جمع ہو گیا تھا ان کی نظریں اس اطمینان کا اظہار کر رہی تھیں جو اُنہیں ان دونوں کی گفتگو سے حاصل ہوا تھا۔

جن امور کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان سے واضح ہو گیا ہو گا کہ قیامِ ملت کے لیے دنیا کے پاس کوئی خاص اصولی نسخہ موجود نہیں کہ جس کے مطابق عمل کرنے سے کسی ملک میں ایک ملت معرض وجود میں لائی جا سکتی ہو اگرچہ ملیت باشندوں کے ان تعلقاتِ باہمی کے تابع ہوتی ہے جو مذہب نسل اور زبان وغیرہ کی یکسانیت کی وجہ سے پیدا ہو جاتے ہیں لیکن بعض اوقات وہ ان تمام تعلقات اور قیود سے بالاتر بھی ہوتی ہے۔ تخلیق ملیت کے لیے باشندوں کے ایسے باہمی تعلقات ضروری بھی ہوتے ہیں اور ضروری نہیں بھی ہوتے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملیت ایک جذبہ ہے جو وسیع پیمانہ پر کثیر التعداد انسانوں کے سینوں کو کسی قرابت کی بنا پر گرما دیتا ہے اور جس کے پیدا ہو جانے کے بعد وہ ایک دوسرے سے الگ ہونا پسند نہیں کرتے۔ کسی ملت کے متعلق یہ کہنا کہ وہ ایک ملت کیوں ہے نہایت مشکل ہے۔ اگر کچھ جواب بن سکتا ہے تو صرف اتنا کہ ہاں وہ ایک ملت ہے اور بس۔ ملیت کا کوئی خاص معیار نہیں۔ ملت کے افراد اپنے کو ایک ملت سمجھتے ہیں۔ اور انھیں اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ وہ ایک ملت ہیں۔ نیز کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ ملت کے لیے کون کون سے حالات کی موجودگی لازمی ہوتی ہے اور اس کے کیا کیا نشان ہوتے ہیں۔ جب کوئی ملت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کا احساس سب کو ہو جاتا ہے اور یہی ایک احساس ملت کی لازمی شرط اور اس کا ظاہری نشان ہوتا ہے۔ ملیت لوگوں کا ایک روحانی تعلق ہے جو کسی مشترکہ نصب العین یا کسی دیگر مشترکہ ضرورت یا مجبوری کی وجہ سے قائم ہو جاتا ہے اور اس کے قائم ہونے کے بعد جماعت کا فرد محض فرد نہیں رہتا بلکہ وہ جماعت کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔ اس میں اس کی ملت کی ذہنی و جسمانی ہر قسم کی خصوصیات منعکس ہو جاتی ہیں۔ اس کا جینا اور مرنا ملت کی موت و حیات پر منحصر ہوتا ہے۔ وہ جیتا ہے تو ملت کے لیے اور اگر مرتا ہے تو ملت کے لئے۔

ملتوں کے استحکام کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ملتیں جن کو دشمن کی تلوار

تراشتی ہے ۔جن کو عدو کا ظلم و ستم معرضِ وجود میں لاتا ہے اور جن کی تشکیل ملک کی خاطر خون کی ندیاں بہانے اور دیگر ایسے مصائب جھیلنے سے عمل میں آتی ہے پختہ تر اور پائندہ تر ہوتی ہیں ۔کیونکہ ملکی خطرہ اور قومی تکالیف کی یاد افرادِ ملت کو اس خوبصورتی سے آپس میں ملا دیتی ہے کہ اکٹھے رہنا ان کی فطرت میں داخل ہو جاتا ہے ۔

ملیت کے فوائد اور نقصان

ملیت کے نصب العین کی موزونیت اور مفاد کے بارہ میں مفکرین کی ایک اقلیت کو شک وشبہ ہے ۔اس کے برعکس ایک بھاری اکثریت ایسی بھی ہے جو ملیت پر ایمان رکھتی ہے ۔حامیان ملیت بین الملل تعلقات کے قیام کے خواب دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح افراد کے باہمی ربط وضبط سے ایک جماعت کی تشکیل عمل میں آتی ہے اسی طرح ملی حکومتوں کے باہمی تعلقات بھی اس طرح قائم ہو سکتے ہیں کہ ایک طرف تو امن عالم جنگوں کے خطرہ سے محفوظ ہو جائے اور دوسری طرف ملکی حکومتوں کی غرض وغایت بھی پوری ہوتی رہے ۔مخالفین ملیت کو یہ اندیشہ ہے کہ ملیت کی روح امن عالم کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوگی ۔اب دیکھنا یہ ہے کہ ملیت کے حامیان کی خوش توقعات اور مخالفین کے خدشے کہاں تک ممکن ہیں ۔پہلے ہم مخالفین کے اعتراضات پر غور کریں گے ۔ ان کے نزدیک تین اہم وجوہ کی بنا پر ملیت ناقابلِ قبول ہے ۔اوّل اس لیے کہ ملیت کا آغاز اور انجام بدامنی پر منحصر ہے ۔ دوم اس لیے کہ ملیت انسانی طبائع کو سوداگریت کی طرف راغب کرتی ہے ۔سوم اس لیے کہ بسا اوقات ملیت عسکریت میں بدل جاتی ہے ۔سب سے پہلا اعتراض کہ ملیت کا آغاز وانجام بدامنی پر منحصر ہے اس بنا پر کیا جاتا ہے کہ اس وقت جب کہ لوگوں میں جذبہ ملی پیدا ہو جاتا ہے ۔پہلا خیال جو اجتماعی طور پر سب کو سرگرم عمل ہونے کی دعوت دیتا ہے

یہ ہے کہ حکومت نے عوام کو نہایت خود غرضانہ طور پر چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کر کے ایک دوسرے کے خلاف کر رکھا ہے یعنی کہ وہ "محکمی جستن ز تدبیرِ نفاق" کے اصول پر کاربند ہے۔ اگر ان کی اس قسم کی تخریبی تقسیم نہ ہوئی ہو تو پھر دوسرا اعتراض جو ہر زبان پر ہوتا ہے یہ ہے کہ حکومت اپنی قدامت پرستی کی وجہ سے لوگوں کو اپنے جبلی رجحانات کے مطابق سیاسی ترقی کرنے سے روکتی ہے۔ اگر حکومت کے خلاف اس عام اعتراض کے پیش کرنے کی گنجائش نہ ہو تو تیسرا اعتراض جو عوام کی گرانیٔ خاطر کا موجب ہو سکتا ہے حکومت کے غیر ملکی ہونے کا اعتراض ہے۔ لہٰذا حکومت خواہ ملکی ہو یا غیر ملکی احساسِ ملیت کے پیدا ہوتے ہی وہ عوام کی نظروں میں مقہور ہو جاتی ہے اور سیاسی شور و شر سے امنِ عامہ معرضِ خطر میں پڑ جاتا ہے۔ اگر سیاسی تحریکات کے کامیاب ہونے کی صورت میں ایک ایسی ملی حکومت قائم ہو جائے جس کے ماتحت ملی ارتقا کے تمام امکانات کو جامۂ عمل پہنایا جا سکتا ہو تو دوسرا خیال جس کی فوراً تکوین و تدوین شروع ہو جاتی ہے ملی شہامت اور ملی اقتدار حاصل کرنا ہوتا ہے یعنی کہ ملّیت سے بالآخر ملّی تاجرئیت اور ملّی عسکریت کے نتائج مترتب ہوتے ہیں۔ ملت سرمایہ داری کی اغراض سے اپنے کاروبار کو رونق دینا چاہتی ہے جس کے لیے دورِ جدید کے دستور کے مطابق پہلے ملکی صنعت و حرفت کی ترقی کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر تیار شدہ اشیا کی فروخت کے لیے وساور میں منڈیاں تلاش کرنی پڑتی ہیں منڈیوں کی جستجو اور تخصیص کے لیے دیگر صنعتی ممالک سے لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی تجارت کے لیے ولندیز، پرتگیز، فرانسیسی اور انگریز آپس میں کافی دیر تک لڑتے جھگڑتے رہے۔ اسی طرح چین کی بندرگاہوں کو غیر ملکی جہازوں کے لیے کھول دینے اور چین کی منڈیوں میں غیر ملکی اشیاء کی کھپت کے لیے بھی جنگ و جدال ہوا۔ اسی طرح اگر کوئی ملت معدنی یا زرعی پیداوار کے لیے دیگر ملکوں کی دست نگر ہو تو اسے پس ماندہ ممالک پر اپنا تسلط جمانے کی سوجھتی ہے اور پھر وہ حریف

طاقتوں سے نبرد آزما ہوتی ہے۔ چنانچہ سفید اقوام میں اکثر اس قسم کے معرکے ہوئے اور پس ماندہ ملک اُن کی یورشوں کی جولانگاہ بنے رہے۔ افریقہ، امریکہ، ایشیا اور آسٹریلیا تلّی تا جزئیت کے زخم خوردہ ہیں۔

آخری اعتراض جو ملیت کے خلاف پیش کیا جاتا ہے اس کے عسکریت میں بدل جانے کی بنا پر ہے۔ مخالفینِ ملیت کے خیال میں اگر کوئی ملت سوداگری کی سرگرمیوں کی وجہ سے امنِ سوزِ عالم نہیں بنتی تو اس کی ملی اقتدار پرستی دنیا کے لیے ضرور خطرہ کا باعث بن جاتی ہے۔ ایک ملت محض غلبہ حاصل کرنے کی خاطر ہمسایہ ممالک کی تسخیر کا قصد کرتی ہے جس کی وجہ سے لڑائی چھڑ جاتی ہے اور دنیا کے امن میں خلل آجاتا ہے۔ جنگِ عظیم کا باعث جرمنی کی عسکریت تھی۔ معترضین کے خیال کے مطابق کسی خاص ملک کا اس قدر زیادہ افواج فراہم کر لینا کہ ان کی موجودگی امنِ عالم کے لیے باعثِ خطرہ بن جائے عسکریت پسندی نہیں۔ اُن کے خیال میں عسکریت فراہمیِ افواج یا فوجی سپاہیوں کی جنگجو طبائع میں مضمر نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک ایسا نقطۂ نظر ہے کہ جس پر ملک کے باشندے کیا فوجی اور کیا غیر فوجی سب مجموعی طور پر متحد و متفق ہوتے ہیں اور ان سب کے خیال میں ملک کی بڑائی اور عظمت کا معیار یہی ہوتا ہے کہ اس نے کتنے معرکوں میں کامیابی حاصل کی ہے کتنے ملک فتح کئے ہیں اور کہ کتنے علاقے اُس کے زیرِ فرمان اور اُس کے باج گذار ہیں وغیرہ وغیرہ جذبۂ عسکریت اتنا فوجی سپاہیوں میں نہیں ہوتا جتنا کہ ایک شہری کاروباری آدمی میں پایا جاتا ہے کسی عسکریت پسند ملک میں جنگ کی فتح کی خوشخبری اخبار میں پڑھ کر محاذِ جنگ سے دور بیٹھے ہوئے ایک غیر فوجی کو جو لطف حاصل ہوتا ہے وہ شاید جنگ میں شریک ہونے والے سپاہی کو بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ ملک کے ہر فرد بشر کی یہی ذہنیت عسکریت پسندی پر دال ہے اور یہی امنِ عالم کے لیے خطرہ کا موجب ہوتی ہے۔

جہاں تک نظریہ کا تعلق ہے یہ سہ گونہ اعتراض درست معلوم ہوتے ہیں۔ ایسی جنگوں کی بہت سی مثالیں موجود ہیں جو محض ملیت ناجریت یا عسکریت کے لئے لڑی گئی تھیں۔ اس قسم کی جنگوں کی بدولت کچھ عرصہ کے لیے امن عالم خطرہ میں پڑجاتا ہے اور جان و مال کا بھی کافی نقصان ہوتا ہے لیکن اس وقت دیکھنا یہ چاہیے کہ دنیا کے ممالک اور ملتوں کے نئے رحجانات کیا اور کس طرف ہیں۔ اگرچہ دنیا کے مختلف ممالک انہی وجوہات کی بنا پر آپس میں لڑتے رہے اور مجموعی طور پر دنیا کو نقصان بھی پہنچتا رہا لیکن اس تمام نقصان کی تلافی ایک طرح ہوگئی اور وہ اس طرح کہ ان جنگوں سے جو تلخ تجربے ہوئے اُن کی بنا پر مختلف ممالک کے مابین بین الاقوامی تعلقات قائم کرنے کی تحریک ہوئی جس سے تجارت کو فروغ ہوا اور اس طرح دنیا کے مختلف حصّوں کی آپس میں راہ و رسم بڑھ گئی۔ اور وہ ظلمت جو پہلے دنیا پر چھائی ہوئی تھی دور ہوگئی۔ مختلف ملتوں کے افراد کو بندرگاہوں اور دیگر تجارتی مراکز پر مل کر تبادلۂ خیالات کرنے کا موقعہ ملا۔ ملکی تعصبات دور ہوئے اور اس میل جول سے دنیا بھر میں یکجہتی اور یگانگت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ متمدن ملکوں نے پس ماندہ ممالک میں اپنی حکومتیں قائم کیں اور حکمران اور محکوم اقوام کے باہمی اختلاط سے موخرالذکر کو بھی ترقی کا خیال پیدا ہوا اور اس طرح ملت پرستی کا سبق سیکھ کر شاہراہِ ترقی پر گامزن ہونے کی خواہش اُن کے مردہ دلوں کو بھی گرما گئی۔ محکوم ممالک نے جو روبہ انحطاط تھے اور جن کے باشندوں کی ذہنیت اور سیرت زمانۂ ماقبل کی ملوکیت کے استبدادی اثرات کی وجہ سے مسخ ہوچکی تھی جب غیر ممالک کے لوگوں کو پرعظمت اور شاندار زندگی بسر کرتے دیکھا تو ان میں ایک نئی قوت کار عود کر آئی اور وہ بھی سرگرمِ عمل ہو کر معراجِ ترقی کی طرف بڑھنے لگے۔ احساسِ ملی کی بنا پر پہلے ملت خود متمتع اندوز ہوتی ہے اور پھر اُس کی تقلید سے اور اقوام بھی استفادہ کرنے لگتی ہیں۔ اس لائحۂ عمل کی بدولت جس پر کہ اس وقت تمام دنیا کاربند ہے ایک دن تمام ممالک مساوی طور پر محکم اور ترقی یافتہ

تیسر مذہب وملت امن وچین سے زندگی بسر کرنا نصیب ہو۔ لیکن اس نصب العین کے خلاف ایک اعتراض کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر اس قسم کا کوئی نصب العین ممکن الوجود بھی ہو تو عملی صورت میں وہ ایک ایسا بدمزہ اور پھیکا سا تسیجہ ہوگا کہ اس سے بہت جلد انسانی طبائع تنگ آ کر متنفر ہو جائیں گی اور پھر انتشار انگیز حالات از سر نو رونما ہو کر دنیا کے شیرازۂ امن کو درہم برہم کر دیں گے ان منصدع حالات سے ممکن ہے کہ امن عالم کی بنیادیں ہل جائیں اور تہذیب وتمدن خاک میں مل جائے لیکن ملیت سے جو یکسانیت دنیا کو حاصل ہوگی وہ مختلف عناصر اور مختلف جزئیات پر مشتمل ہوگی۔ ہر ملک کی ملت جدا ہوگی۔ اس کا نشو ونما جداگانہ طریقوں سے عمل میں آیا ہوگا اور اجتماعی طور پر اس کے افراد کی سیرت وشخصیت بھی ایک خاص قسم کی اور دوسروں سے مختلف ہوگی۔ یہ تنوع بذاتِ خود ایک دلچسپی کا حامل ہوگا اور اُن تمام اختلافات کے ہجوم سے بعض اہم امور کے بارہ میں اگرچہ اس غرض سے تلازم عمل میں آئے گا تاکہ مختلف ملتیں ایک دوسری سے رواداری کا برتاؤ کر سکیں لیکن کئی ایک ایسی جزئیات باقی رہ جائیں گی کہ ان سے اقوام کے باہمی اختلافات قائم رہیں گے اور یہ اختلافات اُن کو ایک سانچے میں ڈھل کر ایک ہو جانے سے روکیں گے۔ لہذا ان میں باہمی طور پہ اگرچہ ربط وضبط پیدا ہو جائے گا لیکن ان جزوی اختلافات کے باعث وہ ایک دوسرے سے اکتانے نہیں پائیں گی۔

ہر ملت اپنی جداگانہ خصوصیتوں کے باعث تہذیب میں ایک نیا اضافہ کرتی ہے۔ بعض قوموں کا ادبیات کی طرف زیادہ رجحان ہوتا ہے۔ بعض کا فنونِ لطیفہ کی طرف اسی طرح بعض قوموں میں صنعت وحرفت کے بارہ میں، ایک خاص ملکہ موجود ہوتا ہے۔ لہذا اگر دنیا میں مختلف ملتیں ہوں گی تو وہ اپنے اپنے ذاتی کمالات کے باعث تہذیبِ عالم کو چار چاند لگا دیں گی جس سے بین الملل تعلقات کا نصب العین پھیکا اور بدمزہ نہیں ہونے پائے گا۔

ملت کا حق آزادی

چونکہ دنیا کی ہر قوم مہذب نہیں اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حق آزادی یعنی اپنے قدرتی اور فطری رجحانات کے مطابق ترقی کرنے کا حق کن اقوام کو دیا جا سکتا ہے اور اس حق کو حاصل کرنے کے لیے اُن کی قابلیت کا معیار کیا ہونا چاہیے؟ اس سوال کا نہ تو کوئی جواب ہے اور نہ ہی کوئی ایسا معیار ہے کہ جس کے مطابق کسی قوم کی تمدنی حالت کو پرکھ کر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ وہ آزادی کی مستحق ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب اقوام اس قابل ہو جاتی ہیں کہ وہ اپنے اس فطری حق کو حاصل کر سکیں تو اُن کو آزاد ہونے سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی ہے۔ وہ آزاد ہو کر رہتی ہیں اور ایک آزاد حکومت قائم کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتی ہیں۔ نیز یہ سوال اس وقت پیدا ہونا چاہیے جب کہ بین الملی تعلقات کی بنا پر دنیا میں کوئی ایسا مشترکہ ادارہ قائم ہو چکا ہو جو ایسے سوالات کا جواب دینے اور دیگر بین الملل مسائل کے حل کا اہل ہو۔ اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ایسی اقوام کے جذبۂ ملّی کو کچلنا جن میں یہ جذبہ یعنی قومی حکومت کے ماتحت ترقی کرنے کا خیال پیدا ہو گیا ہو بذاتِ خود ایک ناجائز اور قابلِ نفرین فعل ہے۔ لیکن اگر ان اقوام کو جو غیر مہذب اور پس ماندہ ہیں بے آئینی کا شکار ہونے دیا جائے گا تو ایک دن وہ دنیا کے لیے زحمت بن جائیں گی اور اُن کی وجہ سے مہذب ممالک پر بھی آفت آنے کا اندیشہ ہو گا۔ اس لیے یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ مہذب اقوام کو ایسی پس ماندہ اقوام کی تنظیم کا اور ان میں امن و امان قائم رکھنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ اس نظریہ کی تائید میں مزید یہی کہنا کافی ہے کہ پس ماندہ اور غیر مہذب اقوام ترقی یافتہ مہذب اقوام کے زیر سایہ تربیت پاتی ہیں اور اس تربیت کی بدولت ان میں بھی ایک نئی ذہنیت اور ایک نیا نقطۂ خیال پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے بالآخر وہ بھی آزاد ہو کر دیگر آزاد اقوامِ عالم کے دوش بدوش کھڑی ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے ایک اور حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے جو اکثریت کے

خلاف بطور دلیل پیش کی جایا کرتی ہے ۔ یہ حقیقت ہے کہ حاکم اقوام محکوم قوم کو اسوقت بھی آزاد کرنے میں تامل کرتی ہیں جب کہ وہ تہذیب و تمدن کے تمام مرحلے طے کر کے اپنا آپ انتظام کرنے کے قابل ہو چکی ہوتی ہیں ۔ حاکم اقوام کے تامل اور محکوم اقوام کے اصرار کے باعث بعض اوقات بد امنی پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس بدامنی کی بنا پر بعض مفکرین نے ملیت کو ایک تخریبی حربہ قرار دیا ہے اس نکتہ چینی کا جواب یہ ہے کہ بدامنی پیدا کرنے کی ذمہ واری اتنی محکوم قوم پر عائد نہیں ہوتی جتنی کہ حکمران قوم پر عائد ہوتی ہے ۔ جونہی کہ کوئی قوم مہذب ہو کر اپنے نیک و بد میں تمیز کرنے کے قابل ہو جاتی ہے اس کو آزاد ہونے کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور حکمران قوم کو اس پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں رہتا ۔ اگر حاکم قوم اسے آزادی دینے سے انکار کرتی ہے تو تمام بدامنی کے پیدا کرنے کی ذمہ دار بنتی ہے ۔ ملیت وطن کو غیر ملکی فاتحوں کے ظلم و استبداد اور شخصی حکومتوں کے مہلک اثرات سے نجات دلاتی ہے ۔ ملیت ان تمام رکاوٹوں اور وقتوں کو جو کسی قوم کی ترقی کی راہ میں حائل ہوتی ہیں دور کرتی ہے ۔ ہر تعمیر نو کے لیے کچھ نہ کچھ تخریب ضروری ہوتی ہے لہٰذا اگر ملیت کے نیک نصب العین کے حصول کے لیے قدرے بدامنی پیدا ہونا لازمی بھی ہو تو یہ شر ملیت سے مترتب ہونے والے مفید اور خیر انگیز نتائج کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا ۔

ملیت اور اشتراکیت

ملیت اور اشتراکیت دونوں کا نصب العین ایک ہی ہے ۔ ملیت بین الملی تعلقات کی استواری سے دنیا میں امن قائم کرنے کی دعویدار ہے ۔ اشتراکیت سرمایہ داری کی لعنت کو دور کر کے دنیا کو ایک سانچے میں ڈھالنا چاہتی ہے تاکہ اس یکسانیت سے دنیا کو امن نصیب ہو ۔

اشتراکیت کے مقابلہ میں مجلس بین الاقوام ملیت کی نمائندہ ہے۔ اس وقت دنیا میں اشتراکیت اور ملیت کے مابین کش مکش جاری ہے اور ان میں سے ہر ایک کی یہ کوشش ہے کہ تمام دنیا پر اس کا تسلط قائم ہو جائے۔ اشتراکیت کے حق میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ فرد کی سرمایہ داری سے تمام ممالک کے متوسط الحال لوگ عموماً اور غریب خصوصاً سخت ہراساں ہیں اور اس لیے قدرتاً اشتراکیت کی طرف مائل ہیں۔ لیکن اس کے خلاف دو ایسی باتیں ہیں جو اشتراکیت کے نصب العین کو ناممکن الحصول بنا دیتی ہیں۔ اول یہ کہ تمام دنیا کے تعصبات مذہبی و احساسات ملی اشتراکیت کے بنیادی اصول کے خلاف ہیں۔ دوسرے یہ کہ جو یکسانیت اور مساوات اشتراکیت دنیا کو دینا چاہتی ہے وہ ظاہراً بدمزہ اور پھیکی سی نظر آتی ہے۔ اس سے انسان جلد متنفر ہو جائیں گے۔ اس سے زیادہ بدمزگی اور کیا ہو سکتی ہے کہ تمام لوگ یکساں حالات میں یکساں طور پر عمل پیرا ہوں اُن کی تربیت ایک طرح ہو اور ایک ہی ماحول میں اور اس طرح اُن کے دلوں میں جو خیالات پیدا ہوں وہ بھی ایک ہی سے ہوں۔ ان کی کتابیں بھی ایک ہی سی ہوں۔ ان کا لباس بھی ایک ہی قسم کا ہو۔ حتیٰ کہ وہ زندگی بھی ایک ہی طرح بسر کریں۔ گناہ کریں تو بھی ایک طرح اور اگر نیک کام کریں تو بھی ایک طرح۔ اشتراکیت کے معیار کے مطابق زندگی بسر کرنا انسان کے لیے دشوار ہو جائے گا۔ طبع انسانی جدت پسند واقع ہوئی ہے اور جدت پسندی ہی زندگی کی دلچسپی کا باعث ہے۔ اگر سیرت انسانی میں سے جذبات کا عنصر خارج کر دیا گیا تو آئندہ ترقی کا ایک بڑا محرک ضائع ہو جائے گا اور خود زندگی بھی بے کیف اور بدمزہ ہو جائے گی۔

مجلس اقوام کی کامیابی بھی قرین قیاس نہیں کیونکہ دنیا کو اس وقت تک امن نصیب نہیں ہو سکتا جب تک کہ مغرب کی جابرانہ ذہنیت دور نہیں ہوتی اور وہاں کی اقوام ملیت کے درست اور صحیح اصولوں پر عمل کرتی ہوئی مشرقی ممالک کے مفاد کو اپنی اغراض کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دینے کا وتیرہ

ترک نہیں کرتیں یا جب تک مشرق میں جذبہ ملیت اس قدر تقویت نہیں پکڑ جاتا کہ وہ خود اپنے مفاد کی حفاظت کر سکے۔ مجلس بین الاقوام در اصل صرف مغرب کی نمائندہ ہے اور اسے ان اقوام سے جن میں احساسِ ملی تو موجود ہے لیکن جو مغرب کے پنجۂ استبداد میں گرفتار ہیں حقیقی معنوں میں کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ نیز مجلس مذکور کو اتنی طاقت حاصل نہیں کہ وہ مغرب کی استبدادی کارروائیوں کی روک تھام کرنے کے قابل ہو سکے۔ اس کے مقابلہ میں اشتراکیت کا دعوے ہمہ گیر مساوات قائم کرنے کا ہے۔ اِس لیے عوام کا عام میلان طبع اس کی طرف زیادہ ہے۔ لیکن اس کے انتہا پسندانہ بنیادی اصولوں نے اسے ناقابلِ عمل بنا رکھا ہے۔ حصولِ کامیابی کے لیے اشتراکیت کو نیز مجلس اقوام کو بھی اپنی اصلاح کی ضرورت ہے۔ جب تک وہ اپنے بنیادی اصولوں کے نقائص کو دور نہیں کریں گی اُن کی دعاوی بے حقیقت اور اُن کے نصب العین ناممکن الحصول بنے رہیں گے۔

باب دوم

ہندوستانیوں کی نسل

ہندوستانیوں کی نسل

ملت کے استحکام کے لیے نسل کی یکسانیت اگرچہ ضروری ہے لیکن تمام ملکوں کے لوگ ماسوائے چند ایک مستثنیات کے عام طور پر مخلوط النسل ہیں۔ لہذا جو بھی ملتیں اس وقت قائم ہیں اُن کی بنیاد صرف اس یقین پر ہے کہ ان میں سے ہر ایک بلحاظ نسل یکساں ہے خاندانوں میں حسبی نسبی یکسانیت کا یقین سوسائٹی کے زمانہ طفولیت کی یادگار ہے جبکہ ایک ملک کی آبادی مختلف قبیلوں پر مشتمل تھی اور ہر ایک قبیلہ کے افراد کا آپس میں رشتہ داری کا تعلق قائم تھا۔ اور وہ جدوجہد زندگی اور اپنی حفاظت کی خاطر ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب اور مانوس تھے باہمی رشتہ داری کی شرط اسقدر ضروری تھی کہ کسی غیر کو قبیلہ میں شامل کرنے کے لیے پہلے اسے متبنٰی بنانا ضروری ہوتا تھا یعنی کسی غیر شخص کو بذریعہ اعلان یا کسی اور طریق وتدبیر اپنے میں شامل کرنے کی بجائے رشتہ داری کا ایک مفروضہ وضع کیا گیا تھا جس سے وہ قبیلہ کا رکن اور رشتہ دار متصور ہونے لگتا تھا۔ متبنٰی بنانے کی رسم سے معلوم ہوتا ہے کہ رشتہ کی شرط کو کس قدر اہمیت حاصل تھی۔ نسلی یکسانیت کو تقویت دینے والی ایک اور بات یہ تھی کہ بزرگوں کی روحوں کی پرستش کا رواج عام تھا جس سے ایک ہی قبیلہ کے افراد میں ایک ایسا تعلق قائم ہو جاتا تھا کہ وہ تمام دینی و دنیوی امور میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار بنے رہتے تھے غالباً ملوکیت کا آغاز بھی قبیلہ سے ہوا۔ چونکہ قبیلہ کا سردار دینی و دنیوی رہنما ہوتا تھا اس لیے اُس کو اس قدر طاقت حاصل ہوتی تھی کہ وہ جہاں تک داخلی معاملات کا تعلق ہے سیاہ و سفید کا مالک ہوتا۔ ایسے ہر سردار نے اپنی طاقت کو برقرار رکھنے

کے لیے ہر ممکن ذرائع سے کام لیا اور اس طرح آہستہ آہستہ جوں جوں اُس کی طاقت بڑھتی گئی اس کا دائرہ اثر و حکومت بھی وسیع ہوتا گیا اور ساتھ ساتھ بوجہ پیدائش و افزائش نسل قبیلہ کے افراد کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ بالآخر اسی قبیلہ نے ایک جماعت کی صورت اختیار کر لی اور بہت سے علاقے کو اپنے قبضے میں لاکر اپنے سردار کو اس کا حاکم بنا دیا۔ اس حاکم نے اپنی طاقت کو برقرار رکھا اور پھر اس کے بعد اس کے ورثا نے مزید طاقت حاصل کر کے ملوکیت کی بنا ڈالی۔ ایک دفعہ جو بادشاہ بن گیا اُس نے اس سلسلہ کو قائم رکھنے کے لیے ہر ممکن تدبیر پہ عمل کیا اور اس طرح ہوتے ہوتے ملوکیت دنیا بھر میں رائج ہو گئی اور سب اسے ایک اہم اور مفید طریقۂ حکومت تسلیم کرنے لگے۔

بعض قبیلوں میں اپنے مورثِ اعلیٰ کی یاد قائم رہتی ہے لیکن کئی قبیلے اپنے مورثِ اعلیٰ کو بھول جاتے ہیں۔ ایسے قبیلے جب دیگر قبیلوں کو متحد اور مضبوط دیکھتے ہیں تو وہ اپنے افراد میں اتحاد اور اپنے استحکام کی خاطر اپنا ایک فرضی مورثِ اعلیٰ تصور کر لیتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے۔ کہ لوگوں نے کسی دیوتا کو یا اجرامِ فلکی میں سے کسی ایک کو اپنا مورثِ اعلیٰ تصور کر کے اُس کے نام پر اپنے قبیلہ کا نام رکھ لیا۔ جاپانی اپنے آپ کو چاند کی اولاد تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی سورج بنسی اور چندر بنسی خاندانوں کے راجپوت موجود ہیں۔ یونانی اپنے آپ کو زیس کی اولاد خیال کرتے تھے۔ اسی طرح قوم منیار کا مورثِ اعلیٰ کوئی شخص منیار نامی تھا اور ہنووزنیز کا ہنود ارے تقریباً ۱۵۰۰ سو سال قبل مسیح آریہ قوم شمال مغربی دروں کے راستہ ہندوستان میں داخل ہوئی اور پھر آہستہ آہستہ تمام ملک میں پھیل گئی۔ کچھ عرصہ کے گزرنے کے بعد اس کا ملک پر مکمل تسلط قائم ہو گیا اور جنگ آریائیوں کے بعد جب یہاں کے اصل باشندوں سے اس کا میل جول بڑھا تو اس امر کی ضرورت پیش آئی کہ تمام باشندوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کیا جائے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اسی غرض کے پیش نظر یہ عقیدہ بنایا گیا کہ تمام اہلِ ہند برھما کی اولاد ہیں۔ براہمن برھما کے سر سے پیدا ہوئے۔ کھشتری اُس

کے سینہ اور بازوؤں سے ۔ ویش پیٹ اور رانوں سے اور شودر پاؤں سے ۔ برھما کے مختلف اعضا سے مختلف ذاتوں کی پیدائش اس امر کی دلیل ہے کہ چونکہ برہمن اپنا وقار قائم رکھنا چاہتے تھے اس لیے وہ تو سر سے پیدا ہوئے ۔ نیز اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ براہمن اپنے کو قوم کا دماغ تصور کرتے تھے ۔ کھشتری طاقتور تھے اور چونکہ اُن سے داخلی وخارجی جنگوں میں کام لینا مقصود تھا اس لیے اُن سے رواداری کا سلوک کرنا بے حد ضروری تھا ۔ چنانچہ انہیں برہمنوں کے بعد درجہ دیا گیا ۔ اور وہ برھما کے سینے اور بازوؤں سے پیدا ہوئے یعنی کہ وہ قوم کے سینے اور بازوؤں سے متشابہ قرار دیے گئے ۔ ان کے بعد عوام تھے وہ برھما کے پیٹ اور رانوں سے پیدا ہوتے اور ویش کہلوائے گویا پیٹ کی نسبت سے قوم کی اقتصادی ضروریات سے متعلقہ فرائض ان کے ذمے عائد کیے گئے ۔ اصل باشندے کسی گنتی وشمار میں نہ تھے لیکن امن وامان قائم رکھنے کے لیے نیز اپنی خدمت کروانے کی ضرورت کی بنا پر اُن کی بھی اشک شوئی کی گئی یعنی اُن سے کہا گیا کہ تم بھی ہم میں سے ہو اور ہماری طرح برہما کی اولاد ہو لیکن تم اُس کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہو اس لیے جسم اور پاؤں کے باہمی تعلق کی بنا پر جاتی کا تمام بوجھ تم پہ پڑے گا ۔ تمہارا کام قوم کے باقی تینوں اعلیٰ اعضاء کی خدمت گذاری ہوگا اور سوسائٹی میں تمہاری پوزیشن سب سے ادنیٰ ہوگی ۔ یعنی کہ تم شودر ہوگے لیکن اگر نسلوں کی خصوصیات کے پیش نظر ہندوستان کی آبادی کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ باشندوں کا یہ دعوےٰ کہ وہ خالص آرین نسل سے ہیں کچھ حقیقت نہیں رکھتا ۔ وہ مختلف قوموں کی اولاد ہیں ۔ سنہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ مرتبہ سر ہربٹ رسلے میں نسلی لحاظ سے ہندوستان کے باشندوں کو سات مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ (اوّل) مخلوط ترکی ایرانی باشندے جو شمال مغربی سرحد پہ آباد ہیں (دوم) آرین جو پنجاب راجپوتانہ اور کشمیر میں آباد ہیں (سوم) سیتھین اور دراوڑ نسل کے باشندے جو مغربی ہندوستان میں پائے جاتے ہیں (چہارم) آریہ اور دراوڑ

اقوام جن کی اولاد اب صوبجات متحدہ اور بہار میں موجود ہے (پنجم) منگول اور دراوڑ اقوام کے باشندے جو بنگال اور اڑیسہ میں آباد ہیں (ششم) خالص منگول نسل کے باشندے جو کوہستان ہمالیہ میں آباد ہیں۔ (ہفتم) خالص دراوڑ قوم کے باشندے جو جنوبی ہندوستان صوبجات متوسط اور چھوٹا ناگپور میں پائے جاتے ہیں باشندوں کے اس دعوے کے پیش نظر کہ وہ آرین ہیں ممکن ہے کہ ہندوستان کی آبادی کی یہ تقسیم غلط اور قابل اعتراض ہو لیکن یہ امر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ پنجابیوں۔ بنگالیوں۔ گجراتیوں۔ مدراسیوں اور نیپالیوں وغیرہ میں شکلی و جسمانی اختلافات ضرور موجود ہیں۔ خدوخال کے اختلافات کے علاوہ باشندے بلحاظ رنگت بھی مختلف ہیں۔ شمال مغربی ہندوستان میں سفید رنگ اور اچھے خدوخال والے لوگ آباد ہیں۔ بنگال میں اعلیٰ خاندانوں کے برہمن گورے چٹے ہیں۔ عام لوگوں کی رنگت سیاہ ہے۔ جنوب میں کالی رنگت والے لوگ آباد ہیں۔

سنہ ۱۹۱۱ء کی رپورٹ مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی کل آبادی تقریباً ۳۲ کروڑ ہے اور اس میں زیادہ سے زیادہ ۲ کروڑ آبادی خالص آریہ لوگوں کی ہے۔ شمالی ہند کی تقریباً تمام آبادی آریہ سیتھین۔ تورانی۔ ایرانی اور کچھ حد تک دراوڑ اقوام کی اولاد پر مشتمل ہے۔ جنوبی ہند کی آبادی ۹۵ فی صدی دراوڑ ہے۔ ان اعداد و شمار کو پڑھ کر حیرانی ہوتی ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ قوموں کا ایسا اختلاط کیونکر عمل میں آ سکتا ہے۔ لیکن اس نظریہ کے پیش نظر کہ آبادی میں جیومیٹریکل پروگریشن کے مطابق اضافہ ہوتا ہے یہ امر کسی حد تک قرین قیاس ہو جاتا ہے۔ آخر سیتھین اور ہن اقوام کی بھی تو شمال مغربی ہندوستان پر حکومت رہی ہے اور یہ شاید زمانہ قبل مسیح کا واقعہ ہے۔ ایسے اختلاط کے ممکن ہونے کے لیے پندرہ بیس صدیوں کا عرصہ کچھ کم عرصہ نہیں۔

ان اعداد و شمار کے پیش نظر اگرچہ نسلی لحاظ سے ہندوستان کے باشندے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور نسل کی بنا پر ملت کا قیام ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان سب کو

یہ یقین ہے کہ وہ قومی لحاظ سے کیا ہندو اور کیا مسلمان سب ایک ہیں۔ جہاں تک نسل کی یکسانیت کی ضرورت ہے قیامِ ملت کے لیے ان کا یہ یقین کافی ہے اور اس یقین کی بنا پر ملّی مقاصد کے پیشِ نظر ان کی شیرازہ بندی غیر ممکن نہیں ہے۔ ملتِ ہندیہ کو کسی اور بنا پر انتشار کا خطرہ ہو تو ہو لیکن نسلی اختلافات کی بنا پر اسے اس قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ مسلم آبادی زیادہ تر ہندی اقوام پر مشتمل ہے۔ اور اس میں چند غیر ہندی جماعتیں جو شامل بھی ہیں مثلاً سید پٹھان مغل وغیرہ وہ ہندی مسلمانوں کے ساتھ اس طرح گھل مل گئی ہیں کہ ان میں اور ہندی نژاد مسلمانوں میں امتیاز کرنا دشوار ہے۔ مسلم راجپوت مسلم جاٹ مسلم گوجر سید پٹھان اور مغل سب آپس میں ملتے جلتے ہیں اور اگر وہ اپنی اپنی ذاتوں کو ظاہر نہ کریں تو اُن کی ایک دوسرے سے تمیز نہیں ہو سکتی۔ مجموعی طور پر مسلموں کو یقین ہے کہ وہ ہندی ہیں اور اُن کے آباؤ اجداد بھی ہندی تھے اور کہ بلحاظِ نسل اُن میں اور ہندوؤں میں کچھ فرق نہیں اہلِ ہنود میں تو یہ یقین بدرجۂ اتم موجود ہے کہ ہندو آبادی اور مسلم آبادی بلحاظِ نسل ایک ہے۔ لہٰذا نسلی اعتبار سے تمام اہلِ ہند کا ایک ہی ملت کی صورت اختیار کر لینا دشوار نہیں۔ قیامِ ملت کی راہ میں اگر کوئی رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے تو یہ مذہب اور تہذیب و تمدن کے اختلافات کی بنا پر ہو سکتی ہے۔

"یقین افراد کا سرمایہ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے"

باب سُوم

ہندوستانیوں کی زبانیں

ہندوستانیوں کی زبانیں

نسل اور زبان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جن لوگوں کی نسل ایک ہوگی اکثر اُن کی زبان بھی ایک ہوگی اور زبان کی یکسانیت عموماً تہذیب و تمدن کی یکسانیت پر منتج ہوتی ہے۔ جس طرح ہندوستان میں بلحاظِ نسل ایک ہی قوم آباد نہیں بلکہ بہت سی قومیں آباد ہیں اسی طرح زبان کے لحاظ سے بھی ہندوستان کے باشندے مختلف گروہوں میں منقسم ہیں۔ اور یہی امر واقعہ بالواسطہ طور پر اُن کے اختلافِ نسل کی بھی دلیل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوہِ یورال ایشیا اور یورپ کے مابین حائل ہوکر اُن کو دو مختلف برِاعظموں میں تقسیم کر سکتا ہے تو کوہِ ہمالہ بھی جو اس قدر بلند طویل اور عریض ہے ہندوستان کو ایشیا سے الگ کر کے اسے بذاتہٖ ایک علیحدہ برِاعظم کی حیثیت بخش سکتا ہے اگر اس نظریہ کو درست تسلیم کر لیا جائے تو ہندوستان کو برِاعظم اور اُس کے مختلف صوبوں یا حصّوں کو اس کے ملک تسلیم کرنا پڑے گا۔ نیز یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان ملکوں میں مختلف قومیں آباد ہیں جو نسل زبان اور تہذیب کے لحاظ سے ایک دوسری سے مختلف ہیں۔

زبان کے اختلافات کے پیشِ نظر ہندوستان کو اگر مینارِ بابل سے تشبیہہ دی جائے تو غلط نہیں۔ یہاں نسل کے لحاظ سے جتنے اختلافات موجود ہیں اتنے ہی بلکہ اُن سے بھی زیادہ اختلافات زبان کے لحاظ سے پائے جاتے ہیں۔ زبان کے لحاظ سے ہندوستان کی آبادی کی تقسیم سے متعلقہ اعداد و شمار حسب ذیل ہیں:-

تیئیس[۲۳] کروڑ تیئیس[۳۳] لاکھ آبادی یعنی ۳ء۷۴ فی صدی آبادی آریوں کی زبانیں استعمال کرتی ہے۔ چھ[۶] کروڑ تیئیس[۳۳] لاکھ آبادی یعنی ۲۰ فی صدی آبادی دراوڑی زبان بولتی ہے۔ ایک کروڑ تیئیس[۳] لاکھ آبادی یعنی ۴ فی صدی باشندے تبتی یا چینی زبانیں بولتے ہیں۔ باقی ایشیائی زبانیں تقریباً نصف کروڑ آبادی میں مروج ہیں۔ زبان کے لحاظ سے آبادی کے ان گروہوں کی مزید تقسیم بھی ممکن ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک گروہ میں کئی اور ایسی زبانیں رائج ہیں جو آپس میں بہت ملتی جلتی ہیں اور اصل زبانوں کی شاخیں ہیں۔ ان زبانوں میں سے ہر ایک کے بولنے والوں کی تعداد دس لاکھ کے قریب ہے۔ سب سے عجیب بات یہ ہے کہ بنگال کے سوا ہر ایک صوبہ میں کئی زبانیں رائج ہیں۔ بنگال کی ۹۰ فی صدی آبادی بنگالی بولتی ہے۔ آسام میں ۵۰ فی صدی باشندے بنگالی بولتے ہیں، ۲۰ فی صدی آسامی اور ان دو زبانوں کے علاوہ باقی باشندوں میں سو کے قریب اور زبانیں مستعمل ہیں۔ بہار اور اڑیسہ میں ۶۰ فی صدی باشندوں کی زبانیں ہندی اور پہاڑی ہیں۔ ۲۰ فی صدی کی زبان اُڑیا ہے اور باقی ۱۵ فی صدی کی زبانیں مندری اور سنتھالی ہیں۔ صوبہ بمبئی میں سب سے زیادہ مروج زبان مرہٹی ہے اور اس کے بولنے والوں کی تعداد صرف ۴۰ فی صدی ہے۔ ۲۰ فی صدی باشندے گجراتی بولتے ہیں اور ۱۳ فی صدی سندھی۔ باقی ۱۹ فی صدی آبادی دیگر زبانیں مثلاً انگریزی، اُردو، پارسی وغیرہ استعمال کرتی ہے۔ برما کی ⅔ آبادی کی زبان برمی ہے اور باقی آبادی میں کئی مختلف زبانیں رائج ہیں + صوبجات متوسط اور برار میں ۵۵ فی صدی باشندوں کی زبان ہندی یا پراکرت ہے۔ ۱۳ فی صدی کی مرہٹی اور باقی باشندے ان کے علاوہ اور زبانوں کو استعمال کرتے ہیں۔ صوبہ مدراس کا بھی یہی حال ہے۔ ۴۱ فی صدی کی زبان تامل ہے۔ ۳۱ فی صدی کی تلگو اور باقی باشندے ملیالم، اُڑیا، کناری اور ہندی ایسی زبانیں بولتے ہیں۔ صوبہ پنجاب اور صوبجات متحدہ میں ۷۵ فی صدی تو مغربی ہندی (پنجابی وغیرہ) بولتے

ہیں اور ۳۲ فی صدی مشرقی ہندی (ہندی اور اُردو وغیرہ) - ۲۰ فی صدی بہاری اور ۳ فی صدی مرکزی پہاڑی +

ہندوستان کی زبانوں میں سے کئی زبانیں ایسی ہیں جو لکھنے میں نہیں آتیں صرف بولی جاتی ہیں - ایسی زبانیں اکثر بہت جلد مٹ جاتی ہیں - جو زبانیں لکھی بھی جائیں اور ادبی حیثیت سے بھی انہوں نے کچھ ترقی کی ہو ان کا غیر مستعمل ہونا تو درکنار وہ اکثر ایسی زبانوں کی جگہ لے لیا کرتی ہیں جن کا کوئی رسم الخط نہیں ہوتا - مغربی نیپال میں کسی وقت کچھ ہندو پناہ گزین ہوئے - وہاں کی مروجہ زبان "خاص" تھی لیکن آہستہ آہستہ ان پناہ گزین ہندوؤں کی زبان ایسی ہر دلعزیز ہوئی کہ یہ وہاں کے باشندوں کی اصل زبان کی بجائے استعمال ہونے لگی اور اب یہ زبان نیپال میں مروجہ دیگر پہاڑی زبانوں کی جگہ بھی لے رہی ہے - شمالی بنگال کے باشندے "کوچی" اپنی زبان کو کافی حد تک بھول چکے ہیں اور اب ملی جلی بنگالی بولتے ہیں - اسی طرح قوم چکما نے اراکانی زبان کو چھوڑ کر بنگالی کو اپنی زبان بنالیا ہے لیکن وہ بنگالی لکھتے وقت برمی حروفِ تہجی استعمال کرتے ہیں - گرنتھ صاحب کی پنجابی اور موجودہ زمانہ کی پنجابی میں زمین و آسمان کا فرق ہے - زبانیں چونکہ بدلتی رہتی ہیں اس لیے ہندوستان کی مشترکہ زبان کے متعلق کوئی آخری فیصلہ کرنا آئندہ نصف یا ربع صدی میں عوام کے رجحانات پر منحصر ہوگا -

مرقومہ صدر اعداد و شمار ۱۹۱۱ء کی رپورٹ مردم شماری میں درج ہیں اور ان کے مطابق ہندوستان کے باشندے بلحاظِ زبان بھی متفق و متحد نہیں ہو سکتے - چونکہ جذبہ ملیت کی تخلیق کے لیے ضروری ہے کہ ملک میں ایک مشترکہ زبان جاری ہو اس لیے اس وقت ایک مشترکہ زبان کا مسئلہ ملک بھر کے زیر غور ہے - تین زبانوں یعنی اُردو، ہندی اور انگریزی کے متعلق یہ دعوےٰ کیا جاتا ہے کہ وہ ہندوستان بھر کی مشترکہ زبانیں ہونے کی اہلیت رکھتی ہیں - اُردو کے حامی یہ دعوےٰ کرتے

ہیں کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جسے ہندوستان میں ہر جگہ سمجھا جاتا ہے بر خلاف اس کے حامیانِ ہندی کا یہ دعوےٰ ہے کہ اُردو نہیں بلکہ ہندی ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے ایک اور طبقہ ایسا بھی ہے جو انگریزی کے متعلق یہی دعوےٰ پیش کرتا ہے۔ اب ہم ان مختلف دعاوی پر غور کرکے کسی نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

جہاں تک سلیس اردو یا سلیس ہندی کا تعلق ہے ہندوستان کے اور خاص کر شمالی ہندوستان کے اکثر باشندے انہیں سمجھ سکتے ہیں اور ان زبانوں میں کچھ زیادہ فرق بھی نہیں فرق صرف اس وقت نظر آتا ہے جب اُردو کے حامی اس میں عربی اور فارسی الفاظ کی بھرمار کرکے اسے مغلق اور مشکل بنا دیتے ہیں اور ہندی کے حامی اس میں سنسکرت کے الفاظ کو استعمال کرکے اسے غیر مانوس اور ناقابلِ فہم کر دیتے ہیں۔ جہاں تک لفظوں فقروں کی ساخت اور گرامر کا تعلق ہے یہ دونوں زبانیں اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ ان کو ایک ہی زبان کہہ دینا غلط نہ ہوگا۔ صرف اُن کے حروفِ تہجی اور رسم الخط میں فرق ہے۔ گویا کہ ہندی اور اُردو کا جھگڑا بہت بڑی حد تک رسم الخط کا جھگڑا ہے اور اگر اس بات کا فیصلہ ہو جائے تو یہ جھگڑا مٹ جاتا ہے اور اُردو یا ہندی تمام ملک کی یا کم از کم شمالی ہندوستان کی مشترکہ اور ملکی زبان تسلیم کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس وقت لوگوں میں ایک اور رجحان بھی پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ ہر صوبہ کے باشندے اپنے صوبہ کی زبان کو ترجیح دینا چاہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر صوبہ کی یہ خواہش ہے کہ جو زبان اس میں مروج ہے اس کو ترقی دی جائے اور جہاں تک صوبجاتی معاملات کا تعلق ہے وہی زبان عام تعلیمی اور سیاسی اغراض کے لیے استعمال ہو۔ اگر شمالی اور خاص کر شمال مغربی ہندوستان کا (جس میں شمال مغربی سرحدی صوبہ پنجاب صوبجات متحدہ وغیرہ شامل ہیں) یہ دعوےٰ تسلیم کر لیا جائے کہ شمالی ہندوستان کی زبان اُردو یا ہندی ہے تو بنگال کب اس کو گوارا کرے گا کہ وہ بنگالی کو جو وہاں اس قدر زیادہ ہر دلعزیز اور رائج ہے چھوڑ کر اس

کی بجائے اُردو یا ہندی کو رواج دے۔ اِس کے علاوہ سلیس اُردو یا ہندی کی ترقی ابھی تک اتنی نہیں ہوئی کہ ان میں سے کسی ایک کے ذریعہ مختلف علوم کی تعلیم دی جا سکے۔ تعلیمی اغراض کے لیئے ہندی یا اُردو کی ترقی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ یا تو اس میں عربی اور فارسی کے الفاظ ٹھونسے جائیں یا سنسکرت کے متروک الفاظ کو ڈھونڈ نکالا جائے اور پھر اُن کی لایعنی طور پر اس میں بھرمار کر دی جائے۔ اگر مسلمانوں کی قابلِ تعظیم زبانوں عربی اور فارسی اور ہندوؤں کی چہیتی زبان سنسکرت کے الفاظ کو تصفیہ کی خاطر اِس بنا پر جگہ نہ دی جائے کہ وہ فرقہ واری کی محرک ہیں تو پھر اُردو یا ہندی کی ترقی کے لیئے انگریزی زبان کا سہارا ڈھونڈنا پڑتا ہے اور جدید علوم چونکہ زبانِ انگریزی کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں اس لیئے انگریزی سے ہی اُردو یا ہندی میں تراجم کیے جائیں گے۔ لہذا انگریزی الفاظ کے مترادف عربی یا سنسکرت کے الفاظ ڈھونڈنے پر وقت اور محنت صرف کرنے کی بجائے کیوں نہ انگریزی الفاظ کو ہی استعمال کیا جائے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُردو یا ہندی کو ترقی دینے کے لیئے کافی وقت درکار ہے۔ تمام صوبوں میں بالخصوص بنگال۔ مدراس، بمبئی، سندھ صوبجات متوسط وغیرہ میں اس مشترکہ زبان کی ترویج کی اس قدر ضرورت ہوگی کہ یہ وہاں کے لوگوں کی مادری زبان بن جائے۔ معلوم نہیں کہ اس پر کتنا عرصہ لگے اور عین ممکن ہے کہ اس بارہ میں کوشش شروع کرنے کے کچھ عرصہ بعد یہ پتہ چلے کہ یہ مقصد ناممکن الحصول ہے یا اس سے اور کئی جھگڑے اٹھنے کا اندیشہ ہے مثلاً اگر بنگال میں اُردو کو رواج دینے کی کوشش شروع کی جائے تو اغلب ہے کہ اس بارہ میں کامیابی نہ ہو کیونکہ بنگال کی ۹۰ فی صدی بنگالی بولنے والی آبادی اپنی زبان کو چھوڑنے پر مجبور نہیں کی جا سکتی۔ پھر اگر اسے ایسا کرنے کے لیے مجبور بھی کیا جائے تو بنگالی کے مقابلہ میں چونکہ وہاں اُردو ابھی جاری ہوئی ہوگی اس لیئے اسے چنداں فروغ حاصل نہیں ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ اس سے پیشتر کہ بنگال میں اُردو کو مروج کرنے کی ٹھانی جائے بنگالی اس قدر زیادہ ترقی کر جائے کہ

یہ خیال ہی مضحکہ خیز نظر آنے لگے یہی حال مدراس میں مروجہ زبانوں کا ہے۔ وہ کافی ترقی کر چکی ہیں۔ اور ان کو چھوڑ نا یا ترک کرنا مدراسیوں کے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔ لہذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہندوستان کی کونسی مشترکہ زبان ہوگی۔

لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے مختلف صوبوں کو آزادی دینا بھی درست نہیں۔ کیونکہ ایسی آزادی بالآخر ہندوستان کے اتحاد و اتفاق کے منافی ہوگی اور جذبۂ ملیت پیدا کرنے کی بجائے صوبائی تنگ دلی پیدا کر دیگی جس سے ملک کی سیاسی متحدہ حیثیت قائم نہیں رہ سکے گی۔ زبان کے اختلافات اکثر سیاسی تفرقوں پر منتج ہوا کرتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ان تفرقات کی بنا پر ہر صوبہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ تیار کرنے کی ٹھان لے اور مضر مرکزیت تحریکات شروع ہو جائیں لہذا زبان کا مسئلہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے اور اس کے متعلق بغیر سوچے سمجھے جلد بازی سے کام لینا قرینِ دانش نہیں کسی مروجہ ہندوستانی زبان کو بتدریج ترقی دے کر اس میں تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان ہونے کی خصوصیات پیدا کرنے کا کام خود مرکزی حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے۔ صوبوں کو اس بارہ میں کلی اختیار دینا نقصان کا باعث ہوگا۔

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ملک بھر کے سکولوں میں اردو اور ہندی کو لازمی قرار دیا جائے اور تمام بچوں کو یہ دونوں زبانیں اور ان کے رسم الخط بھی سکھائے جائیں۔ کیونکہ اس طریقہ سے کچھ عرصہ کے بعد اردو ہندی ملک کی مشترکہ زبان بن جائے گی۔ یعنی ان کی تعلیم و تدریس کے جاری رہنے کے کچھ عرصہ بعد ایک ایسا وقت آئے گا کہ عام لوگوں کے پاس اردو اور ہندی الفاظ کا ذخیرہ اتنا کافی ہوگا کہ وہ بلا تامل ہر موضوع پر اظہارِ خیال کر سکیں گے اور چونکہ ان کو ہندی رسم الخط سے بھی واقفیت ہوگی اس لیے ان کے پڑھنے پڑھانے میں دقت نہیں ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ طبعی امیال ایسے ہو جائیں کہ ان دونوں میں سے ایک رسم الخط بالکل ترک کر دیا جائے۔ یہ تجویز معقول معلوم ہوتی ہے

لیکن صرف شمالی ہندوستان میں اس کی کامیابی کے امکان ہیں۔ باقی ہندوستان میں اس سے دقتیں پیدا ہو جائیں گی۔ اس کے علاوہ ہم اس قسم کی کسی تجویز پر یکدم عمل نہیں کر سکتے۔ یہ مشترکہ زبان بنانے کا ایک تعمیری پروگرام ہے جس کی کامیابی اور تکمیل کے لیے ہمیں کافی عرصہ انتظار کرنا پڑے گا۔ اور پھر اس کے بعد بھی یہ ہندوستان بھر کی نہیں بلکہ صرف شمالی ہندوستان کی مشترکہ زبان کہلا سکے گی۔

اس اعتراض نیز اس محنت اور وقت کے پیش نظر جو انگریزی کی ترویج پر صرف کیا جا چکا ہے بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انگریزی کو ملک بھر کی مشترکہ زبان قرار دیا جائے۔ میکالے کے زمانہ سے انگریزی ملک کی مشترکہ زبان چلی آتی ہے۔ تمام اعلیٰ تعلیم خواہ وہ ادبی ہو یا اصطلاحی انگریزی میں دی جاتی ہے اور پنجابیوں، بنگالیوں اور مدراسیوں کے مابین جن کی مقامی زبانیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور جو ایک دوسرے کی زبان کو سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں انگریزی زبان ہی اظہارِ خیال یا تبادلۂ خیالات کا ذریعہ بنتی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر اردو یا ہندی کے مقابلہ میں مختلف صوبوں کے لوگ سیاسی و اجتماعی اغراض کے لیے انگریزی ہی کا زیادہ تر استعمال کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے انگریزی کو باقی زبانوں پر ترجیح دینی پڑتی ہے۔ لیکن یہ بات جذبۂ ملی کے خلاف ہے اور جذبۂ ملی کی بنا پر جو دلیل پیش کی جائے اس کی اہمیت میں نہ تو شک و شبہ کی گنجائش ہے اور نہ ہی اسے فلسفیانہ معقولیت اور مناسبت کی کسوٹی پر پرکھنا درست ہے۔ کیونکہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ملیت ایک جذبہ ہے۔ ایسی حالت میں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ کوئی ایسی مشترکہ زبان تلاش کی جائے یا بنائی جائے جسے ہندوستان سے براہِ راست علاقہ ہو۔ اور چونکہ انگریزی کے بغیر فی الحال گذارہ نہیں ہو سکتا اس لیے اس وقت تک جب تک کہ مشترکہ زبان کے متعلق کوئی آخری فیصلہ نہیں ہوتا انگریزی قائمقام حیثیت میں مشترکہ زبان کی خدمات سرانجام دیتی رہے۔ ملیت کے مفاد سیاسی اور اقتصادی ہوتے ہیں اس لیے اس کے جذباتی پہلو کا احترام اسی طور پر ہو سکتا ہے کہ اس بارہ

(۲)

"مغربی تہذیب کے اثرات سے ہندوستان کا معیارِ زندگی بہت بلند ہو گیا ہے۔ اور یہ تمام نتائج اِس لیے مترتب ہوئے ہیں کہ ہمیں تعلیم میکالے اور برک کی زبان میں دی گئی ہے"۔

مسٹر سرندر ناتھ بینرجی

(۳)

"ہمارے ملک کو انگریزی کی تعلیم سے جو فائدہ ہوا ہے جب ہم اُس کا تہ دل سے اعتراف کرتے ہیں تو ہمیں یا کم از کم ہم میں سے اُن کو جو اس قرارداد کے اتنے مخالف نہیں جتنے کہ وہ اس کے حامی ہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس غرض سے کہ ہمارے نوجوان انگریزی زبان اور ادب میں اعلیٰ استعداد حاصل کر سکیں جس حکمتِ عملی پر عمل کیا جا رہا ہے وہ باشندوں کی تعلیم و تربیت کے لیے دیسی زبانوں کے قدرتی یا مناسب استعمال سے متعلقہ حکمت عملی کی حوصلہ افزائی کے منافی نہیں ہے"۔

پنڈت مدن موہن مالویہ

(۴)

ہم لارڈ میکالے کے مشکور ہیں کہ اُنہوں نے استقلال اور جرأت سے یہ کوشش کی اور اس بات پر اصرار کیا کہ ملک میں تعلیم انگریزی اور صرف انگریزی ہی میں دی جانی چاہیے۔ اگر انگریزی زبان کے ذریعہ ہم اعلیٰ قابلیت حاصل نہ کرتے تو ہماری کیا حالت ہوتی؟ یہ اصلاح یافتہ کونسل جس پر اس وقت ہم اس قدر نازاں ہیں کہاں ہوتی؟ کیا میرے دوست چاہتے ہیں کہ سائنس، ریاضی، انجینئرنگ، طب، قانون اور دیگر مغربی علوم کے پڑھنے کے لیے جن کی تعلیم صرف انگریزی زبان کے ذریعہ عمل میں آ سکتی ہے ہندوستان میں مروجہ بیسیوں زبانوں کو استعمال کیا جائے؟ کیا میرے دوست میارہ یا بل

ایسی بہتری پیدا کرنے کے متمنی ہیں۔ :

رائے بہادر رائے سیتا ناتھ

لیکن ملت کی تشکیل کے لیے زبان کے ایک ہونے پر اصرار کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ برطانیہ کے مختلف حصوں کی مقامی زبانیں ایک دوسرے سے جُدا ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں بھی یہی حال ہے اور یورپ کے دیگر ممالک میں بھی زبان کے اختلاف موجود ہیں۔ لیکن ان کے باوجود ان ملکوں کی اپنی اپنی ملتیں قائم ہیں اور بدستور قائم رہیں گی۔ جب کسی ملک میں یکی ملت کے قائم کرنے کا خیال پیدا ہو جاتا ہے تو ایسی دقتوں سے عہدہ برآ ہونا اُس کے لیے مشکل نہیں ہوتا۔ امریکہ میں نسل اور زبان کے لحاظ سے اتنے شدید اختلافات موجود تھے کہ شاذ ہی کسی اور ملک میں ایسے اختلافات پیدا ہوئے ہونگے لیکن امریکہ نے احساس ملی کے زیر اثر اپنی نسل کو بھی ایک بنا لیا اور زبان کی یکسانیت بھی پیدا کر لی اگر کوئی خاص رکاوٹ پیدا نہ کی جائے تو کیا ہندوستان جہاں لوگوں میں اپنے ہم نسل ہونے کا یقین پہلے ہی سے موجود ہے اور جو ایک دوسرے کی بات کسی نہ کسی طرح سمجھ لینے کی قدرت رکھتے ہیں اس بارہ میں امریکہ اور دیگر یورپی ممالک کے مقابلہ میں کم اہلیت کا ثبوت دے سکتا ہے؟ جو بات سب سے زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ آزاد ملکوں اور آزاد ملتوں کی مثال ہمیشہ اہل ملک کے پیش نظر رہنی چاہیے خواہ اس کا انتظام انگریزی کے وسیلہ سے کیا جائے خواہ ہندی یا اُردو کے ذریعہ سے تاکہ اُن میں جذباتِ رشک پیدا ہوتے رہیں اور متحد و متفق ہو کر شاہراہِ ترقی پر گامزن ہونے کی خواہش ٹھنڈی نہ ہونے پائے اس احساس ملی کو جو اس وقت پیدا ہو چکا ہے برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ ترقی و تربیت کی راہیں خود نکال لے گا۔ اس کے متعلق فکر کی ضرورت نہیں۔ جذبۂ ملیت جن کو ایک دفعہ متحد کر دے وہ اپنی فلاح کی راہیں خود ڈھونڈ لیتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں ایک اور نکتہ جس کی تشریح لازمی ہے یہ ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مثال اگرچہ ہمارے لیے شمع ہدایت ہے اور اس امر سے

ہماری حوصلہ افزائی بھی ہوتی ہے کہ وہاں کے باشندوں نے باوجود ایسے شدید باہمی اختلافات کے اپنی ملت قائم کر لی تھی لیکن ہم اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ موجودہ امریکی ملت کے آباؤ اجداد یورپی ممالک سے ترک وطن کر کے آئے تھے اِس لیے نہ صرف وہ جمہوریت پسند واقع ہوئے تھے بلکہ ملی خیالات سے بھی کافی حد تک متعارف تھے۔ لہٰذا اُن کے لیے باہم مل کر اپنے تمام اختلافات کو مٹا دینا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔ ہندوستان تو درکنار کوئی مشرقی ملک بھی جمہوریت پسند واقع نہیں ہوا کیونکہ یہاں ملوکیت کا غلبہ رہا ہے۔ ہماری ذہنیت امارت پسند اور حاکم پرست واقع ہوئی ہے۔ جمہوریت کی روح ابھی اتنی نہیں پھیلی کہ ہم دعوے سے کہہ سکیں کہ ملوکیت کے زہر آلود اثرات اب زائل ہو چکے ہیں اور ہم حقیقی معنوں میں آزادی کے طلبگار ہیں اور وہ سب قربانیاں بھی کرنے کے لیے تیار ہیں جو اس ایک حق کو حاصل کرنے کی خاطر اکثر کرنی پڑتی ہیں۔ لہٰذا جمہوریت کی روح کو اور زیادہ پھیلانے کے لیے ہمیں کچھ عرصہ تک اور انگریزی زبان کی ضرورت ہے۔

صوبجاتی مجالس قانون ساز میں سے سرکاری ممبران کے اخراج کے بعد صوبوں میں انگریزی کی اہمیت میں کسی حد تک کمی آجائے گی۔ کیونکہ اگر ان مجالس میں اس وقت انگریزی ضرورت سے زیادہ رائج ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سرکاری افسران جو اکثر انگریز ہوتے ہیں صوبائی زبانوں کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے اِس لیے دیسی ارکان کو اُن کی سہولت کے پیشِ نظر انگریزی میں اظہارِ خیال کرنا پڑتا ہے نیز دیسی قابل ارکان کو بڑے بڑے عہدوں مثلاً وزارتوں کے حصول کے لیے اپنی قابلیت کا سکّہ ہندوستانی ممبروں پر نہیں بلکہ انگریز ممبران پر بٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ موجودہ وقت میں وہی صاحبِ اختیار اور سیاہ و سفید کے مالک ہیں۔ قانون ساز مجلسوں میں سے سرکاری ممبران کے نکل جانے کے بعد یہ بات نہیں رہے گی۔ وزیر اپنے محکموں کے انتظامات کے لیے ایوان کے سامنے ذمہ دار ہوں گے نہ کہ گورنر کے سامنے۔ اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ وزراء کو انگریزی چھوڑ

کہ کسی ایسی صوبائی زبان کو استعمال کرنا پڑے گا جسے ممبران کی اکثریت سمجھتی اور پسند کرتی ہو لیکن کچھ عرصہ تک تقریروں کی تیاری کے لیے نیز مختلف موضوعات کے بارہ میں مختلف اعداد و شمار حاصل کرنے کے لیے بھی انہیں انگریزی کتب کا مطالعہ کرنا پڑے گا جس سے انگریزی زبان یکدم غیر مستعمل نہیں ہوگی بلکہ آہستہ آہستہ کسی دیسی زبان کو اپنی جگہ دیتی جائے گی حتیٰ کہ وہ دیسی زبان مکمل نشوونما کے بعد مقبول عام ہو جائے۔ اور لوگوں کو انگریزی زبان کی ضرورت نہ رہے۔ لیکن یہ عمل صرف صوبوں تک محدود ہو گا۔ مرکزی مجلس مقننہ میں انگریزی کے بغیر گذارہ نہیں ہو سکے گا اور اگر موجودہ حالات کی بنا پر استنباط کیا جائے تو ممبر ہمیشہ انگریزی کے محتاج رہیں گے۔ مختلف صوبوں کے لوگوں کو آپس میں تبادلہ خیالات کرنے کے لیے اور ہندوستان کو باقی ممالک دنیا کے ساتھ تعلقات قائم رکھنے کے لیے انگریزی زبان کی بدستور حوصلہ افزائی کرنی پڑے گی۔

اس ضمن میں ایک تقریر کا ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا جو مجھے ۲۸ فروری ۱۹۳۵ء کو لاہور میں سننے کا اتفاق ہوا۔ مقرر کسی مقامی کالج کے پروفیسر تھے۔ موضوع یہ تھا۔ صوبہ (پنجاب) میں اُردو کا مستقبل اور اس سے وابستہ چند دیگر مسائل"۔ فاضل پروفیسر کی تقریر نہ صرف پُر مغز اور پُر معنی تھی بلکہ فکر یہ کے لیے باعث انگیخت اور ہیجان خیز بھی تھی۔ دوران تقریر میں آپ نے یہ مشورہ پیش کیا کہ اگر ہندوستانی زبان کے ناگری اور فارسی رسم الخطوں کو متروک قرار دے کر ان کی بجائے انگریزی حروف تہجی یعنی رومن رسم الخط کو مستعمل کیا جائے تو اس سے کم از کم شمالی ہندوستان کے چند صوبوں میں زبان کے بارہ میں یگانگت اور یکسانیت پیدا ہو سکتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ رسم الخط کی بنا پر زبان کے بارہ میں فرقہ وارانہ اختلاف کی ایک خلیج کو بھی جو ایک مدت سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان حائل ہے پاٹا جا سکتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی لیکن اس کے پس پردہ

متحدہ ملتِ ہندیہ کی قابلِ احترام خواہش ضرور موجود تھی۔ ہر سمجھ دار شخص کی یہ خواہش ہے کہ اختلافات کی خلیجیں جو اس وقت ہندوستان کی ہمسایہ اقوام کو ایک دوسرے سے جدا کیے ہیں پاٹی جائیں۔ رومن رسم الخط کو مروج کرنے کا مشورہ جہاں تک نظریہ اور قیاس کا تعلق ہے نظر فریب اور دلکش ہے لیکن جہاں تک عملی زندگی یعنی سیاسیات اور واقعات کا تعلق ہے اس مشورہ کو جامۂ عمل پہنانا آسان کام نہیں کئی دفعہ رومن رسم الخط کو اپنانے کی کوششیں ناکامیاب ہو چکی ہیں۔ افواج میں بھی کوشش کی گئی کہ رومن حروف کو مروج کیا جائے لیکن یہ کوشش بھی بے سود ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ انگریزی اخبارات نے رومن رسم الخط کو ہر دل عزیز بنانے کی کوشش کی اور اپنے کچھ کالم رومن رسم الخط میں لکھے ہوئے اردو کے لیے وقف کیے لیکن کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ پریس لاہور سے ۱۹۰۷ء میں ایک ماہوار رسالہ "رومن اردو جرنل" نکلا کرتا تھا۔ اور اس کے سرورق پر لکھا ہوتا "مشرقی زبانوں کی تحریر رومن حروف میں مروج کرنے کے لیے" لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اسی طرح کئی اردو کی کتب کو رومن رسم الخط میں چھاپا گیا لیکن عوام نے توجہ تک نہ کی اور یہ تحریک خود بخود بند ہو گئی۔ سیاسیات میں اور خاص کر جمہوریت پسند ممالک کی سیاسیات میں ہمیشہ وہی بات اختیار کرنی پڑتی ہے جس کے راستہ میں کم از کم رکاوٹیں اور دقتیں حائل ہوں۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے سب سے بڑی رکاوٹ جو اس مشورہ کے قبول کرنے کے راستہ میں حائل ہے وہ ذہنیت ہے جو فارسی عربی یعنی اسلامی تہذیب کے زیرِ اثر معرضِ وجود میں آکر ایک مستحکم و مکمل صورت اختیار کر چکی ہے۔ اگر یہ کہا جائے جیسا کہ قابلِ احترام پروفیسر کی تقریر کے دوران میں کہا گیا تھا کہ اس مسئلہ پر مقامی زبان کے ادب سے وابستہ جذبات سے بالاتر ہو کر غور کرنا چاہیے تو یہ ایک ایسی توقع کرنے کے مترادف ہے جو نہ صرف انسانی فطرت کے خلاف بلکہ اس کے عین متضاد ہے۔ تمام سیاسی خیال اپنی قیاسی حیثیت میں محض جذبات ہوتے ہیں اور سیاسی تعقل و تفکر کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ

کسی سہل اور آسان طریقہ سے ان سے وابستہ تقاضات کی تسکین وتشفی کرے ۔ ملیت کسی ملک کے باشندوں کے اس مشترکہ جذبہ کا نام ہے جو انہیں زمانہ ماسبق کے تاریخی واقعات، حال کے مفاد اور مستقبل کی خواہشات برتری کی زنجیروں سے آپس میں جکڑ دیتا ہے ۔ اسی طرح جمہوریت بھی ایک فطری جذبہ ہے جس کی بنا پر ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ اسے دوسرے انسانوں کے مساوی حیثیت دی جائے ۔ اسی طرح اشتراکیت بھی جمہوریت سے متعلقہ اس قدرتی جذبہ کی ایک شدید اور انتہائی صورت ہے ۔ صوبائی داخلی آزادی کا مطلب ہی یہ ہے کہ جہاں تک صوبجات کے اندرونی معاملات کا تعلق ہے ان کو پوری پوری آزادی دی جائے کیونکہ ان کی منازل مختلف ہیں اور ان کے ان تک پہنچنے کے راستے بھی مختلف ہیں ۔ اگر صوبجات میں نسل مذہب تہذیب وتمدن اور زبان کے اختلافات موجود نہ ہوتے تو اس وقت ہندوستان کی طرف سے فیڈرل نظامِ حکومت کا مطالبہ نہ کیا جاتا اور نہ ہی پارلیمنٹ فیڈریشن کو قرینِ مصلحت سمجھتی ۔ اگر یہ اختلافات اور تضاد جو مختلف صوبوں کے باشندوں کے درمیان موجود ہے آسانی سے دور ہو سکتا تو سیاسیین وحدانی نظامِ حکومت کے قائم کرنے پر اپنا زور صرف کرتے ۔
جہاں تک ملیت کا تعلق ہے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی سی ملت قائم کرنا ہمارا نصب العین ہے ۔ فیڈریشن قائم کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ صوبجات صرف خارجی معاملات اور غیر ملکی خطرات سے تحفظ کے لیے مائل بہ مرکز رہیں اور دیگر داخلی امور کے بارہ میں اپنے اپنے مقامی حالات کے مطابق عمل پیرا ہو کر شاہراہِ ترقی پر گامزن ہوں ۔ ہندوستان میں ایسی ملت قائم کرنا جیسی کہ انگلستان جرمنی یا کسی اور یورپی ملک میں ہے خیال است ومحال است وجنوں ۔ کیونکہ مختلف امور کے متعلق باہمی یک جہتی یگانگت اور یکسانیت جو ان ممالک کے باشندوں کو حاصل ہے ہمیں نصیب نہیں ۔ ایسی یک جہتی کے قیام کی کوشش بسا اوقات ملک کی اقتصادی، سیاسی، مجلسی اور دیگر ایسی سرگرمیوں کے رستہ میں حائل ہو جایا کرتی ہے ۔ اگر ہم ان قیاسی اور خوابی ناممکنات کے حصول کی کوشش میں لگ گئے تو اس سے سوائے تضییع اوقات کے اور کوئی مفید نتیجہ برآمد

نہیں ہوگا۔ اگر ان اعداد و شمار کی طرف توجہ کی جائے جو اس باب کے آغاز میں رقم کیے گئے ہیں تو یہ بات ظاہر ہو کہ ہندوستان میں زبان کے اختلافات اس قدر گہرے اور شدید ہیں کہ ایک دو یا زیادہ سے زیادہ تین صوبوں کے درمیان زبان کے بارہ میں یکسانیت پیدا کر دینے کا امر کوئی بڑی اور مفید مطلب کامیابی نہیں ہوگا مزید برآں اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ رومن رسم الخط کو مروج کرنے کا جہاں تک تعلق ہے اعراب اور مشتقات کی نیز اس وقت تک جس قدر اردو ادب فارسی رسم الخط میں چھپ چکا ہے اس کو رومن رسم الخط میں بدلنے کی مشکلات محنت اور سرمایہ کے آگے کچھ بڑی مشکلات نہیں ہیں تو بھی رسم الخط کے متعلقہ اس بدعت کو پنجاب کی ذہنیت میں ٹھونسنا جو صدیوں سے سامی الاصل ہو چکی ہے ایک کار دشوار ہے۔ اس کے علاوہ اگر فارسی رسم الخط کو غیر مستعمل کر کے اس کی بجائے رومن رسم الخط کو فروغ دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے جس قدر روپیہ اور محنت گذشتہ ۸۰ سالوں کے دوران میں لوگوں کے عام طبقوں کو اور خاص کر دیہاتی طبقوں کو خواندہ بنانے پر صرف کی ہے وہ سب اکارت گئی۔ عنقریب آنے والے تمام انقلابات کے پیش نظر یہ امر قرین دانش نہیں کہ ہم اس رسم الخط کو چھوڑ کر جسے ایک بڑی حد تک صوبہ کے باشندے اس وقت پڑھنے کے قابل ہو چکے ہیں کسی اور رسم الخط کو رواج دینا شروع کر دیں۔ لہذا اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں کہ زبان کے بارہ میں صوبہ کے موجودہ حالات کو برقرار رکھا جائے۔ تجربات کرنے کے لیے یہ وقت موزوں نہیں ہے۔ ہماری موجودہ فضا ایسی ہے کہ ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ہر صوبہ کی اپنی اپنی علیحدہ صوبائی زبان ہو گی اور ان کے باہمی تعلقات کو برقرار رکھنے کے لیے انگریزی کا مرہون منت رہنا پڑے گا۔ مقرر مذکور کے اس مشورہ کے ساتھ میں کلی طور پر متفق ہوں کہ انگریزی کو سکولوں میں غیر لازمی مضمون قرار دیا جائے اور ان طلبا کو جو اعلیٰ یونیورسٹی تعلیم حاصل کرنے کے متمنی ہوں اور جو اپنی اعلیٰ ذاتی استعداد کا ثبوت دے کر اپنے حق کو ثابت کریں یا انگریزی کے پڑھنے کے لیے خاص زائد فیس ادا کرنے کے لیے تیار ہوں اس بارہ میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ اس کا نتیجہ

یہ ہوگا کہ کافی تعداد میں ایسے اشخاص پیدا ہوتے رہیں گے جو مرکزی حکومت کے سامنے نیز دنیا کے سامنے مختلف صوبوں کی نمائندگی کر سکیں گے۔

اس کے بعد ایک بڑا اعتراض جو فارسی رسم الخط کے خلاف پیش کیا جاتا ہے یہ ہے کہ اس میں ٹائپ کی لکھائی اور سانچہ کی چھپائی بہت مشکل ہے۔ حال ہی میں حیدرآباد میں سانچہ کی چھپائی کا ایک طریقہ ایجاد ہوا ہے اس کے خلاف یہ اعتراض پیش کیے جاتے ہیں کہ اس میں اکثر حروف کے بہت سے حصے کر کے ان کے سانچے تیار کیے گئے ہیں اور ایک ایک حرف کے ان کئی کئی حصوں کو ترتیب دینے کا کام سخت محنت طلب ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ پروف کی کاپیاں درست کرنا اور بھی زیادہ باعثِ زحمت ہوتا ہے۔ ان تمام دقتوں کا علاج یہ ہے کہ چھاپے کی ضرورتوں کے مطابق فارسی رسم الخط کے حروف کی شکلوں کو بدل دیا جائے۔ دستی لکھائی تو بدستور طریق موجودہ مروج رہے لیکن چھاپے میں تبدیل شدہ حروف کا استعمال کیا جائے۔ اور ان کو آپس میں ملانے کی بھی ضرورت نہیں۔ اسی طرح جس طرح رومن حروف علیحدہ علیحدہ چھپتے ہیں ان کو بھی لفظ میں علیحدہ علیحدہ ترتیب دی جائے اور دو لفظوں کے درمیان کچھ فاصلہ چھوڑ دیا جائے۔ اس طرح جس طرح انگریزی لکھی جاتی ہے۔ اس مشورہ کے مطابق فارسی رسم الخط کے حروفِ تہجی کی نئی شکل یہ بھی ہو سکتی ہے۔

ا ب ح د ر س ص ط ع ف ک ل م ن و ہ ی ے

مثال کے طور پر عبارت کی شکل اس قسم کی ہوگی۔

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

(ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا)

اس شکل میں یا اس سے ملتی جلتی کسی اور شکل میں فارسی حروفِ تہجی کا ٹائپ رائیٹر بھی تیار ہو سکتا ہ

اور اس "کا کی بورڈ" انگریزی ٹائپ رائیٹر کے "کی بورڈ" کے مقابلہ میں بہت سادہ ہوگا اور مشق بھی آسانی سے ہو سکے گی۔ مرقومہ صدر حروف اعراب اور گنتی کے ۹ تک کے اعداد کے علاوہ جن اور علامات کی ضرورت ہوگی وہ حسب ذیل ہیں :۔

، ، ، ، ، ، ، ، ( ) ، ، ! ، ، ،

انگریزی کے ٹائپ رائیٹر کے "کی بورڈ" پر حروف اور علامات کی کل تعداد ۷۵ ہوتی ہے لیکن اُردو کے اس ٹائپ رائیٹر کے کی بورڈ پر اگر یہ تیار کیا جائے تو صرف ۴۲ حروف بمع علامات کافی ہوں گے۔ اس کے علاوہ انگریزی حروف میں صغیر اور کبیر کا بھی امتیاز ہے۔ اس امتیاز سے بھی جہاں تک اُردو ٹائپ رائیٹر کا تعلق ہے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔

تقلید بُرا شیوہ نہیں۔ لیکن سمجھ سوچ کر مقلد بننا بہتر ہوتا ہے۔ اگر ترکی نے ترکی رسم الخط چھوڑ کر رومن رسم الخط کو اختیار کیا ہے تو ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ ترکی رسم الخط میں کوئی ایسے نقائص موجود ہوں کہ جن سے عہدہ برآ ہونا ناممکن یا کم از کم بے حد مشکل ہو۔ ترکی میں ایک ہی قوم آباد ہے اور اس کے افراد میں نسل مذہب تہذیب وغیرہ کے بارہ میں مکمل یکسانیت موجود ہے۔ وہ کسی بات کو متفقہ طور پر رائج کر سکتے ہیں کیونکہ اُن کو کسی ایسے فریق کی طرف سے مخالفت کا اندیشہ نہیں ہو سکتا جو اُن سے ہر بات میں مختلف ہو۔ ترکوں نے اگر رومن رسم الخط کو اختیار کر لیا ہے تو سہولت کے پیش نظر ایسا کیا ہے نہ کہ ملت کے مختلف عناصر کے باہمی اختلافات کو مٹانے کے لیے۔ اگر ترکی میں اس قسم کے کسی تضاد کو مٹانے کے لیے ایسا کیا گیا ہوتا تو اس کی پیروی کرنا پر مصلحت ہوتا۔ موجودہ صورت میں اُن کی تقلید نقصان دہ ہے ۔

باب چہارم

ہندوستانیوں کے مذہب

ہندوستانیوں کے مذہب

اختلافِ مذاہب کی وجہ سے ہندوستان میں ملت کا قیام مشکل نظر آتا ہے لیکن اس مشکل کو حالات کے تجزیہ اور مذہبی ذہنیت کی تحقیقات کے بغیر امر مسلمہ تسلیم کرنا اور عقدۂ لاینحل سمجھنا قرین دانش نہیں۔ مختلف مذاہب پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر دیکھنا چاہیئے کہ ان میں تضاد اور اختلاف کے عنصر کہاں تک اور کس قدر موجود ہیں۔ ہندوستان کے موجودہ مذاہب پر اگر سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تین قسم کے ہیں۔ اوّل ہندی الاصل۔ دوم سامی الاصل۔ سوم ایرانی الاصل ہندو دھرم۔ سکھ مذہب۔ جین مت۔ بدھ مت اور قدیم باشندوں کے توہم پرستی پر مبنی تمام مذاہب ہندی الاصل ہیں۔ اسلام۔ عیسائیت اور یہودیت سامی الاصل ہیں۔ پارسی مذہب ایرانی الاصل ہے۔ ان تمام مذاہب کے پیروؤں کی علیحدہ علیحدہ تعداد حسب ذیل ہے:-

	تقریباً تعداد
ہندو	۲۲۰۰۰۰۰۰۰
سکھ	۳۰۱۴۴۶۶
جین	۱۲۴۸۱۸۲
بدھ	۱۰۷۲۱۴۵۳
مسلم	۷۷۵۰۰۰۰۰

عیسائی	———	۳۸۷۶۲۰۳
یہودی	———	۲۰۹۸۰
پارسی	———	۱۰۰۰۹۶
توہم پرست	———	۱۰۳۳۲۲۴۹

ہندوستان مذہب کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے ۔

۱ ۔ شمالی مغربی ہندوستان ۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ ۔ پنجاب ۔ کشمیر ۔ سندھ وغیرہ ۔

۲ ۔ مرکزی ہند اور دکن ۔ بہار و اڑلیسہ ۔ صوبجات متحدہ ۔ صوبجات متوسط ۔ دکن وغیرہ ۔

۳ ۔ مشرقی ہندوستان ۔ یعنی بنگال ۔

ہندو دھرم ایک نہایت وسیع اور لامحدود نظریہ ہے جو دنیا بھر کے ادیان کا مجمع ہے اس کے پیروؤں میں خدا کی وحدانیت پر ایمان رکھنے والے ۔ اُس کی ہستی سے انکار کرنے والے ۔ بُت پرست اور اوتار پرست سب شامل ہیں ۔ ان کے علاوہ وہ بھی ہیں جنہوں نے خدائی طاقت کو تین حصوں یعنی برھما وشنو اور شو میں تقسیم کر رکھا ہے اور ان حصوں کی علیحدہ علیحدہ پرستش کرتے ہیں نیز اجرام فلکی کے پرستار بھی ہندوؤں میں شامل ہیں ۔ ہندو مذہب بُردباری حلم اور تحمل کے لحاظ سے اپنا ثانی نہیں رکھتا اور یہی وجہ ہے کہ اس کے پیروؤں میں ہر عقیدہ اور ہر خیال کے آدمی ملتے ہیں ۔ دیوتا اور اوتار لاتعداد ہیں ۔ اور ان میں سے جس کی کوئی چاہے پوجا کر سکتا ہے ۔ لیکن مذہبی عقیدوں کے اعتبار سے اس انتہا درجہ کی بُردباری کے مقابلہ میں جو ہندوؤں میں ہے کئی ایسی تمدنی باتیں ہیں کہ ان کے بارہ میں تحمل و برداشت کا مادہ بالکل مفقود ہے ۔ اور یہ وہ باتیں ہیں جن کے متعلق تمام ہندو آبادی ہم خیال و ہم رائے ہے ۔ دھرم کا تعلق زیادہ تر ان اصولوں اور باتوں سے ہے جن کے مطابق تمام ہندو اپنی روزانہ زندگی میں عمل کرتے ہیں ہندو عملی زندگی میں اتنی اہمیت عقیدہ کو نہیں

دیتے جتنی کہ کیش یا چلن کو دیتے ہیں ۔ خواہ کوئی آں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیرو ہو یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اس میں کچھ ہرج نہیں لیکن اگر وہ گوشت کھاتا ہے اور گائے کی عظمت کا قائل نہیں تو قابلِ ملامت ہے اور اس کے ہاتھ سے کوئی چیز لے کر کھانا ادھرم ہے ۔ مہتر خواہ ہندو ہو یا مسلم لیکن چونکہ وہ نیچ ذات سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کے ساتھ چھو جانے سے اعلےٰ ذات کا ہندو بھرشٹ ہو جاتا ہے ۔ ہندو مذہب کی تعریف کرنا محال ہے کیونکہ جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ میں ہندو ہوں تو اس کا اشارہ نہ صرف مذہب کی طرف بلکہ ملک اور حسب ونسب کی طرف بھی ہوتا ہے ۔ محض تبدیلی مذہب سے ہندو دھرم میں داخل ہونا ممکن نہیں ۔ ہندو مذہب صرف اُن کے لیے ہے جو ہندو گھر میں جنم لے کر ہندو سماج میں شامل ہوئے ہوں ۔ ہندوستان کے تمام باشندے ماسوائے مسلمانوں عیسائیوں یہودیوں اور پارسیوں کے ہندو ہیں ۔ بعض کہتے ہیں کہ ہندو وہ ہے جو ویدوں کو مانتا ہو ۔ بعض کا خیال ہے کہ ہندو وہ ہے جو سوائے تنتروں کے ہندوؤں کی تمام مذہبی کتب پر ایمان رکھتا ہو ۔ ایک دیگر فرقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص مسئلہ کرم کا قائل ہے وہ ہندو ہے ۔ لیکن عملی زندگی میں ہندو وہ ہے جو ذات پات کا قائل ہو ۔ رسومِ ذاتی کا پابند ہو اور برہمنوں کی عزت کرتا ہو ۔ عقاید کے لحاظ سے ہندو نہایت فراخ دل اور صلح کل واقع ہوئے ہیں لیکن ہندو دھرم کے پیشِ نظر جو ہندو مذہب سے مختلف اور ذات کی تمیز وغیرہ پر مبنی ہے ان کی تنگدلی نفرت پرور اور تفرقہ انداز ہے ۔ ہندوستان کے غیر متمدن قدیم باشندوں کو مذہبی لحاظ سے تو اپنے میں شامل کر لیا گیا لیکن جہاں تک دنیوی وقار کا تعلق تھا اپنی اعلےٰ حیثیت کو ذات پات کی تقسیم سے قائم رکھا اور ذات پات کو اتنی اہمیت دی کہ وہ مذہب پر بھی سبقت لے گئی ۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ذات پات کی سختی کی وجہ دراصل وہ نرمی اور بردباری ہے جو مذہبی اور نسلی اختلاف کے باوجود آریہ فاتحین نے یہاں کے قدیم باشندوں کے ساتھ روا رکھی تھی رنگ ونسب کی بنا پر اکثر کمزور اقوام کو بالکل تباہ

کر دیا جاتا ہے جیسا کہ سفید رنگ اقوام نے افریقہ اور امریکہ میں کیا اور اب تک کر رہی ہیں۔ لیکن ہندوؤں نے قدیم باشندوں کو سوسائٹی میں ادنٰی درجہ دے کر اُن کے زندہ رہنے کا انتظام کر دیا۔ ہندو مذہب چونکہ تبلیغی نہیں اس سبب اس کے پیروؤں کی تعداد میں اضافہ کا واحد ذریعہ پیدائش اور افزائش نسل ہے۔ ہندو دھرم میں ذات پات کی سختی کے خلاف کئی بغاوتیں ہوئیں جن کا اثر یہ ہوا کہ ان بغاوتوں کے علمبرداروں کے خیالات اور پرچار نے نئے مذہبوں کی بنا ڈالی۔ مثلاً بدھ مت اور جین مت حقیقت میں ان میں سے ہر ایک مت ہندو دھرم کے خلاف صدائے احتجاج کے مترادف ہے اگرچہ اس وقت ان مذاہب کو ہندو مذہب کی شاخیں تصور کیا جاتا ہے اور ان کے پیرو بھی ہندوؤں میں شمار ہوتے ہیں سکھ مذہب ہندو مذہب پر اسلام کے بدیہی اثرات کا ایک متشکل و مرئی نتیجہ ہے۔ بلحاظ عقیدہ و شعار سکھ مسلمانوں سے ملتے جلتے ہیں اور اگر کہا جائے کہ یہ مذہب مقامی حالات کے مطابق اسلام کی ایک نئی شکل یا ترمیم یا ترجمہ ہے تو کسی حد تک درست ہے لیکن سکھ بلحاظ تہذیب و تمدن ہندوؤں سے متشابہ ہیں اور اس مشابہت کی بنا پر باوجود سکھوں کے اس دعوے کے کہ وہ ہندوؤں سے علیحدہ ہیں یہ امکان باور کیا جاسکتا ہے کہ آہستہ آہستہ سکھ مذہب بھی ہندو مذہب کی شاخ تصور ہونے لگے گا اور سکھوں کا شمار بھی ہندوؤں کے ساتھ ہوگا۔ اسی تمدنی مشابہت کی بدولت بدھ اور جین ہندوؤں میں شامل ہو گئے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ سکھ چونکہ اپنی ایک علیحدہ ہستی قائم کر چکے ہیں اس لیے ان کا ہندوؤں میں شامل ہو جانا قرین قیاس نہیں۔ اقتصادی حالات اور سیاسی تحریکات پر تعداد کی زیادتی اثرانداز نہیں ہوا کرتی بدھ مذہب نے اتنی ترقی کی کہ ہندوستان سے نکل کر دیگر ممالک میں بھی پھیل گیا اور اس وقت دنیا میں اس کے پیروؤں کی تعداد کروڑوں تک پہنچی ہے۔ لیکن باوجود اس ترقی اور اشاعت کے ہندوستان میں وہ اپنی ہستی کو علیحدہ اور بذاتہٖ قائم رکھنے میں ناکام رہا ہے۔ اور اس کی وجہ صرف

یہ ہے کہ اس کے ہندی پیرو بلحاظ تہذیب و تمدن رنگ و نسب عام ہندو آبادی سے متشابہ تھے
بدھ مذہب کے مقابلہ میں سکھ مذہب نے ابھی تک کچھ زیادہ ترقی نہیں کی اور بلحاظ تعداد بھی سکھ
بدھ مذہب کے پیروؤں کے مقابلہ میں بہت تھوڑے ہیں۔ اس لیے ممکن ہے کہ کسی وقت اقتصادی
حالات اور سیاسی تحریکات انہیں ہندوؤں میں شامل ہونے پر مجبور کر دیں۔ ہندو مذہب میں سکھ مذہب
کی آئندہ شمولیت کی ایک اور یہ بھی وجہ ہے کہ بدھ مت اور جین مت کی طرح یہ مذہب بھی ہندوستان
میں پیدا ہوا اور اس کا پرچار بھی ہندی زبان کے ذریعہ ہی کیا گیا اور اس لیے عام بول چال میں اس کے
پیروؤں کو عام ہندوؤں سے اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ بات باہمی اعتماد اور یک جہتی پیدا کرتی
ہے جس کی بنا پر سکھوں کا ہندوؤں میں شامل ہو جانا یقینی نظر آتا ہے۔ وطنی نسبت کی وجہ سے تمدنی
نسبت کا پیدا ہونا لازمی ہوتا ہے اور اس تعلق کی بنا پر جب مذہبی اختلاف نظر انداز ہونے لگتا ہے تو
اکثر یکرنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ تاریخ اس اصول کی شاہد ہے موجودہ وقت میں ہندوؤں اور سکھوں میں جو
صوری اختلاف ہے وہ ان کی علیحدگی کا باعث ہے اگر سکھ اپنی علیحدہ ہستی کو بدستور قائم رکھنے کے متمنی
ہیں تو انہیں ان تمام باتوں کا خیال رکھ کر اصولِ مذہب اور ظاہری اختلاف کی اہمیت کو برقرار رکھنا
ہوگا ورنہ اُن کی علیحدہ ہستی کا قائم رہنا محال ہے۔ برخلاف اس کے ان لوگوں میں اس قسم کی یگانگت
کا پیدا ہونا جن کے مذاہب کو ایسی وطنی قربت حاصل نہ ہو مشکل ہوتا ہے اسلام یا عیسائیت کے
بارہ میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کسی طرح یا کسی وقت ہندو دھرم میں یا ہندو دھرم اُن میں سے کسی ایک
میں جذب ہو سکتا ہے لیکن اسلام کو عیسائیت اور یہودی مذہب سے ایک نسبت ہے اور وہ یہ کہ
موخرالذکر دونو مذاہب کی طرح اسلام سامی الاصل ہے۔ اس لگاؤ کی بنا پر از روئے اسلام مسلمان عیسائی
اور یہودی عورتوں سے شادیاں کر سکتے ہیں۔ لیکن اسلام کو چونکہ ہندو مذہب سے ایسا کوئی تعلق نہ تھا
اس لیے ہندوؤں کے ساتھ اس قسم کے ازدواجی تعلقات پیدا کرنے کی مسلمانوں کو از روئے شرع

اجازت نہ تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس بارہ میں جو بھی کوششیں کی گئیں وہ ناکام رہیں۔ وطنی بیگانگی کی وجہ سے ہندو مذہب اور اسلام میں تمدنی اختلاف موجود ہے۔ یہ اختلاف انہیں ہمیشہ ایک دوسرے سے الگ رکھے گا۔ لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ ہمسائیگی کی بنا پر مذاہب ایک دوسرے سے اثر پذیر نہیں ہو سکتے۔ ہندو دھرم نے اگر اہلِ اسلام پر اپنا اثر ڈالا ہے تو اسلام نے ہندوؤں کے مذہب میں بھی چند اہم تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ ویدک زمانہ میں آریہ لوگ خدا کی پرستش کرتے تھے اور اُس کی وحدانیت کے بھی قائل تھے لیکن امتدادِ زمانہ سے اُن کے عقیدوں میں اتنا فرق آیا کہ آغاز کو انجام سے کوئی نسبت ہی نہ رہی۔ اسلام کا ہندوؤں پر یہ اثر ہوا کہ ان میں بہت سے ایسے لوگ پیدا ہو گئے جنھوں نے عوام کو پھر خدا کی وحدانیت کی طرف توجہ دلائی اور ہندو دھرم میں ویدک دھرم کے مطابق ترمیم کرنے کی ٹھانی۔ یہ فرقہ آریہ سماج کے نام سے موسوم ہوا۔ اور چونکہ اُس کا آغاز دورِ جدید میں ہوا ہے اس لیے مغربی خیالات کے اثر سے اس کا مطمحِ نظر ہندوؤں میں ملیت کا جذبہ پیدا کرنا بھی ہے۔ اِس سے پہلے سکھ مذہب جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے ہندو مذہب پر اسلامی شعار کے اثرات سے معرضِ وجود میں آیا تھا۔ لیکن ان دونوں فرقوں کے پیدا ہونے کی وجوہ نفسیاتی نکتۂ نگاہ سے مختلف ہیں۔ سکھ مذہب اِس لیے معرضِ وجود میں لایا گیا تاکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی منافرت دور ہو سکے اور وہ اس کے ذریعہ سے ایک ہو سکیں۔ برعکس اس کے آریہ سماج اگرچہ بنیادی اصولِ مذہب کے پیشِ نظر اسلام سے مشابہ ہو تو ہو لیکن جن اثرات کے ماتحت یہ معرضِ وجود میں آیا ان میں عیسائیت اور اسلام سے ضد اور رقابت کے عناصر بھی شامل ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آریہ سماج کا پرچار شروع ہوا۔ اس وقت ہندوستان میں سیاسی بیداری پیدا ہو چکی تھی اور لوگوں میں ملیت کا جذبہ بھی موجود تھا جس کی بنا پر لازمی تھا کہ ہندوستان کی گذشتہ دہ صد سالہ تاریخ کے پیشِ نظر آریہ سماج میں مسلمانوں کے خلاف اس قسم کے خیالات کو جگہ دی جاتی ہے۔

جب دو قومیں آپس میں ملتی ہیں تو وہ ایک دوسری پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان باقی ممالک کے مسلمانوں سے قدرے مختلف ہیں اور یہ اختلاف عملی زندگی میں زیادہ واضح و نمایاں ہے۔ ہندو مذہب کے اثر سے مسلمانوں میں بھی ذات پات کی تمیز آگئی اور کرم دھرم کے نظریہ نے اسلام کے مسئلہ توکل کا حلیہ بگاڑ دیا۔ کرم کا نظریہ یعنی پہلے جنم کے اعمال کی سزا یا جزا موجودہ زندگی میں پانے کا مسئلہ طبائع انسانی کو خواہ مخواہ تقدیر پرست بناتا ہے اور انسان خیال کرنے لگتے ہیں کہ تدبیر سے اس دنیا میں اپنے حالات کو بدلنا ناممکن ہے۔ اس لیے جیسی بھی حالت ہو صبر و تحمل سے رہے جاؤ۔ تقدیر پرست ذاتی کوشش کو بالکل رائگان اور بے فائدہ سمجھتے ہیں۔ اسلامی توکل کا مطلب خدا کی ذات پر بھروسہ کر کے کوشش کرنا تھا یعنی اس یقین سے کوشش کرنا تھا کہ خدا اپنے بندوں کی مدد فرماتا ہے۔ مسلمان "السعی من الایمان" کے قائل تھے۔ اسلامی توکل یہ نہیں تھا کہ انسان خیال کرے کہ سب باتیں پہلے ہی خدا کی طرف سے مقرر ہو چکی ہیں اور وہ یکے بعد دیگرے اس زندگی میں انسانوں کو پیش آتی رہتی ہیں۔ اس قسم کی تقدیر پرستی اور سست حالی نے ہندوستان میں کیا ہندو اور کیا مسلمان سب کو بے ہمت بنا رکھا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور اثر جو مسلمانوں نے ہندوؤں کی صحبت سے قبول کیا وہ آواگون کے مسئلہ کا نتیجہ ہے۔ اس مسئلہ کے مطابق پیدائش اور موت کا سلسلہ لامتناہی ہے اور روحوں کو ان کے اعمال کے مطابق قالب ملتے رہتے ہیں۔ آواگون پر ایمان رکھنے سے انسان پر موت کا ڈر ضرورت سے زیادہ چھا جاتا ہے کیونکہ اسے خوف رہتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس کے موجودہ کرم دوسرے جنم میں حصولِ قالبِ انسانی کے راستہ میں حائل ہوں اور وہ کسی ایسے قالبِ حیوانی میں دھکیل دیا جائے کہ زندگی عذاب بن جائے۔ اس عقیدہ اور پھر اس ضمنی نتیجہ کے امکانات سے خائف ہو کر آدمی موجودہ زندگی کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ چنانچہ یہ خوف عمرِ طویل کی خواہش پر منتج ہوتا ہے۔ اس قسم کی روایات کہ فلاں رشی نے پرانایام کے ذریعہ اتنی عمر پائی

یا محض پر انا یام کی حقیقت ۔ پر یقین کھنا ہندوؤں میں خواہش درازی عمر کی موجودگی کی دلیل ہے ۔طوالت زندگی کے متمنی کو ذلت کا احساس کم ہو جاتا ہے ۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی صحبت سے یہ اثر قبول کیا کہ وہ ہر حالت میں درازیٔ عمر کے خواہشمند ہوگیے ۔ حالانکہ اُن کا عقیدہ بہت مختلف تھا۔ یعنی موت کے بعد بہشت ملتا ہے اور شہید کے لیے بہشت کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے ہیں ۔ یہ ان کا ایمان تھا۔ اس عقیدہ کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان ذلت کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا تھا اور اس کی ہمیشہ یہی خواہش ہوتی تھی کہ وہ شاندار اور پر عظمت زندگی بسر کرے ۔ لیکن ہندی مسلمان میں یہ خواہش اب مفقود ہو چکی ہے اور وہ کم طویل لیکن ہنگامہ پرور عمر پر عمر خضر کو خواہ ذلیل ہی طور پر کیوں نہ بسر کرنی پڑے ترجیح دینے لگا ہے ۔ ہندوؤں میں طویل زندگی پانے کی خواہش کی موجودگی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں آتے دن حملہ آور آتے رہے اور قتل وغارت کے ہنگامے برپا ہوتے رہے جن کی وجہ سے عام مصیبت اور موت نے اُن کو کمزور دل اور زندگی کا حریص بنا دیا۔

مسلمانوں میں بیوہ کی شادی بروئے شریعت جائز ہے اور عیسائیوں میں بھی بیوگاں کی شادیاں ہوتی ہیں ۔ اسلام اور عیسائیت کے اثر سے ہندوؤں میں بھی بیوگان کی شادیاں ہونے لگیں ۔

۱۹۳۱ء کی رپورٹ مردم شماری سے واضح ہوتا ہے کہ ہندو بلحاظ آبادی ترقی نہیں کر رہے لیکن مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو دھرم کے مقابلہ میں اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے اور لوگوں کو بذریعہ تبلیغ حلقہ بگوشِ اسلام کیا جاتا ہے ۔ لیکن ہندو دھرم کی یہ حالت نہیں ۔ اور مذاہب کے پیرو ہندوؤں میں شامل نہیں ہو سکتے کیونکہ آریہ سماج کے سوائے دیگر ہندو فرقے شدھی کے قائل نہیں ہیں ۔ نیچ ذاتوں کے ہندو اکثر حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے رہتے ہیں ۔ اس کی وجہ اسلامی اخوت اور مساوات کی جاذبیت نیز اسلام میں ذات پات اور چھوت چھات

کی عدم موجودگی ہے ۔ نیچ ذاتوں کے ہندو زیادہ تر عیسائیت اختیار کرتے ہیں ۔ اگر کوئی ہندو ایک دفعہ مذہب تبدیل کرلے تو اس کا دوبارہ ہندو ہونا محال ہوتا ہے ۔ کیونکہ اوّل تو اسے شدھ ہونے کی اجازت نہیں ملتی اور اگر اجازت مل بھی جائے تو اُسے ایسی رسوم ادا کرنی پڑتی ہیں جن پر اتنا زیادہ خرچ آتا ہے کہ وہ اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

اگرچہ فرداً فرداً ہندو ہونا محال ہے ۔ لیکن نیچ ذاتوں کا بحیثیت مجموعی آہستہ آہستہ ہندو ہو جانا ناممکن نہیں ۔ اگر کسی نیچ جماعت کے افراد مثلاً مہتر یا چمار کسی ایسے علاقہ میں آباد ہوں جو ہندوؤں کے زیر اثر ہو تو وہ چند سالوں کے بعد ہندوؤں میں شامل ہو جاتے ہیں ۔ پہلے نام ہندوؤں کے رکھے جانے لگتے ہیں ۔ پھر سروں پر چوٹیاں بھی رکھ لی جاتی ہیں ۔ آہستہ آہستہ مُردوں کو جلانے کا رواج بھی اختیار کرلیا جاتا ہے اور اس طرح دوسری یا تیسری نسل تک وہ تمام جماعت بالکل ہندو بن جاتی ہے ۔ اور اُن کا شمار ہندوؤں میں ہونے لگتا ہے ۔ مسلمانوں کے زیر اثر علاقوں میں نیچ جماعتیں اسی طرح مسلمان ہو جاتی ہیں ۔ تبلیغ کے علاوہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ جانے کی دیگر وجوہ حسب ذیل ہیں ۔ اوّل مسلمانوں کی خوراک مقابلتہً بہتر اور ان کا زندگی بسر کرنے کا معیار بلند تر ہے ۔ دوم ان میں بیوگان کی شادی کی ممانعت نہیں ۔ سوم عام طور پر نابالغان کی شادیاں کم ہوتی ہیں ۔ چہارم غربت ۔ کیونکہ یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ جہاں افلاس زیادہ ہوتی ہے آبادی بہت بڑھتی ہے ۔

دکن میں برہمنوں کو بہت زیادہ اقتدار حاصل ہے اس لیے شودروں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جاتا ہے ۔ اگر شودر کا برہمن پر سایہ بھی پڑ جائے تو برہمن بھرشٹ ہو جاتا ہے ۔ اس ذلت سے بچنے کے لیے شودر لوگ مسلمان یا عیسائی ہو جاتے ہیں ۔ اور اس طرح تبدیلی مذہب سے اُن کو آزادی مل جاتی ہے اور وہی براہمن جو اُن سے اس وقت جب کہ وہ دھوتی پہنے ہوتے تھے سخت نفرت کیا کرتے تھے اب اُن سے ہاتھ ملانے اور انہیں اپنے برابر بٹھانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور اُن کے

سایہ سے بھی اُن کے تقدس میں فرق نہیں آتا۔

ہندو دھرم میں افراد کو اہمیت نہیں دی گئی بلکہ تمام ہندو افراد کو جماعتوں میں تقسیم کر کے ان جماعتوں کو درجہ بدرجہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں فردِ واحد کو اہمیت دی گئی ہے اور ہر فرد دوسرے فرد کے برابر خیال کیا گیا ہے۔ خواہ دنیوی حشمت کے لحاظ سے اُن میں کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو۔ ہندو مذہب فلسفیانہ ہے اور صلح و آشتی کی تلقین کرتا ہے اور اس کے نقطۂ نگاہ سے عقیدہ کی نسبت معاشرت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ اس نے عقیدت کی صورت اختیار کر رکھی ہے۔ برخلاف اس کے اسلام کی بنیاد قرآن ہے اور احکامِ قرآنی کے سامنے ہر مسلمان کیلئے سرِ تسلیم خم کرنا ضروری ہے اور انکار کرنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اسلام میں دین اور دنیا دونوں شامل ہیں یعنی اسلام سوشل بھی ہے اور سیاسی بھی اگر کسی موقع پر ہندوؤں کو کسی بیرونی حملہ کی بنا پر سیاسی خطرہ لاحق ہوا تو انہیں مذہب کی بنا پر متفق ہو کر اس کی مدافعت کا بہت کم خیال پیدا ہوا۔ برعکس مسلمانوں کا سیاسی مرکز خلیفہ کی ذات ہے اور اس گئے گذرے زمانہ میں بھی جب کہ خلیفہ اور خلافت مٹ چکے ہیں اگر کسی ملک کے مسلمانوں کو کوئی خطرہ یا مصیبت پیش آتی ہے تو مذہبی لگاؤ کی بنا پر دنیا بھر کے مسلمان آتش زیر پا ہو جاتے ہیں اور وہ مصیبت اور خطرہ دنیائے اسلام کے لیے مشترکہ خطرہ تصور کیا جانے لگتا ہے۔ ہندوؤں میں یہ بات نہ تھی۔ لیکن آریہ سماج کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد ان میں اس قسم کا ایک قومی جذبہ پیدا ہو گیا ہے جسے ہندو مذہبی ملیت کے نام سے موسوم کرنا بہتر ہوگا۔ اس جذبہ کی بنا پر ہندو لیڈر نیچ اقوام سے بھی بہتر سلوک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ان تمام کوششوں کی تہ میں سیاسی مقصد پنہاں ہے۔ کچھ عرصہ ہوا شدھی کی تحریک شد و مد سے شروع کی گئی اور چونکہ یہ ایک سیاسی چال تھی اس لئے مسلمانوں نے بھی اس کے مقابلہ میں تبلیغ کا کام شروع کر دیا اور جب دونوں جماعتوں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا

تو یہ تحریکیں بھی کمزور ہو گئیں - مہاتما گاندھی کی جاری کردہ ہریجن تحریک بھی ایک سیاسی تحریک ہے۔ اس کا مقصد ہندو سوسائٹی کی اصلاح و استحکام ہے اونچی ذات کے ہندوؤں کی بدسلوکی کی وجہ سے ہندوؤں کی نیچ ذاتیں آہستہ آہستہ ہندوؤں سے نکل رہی تھیں اور ان کے اخراج سے ہندو ملی کمزور ہو رہی تھی اس طرح ہندو جاتی کو جو ضعف پہنچ رہا تھا ہریجن ایسی تحریکیں اس کو روکنے کی تدبیریں ہیں - اس قسم کی تدبیروں کی کامیابی ملیت کے نصب العین کو قدرے اور قریب اور قابلِ حصول بنا دے گی۔

تحریک برہمو سماج کے بعد ملیت کی حمایت میں یہ عام خیال پیدا ہو گیا کہ سب مذہب اچھے ہیں - یہ درست ہے لیکن اچھائی کے بھی بہت درجے ہوتے ہیں - بعض مذہب اگر اچھے ہوتے ہیں تو اس کے مقابلہ میں اور مذہب بہت اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور یہ بات اُن خوبیوں اور محاسن پر مبنی ہوتی ہے جن کو پیدا کرنے کی کوئی مذہب تلقین کرتا ہے - ہندو دھرم میں زیادہ زور ذات پات کی رسوم کی پابندی پر دیا گیا ہے - اس کا اثر یہ ہے کہ ہندو عملی زندگی میں اپنے قانون کے ازحد پابند ہو گئے ہیں اور اُن کی عام ذہنیت بھی احترامِ قانون کے حق میں ہے - اسلام میں زیادہ زور خدا کی وحدانیت اور غیر اللہ کے خوف سے بالاتر ہونے پر دیا گیا ہے - اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مسلمانوں میں حریت نفس و فکر کو قائم رکھنے کا جذبہ موجود رہے اور اکثر اُن کی طبیعتیں نڈر ہوتی ہیں - یہی حال سکھ مذہب کا ہے - لیکن اس جذبۂ آزادی اور نڈر طبیعت سے عوام میں بدنظمی کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے - چنانچہ اس کو روکنے کے لیے شرع کی پابندی کی روایات قائم کرنا پڑتی ہیں - چنانچہ اسلام میں افراد کی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ وہ صبر آزما حالات میں بھی شرع کے پابند رہے - برخلاف اس کے جس مذہب میں اس قسم کی روایات کم ہوں لیکن اس سے ٹھوس اور آزاد انسان پیدا ہوتے ہوں بالآخر اس کے پیروؤں میں بدنظمی کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا۔

اسلام اور ہندو مذہب کے ان بنیادی اختلافات کی بنا پر جنہیں مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے نیز گذشتہ ہندو مسلم فسادات کی بنا پر اکثر یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کی کوشش بے معنی ہے اور اس لیے

ہندوستانیوں کا ایک قوم بن کر قومی حکومت قائم کرنا ناممکن ہے۔ لیکن یہ بات غلط ہے اور یہ نتیجہ اکثر و بیشتر سطحی امور کے پیش نظر اخذ کیا جاتا ہے۔ در اصل مذہب جہاں تک اصول کا تعلق ہے کبھی کسی کے درپے آزار نہیں ہو سکتا۔ مذہب کا اصل پیغام ہی صلح و آشتی ہے اور اس کا مقصد دنیا میں امن وامان قائم کرنا ہے۔ لیکن جب چند خود غرض اشخاص اپنی اغراض مشئومہ کے حصول کیلیے مذہب کو آلہ کار بنا لیتے ہیں تو خواہ یہ لوگ پنڈت ہوں یا مولوی مذہب کی حقیقت کو بدل دیتے ہیں۔ چنانچہ مذہب کے اصل اصول کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے اور فروعات کو جن سے غرض برآری میں مدد ملتی ہو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کا مذہب گئو رکھشا ہے اور موخرالذکر کی دشمنی کے باعث اول الذکر کا مذہب گاؤ کشی۔ اسی طرح ہندوؤں کے لیے نماز کے وقت مسجد کے سامنے باجا بجانا ضروری ہو اور مسلمانوں کے لیے یہ شکایت کرنا لازمی کہ شور وغل میں وہ نماز ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ مذہب نہیں محض تعصب ہے اور تعصب ایسی چیز نہیں کہ اس کا قلع قمع کرنا ناممکن ہو۔ تمام جماعتی فسادات اور تنازعات کے اسباب جنہیں اکثر مذہبی رنگ دیا جاتا ہے در اصل اقتصادی نوعیت رکھتے ہیں۔ پارسی تجارت پیشہ ہیں ان کی جماعت ایک متمول جماعت ہے۔ اس کو نہ ملکی حقوق کی ضرورت ہے نہ ملازمتوں میں نمائندگی کی۔ برعکس اس کے اگر یہ بھی ایک غریب جماعت ہوتی تو باقی غریب ہندوستانیوں کی سی ذہنیت کا مظاہرہ کرتی۔ چونکہ پارسی امیر لوگ ہیں اُن کی تمام ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہتی ہیں اس لیے انہیں کسی سے لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تمام تحریکات کی جڑ احتیاج ہے۔ کیا جمہوریت اور کیا اشتراکیت سب اسی کے کرشمے ہیں۔ ہندو مسلم تفرقات کی محرک بھی ان کی پست حالی ہے اور چند دنیا کے بھوکے شہرت اور دولت حاصل کرنے کے لیے اپنی اغراض کے ہاتھوں خود ناچتے ہیں اور غریب ہندوستانیوں کو بھی نچاتے ہیں۔ یہ فسادات جو گاؤ کشی کی وجہ سے یا محرم کے موقع پر آئے دن ہوتے رہتے ہیں تعلیم کے پھیل جانے غربت کے دور ہو جانے اور مذہب کی اصل حقیقت کو پہچان لینے کے بعد بالکل رک جائیں گے۔ ملک جوں جوں سیاسی اور علمی لحاظ سے ترقی کرتا جائے گا ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی آویزشوں کو مذہبی رنگ دینا مشکل ہو جائے گا اور بالآخر عام ہندوستانیوں

کو مذاہب کی بنا پر تقسیم کرنے کی بجائے مختلف اقتصادی مفاد کے پیش نظر تقسیم کرنا پڑے گا۔

گذشتہ ہندو مسلم فسادات کی وجہ سے مایوس ہونا ٹھیک نہیں ایسے فسادات ہوا کرتے ہیں ہندوستان میں فرقہ وار فسادات کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ دو جماعتیں اپنے مذہبی اختلافات کی بنا پر جھگڑ پڑتی ہیں۔ بلکہ ان فسادات کی تہ میں سیاسی اغراض پنہاں ہوتی ہیں۔ ہندو بحیثیت فرزندان وطن اپنے آپ کو سرزمین ہند کے واحد حقدار سمجھتے ہیں۔ اور مسلمان اس وجہ سے کہ انگریزوں سے پہلے وہ یہاں کے حکمران تھے ہندوستان کو اپنی ملکیت جانتے ہیں۔ دونوں جماعتوں کے اس قسم کے دعاوی سیاسی حیثیت رکھتے ہیں نہ کہ مذہبی گذشتہ فسادات کے دوران میں ان دونوں مدعیوں نے اپنی اپنی طاقت کی آزمائش کی اور اگرچہ ایسا کرنا ایک قابل افسوس امر تھا لیکن ناگزیر اور کسی حد تک ضروری بھی تھا۔ اس مرحلہ پر ابھی وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا اس آزمائش کی چندے اور ضرورت ہے یا نہیں۔ خیر جسقدر بھی جو بھی آزمائش ہو چکی ہے اس کا نتیجہ اچھا نکلا ہے۔ یعنی ان فسادات نے ان کثیر التعداد ہندو اور مسلم جماعتوں پر واضح کر دیا ہے کہ وہ متقابل کی حریف ہیں۔ ہندوؤں کو معلوم ہو گیا ہے کہ وہ ہندوستان سے مسلمانوں کا اخراج کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اور خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں کو بھی یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ پرانا عہد ختم ہوا اب ہندوؤں پر حکومت کرنا خارجی کا بارہ نہیں۔ زمانہ بدل گیا ہے یہاں اگر وطنی حقوق ہی مل جائیں تو بڑی بات ہے۔ دونوں جماعتیں ایک دوسری کی طاقت کا اندازہ لگا کر مشترکہ طور پر یہ نتیجہ اخذ کر چکی ہیں کہ نہ ہندو ہندوستان میں دب سکتے ہیں اور نہ مسلمان ہندوستان کو چھوڑ کر کہیں اور جا سکتے ہیں لہذا یگانگت ہم آہنگی اور اتحاد کے بغیر چارہ نہیں اور اگر خدانخواستہ نااتفاقی جاری رہی تو زندگی تلخ ہو جائے گی"۔ ملکی جماعتوں کے باہمی فسادات سیاسی ترقی کی شاہراہ پر ایک مرحلہ ہیں اور اس مرحلہ سے ان کا گذرنا امر مجبوری ہے۔ اقتصادی حالات خود اس کے مقتضی ہیں کسی حد تک تو ہم اس مرحلہ سے گذر چکے ہیں لیکن نہیں معلوم کہ اس منزل کے صعوب ترین مقام ابھی آگے آنے ہیں یا نہیں ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں اگر اس مقام سے ہم گذر چکے ہیں تو فبہا اور اگر ابھی گذرنا ہے تو ہمت مرداں مدد خدا" سب قوموں کو ایسے مصائب برداشت

کرنے پڑتے ہیں۔ مزید برآں ایسے ممالک میں جن کا نظامِ حکومت فیڈرل ہو یا جن کا نصب العین فیڈرل نظامِ حکومت کا قیام ہو لوگوں کا تبعیت و وفاشعاری کا جذبہ مرکزی اور مقامی حکومتوں کے مابین بٹا رہتا ہے بعض مرکزی حکومت سے وفادار رہنے کے حامی ہوتے ہیں اور بعض مقامی حکومت سے ہندوستان میں تبعیت کے لحاظ سے عوام غالباً دو گروہوں میں منقسم ہوں گے۔ اول مرکز کے وفاشعار یعنی خالص ملت پرست۔ دوم مقامی حکومت کے پرستار۔ اول الذکر جماعت زیادہ تر ہندوؤں پر مشتمل ہوگی اور موخر الذکر مسلمانوں پر۔ لہٰذا فیڈریشن کے نکتہ نگاہ سے بھی جماعت بندی لازمی ہے اور چونکہ دیگر ممالک میں جہاں نظامِ حکومت وفاقی ہے۔ اس قسم کی جماعت بندی موجود ہے اس لیے ہندوستان میں اس قسم کی فرقہ داری کا ہونا نہ تو کوئی نئی چیز ہے اور نہ ہی نئی چیز ہوگا۔ لہٰذا فرقہ داری کے قضیۂ نامرضیہ کو اتنی اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ البتہ یہ امر نامناسب ہے کہ کسی تیسرے فریق کی طرف سے اس بارہ میں ترغیب دیے جانے کو گوارا کیا جائے۔ اب تک جتنے فسادات ہوئے ہیں وہ ہندو مسلم فسادات تھے۔ پنجاب میں تیسری جماعت سکھوں کی ہے۔ ابھی تک سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان فسادات نہیں ہوئے اور عین ممکن ہے کہ کبھی بھی نہ ہوں کیونکہ ان دونوں جماعتوں کے اقتصادی مفاد کافی حد تک مشترکہ ہیں۔ لیکن ایک بات سے اندیشہ ہے کہ شاید ان کے باہمی تعلقات کسی وقت عارضی طور پر ناخوشگوار ہو جائیں۔ سکھ اپنے کو فوجی جماعت تصور کرتے ہیں نیز عام طور پر سکھ آبادی کو یہ خیال ہے کہ وہ پنجاب کے مالک ہیں اور جسمانی لحاظ سے بھی باقی جماعتوں کے مقابلہ میں برتر ہیں مسلمانوں کو یہ خیال ہے کہ وہ بلحاظِ آبادی کثیر التعداد ہیں اور بلحاظِ عسکری قابلیت سب سے زیادہ طاقتور ہیں سکھوں اور مسلمانوں کا اس قسم کے ذاتی تفوق کا خیال باعثِ خطرہ ہے اور عین ممکن ہے کہ کسی وقت یہ دونوں جماعتیں محاربی مقابلہ سے اس بات کا فیصلہ کرنے کی ٹھانیں کہ ان میں سے حقیقی طور پر فوقیت کس کو حاصل ہے۔ اگر ایسا ہوا بھی تو نتیجہ اس عام قاعدہ کلیہ سے بہت مختلف نہیں ہو سکتا جس کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ یعنی اپنی اپنی جگہ پر دونوں جماعتوں کو اس امر کا یقین آجائے گا کہ وہ ایک دوسری کو ملیامیٹ کرنے سے قاصر ہیں بہتر

یہی ہے کہ یہ جماعتیں بھی حالات کا جائزہ لے کر اپنی اپنی ذہنیت کو بدل ڈالیں۔ لیکن عامۃ الناس تلخ تجربہ کے بعد ہی نتائج اخذ کیا کرتے ہیں اور پس ماندہ آبادیوں کی اصلاح کے لیے قدرت بھی سیدھے اور وجیہ ذرائع اختیار کرنے کی بجائے ٹیڑھے اور تکلیف دہ طریقے اختیار کیا کرتی ہے۔ افسوس ہے کہ ہم ہندوستانیوں کی اصلاح کے لیے بھی تلخ اور درشت محرکوں کی ضرورت ہے اور قدرت ضرور ان کا استعمال کرتی رہے گی۔ تلخی کے بعد عوام الناس کو خود بخود راست اور درست بات کا احساس ہو جائیگا لیکن قدرت کے لیے عام ہندوستانی جماعتوں کی موجودہ ذہنیت کو بدلنا لازمی ہے خواہ اس کے لیے اُسے کتنا ہی ظلم و ستم کیوں نہ ڈھانا پڑے۔ فرقہ داری سے بچنے کے لیے چارہ سازی ہمارا فرض ہے۔ اگر ہم فرقہ داری کے نتائج کی صعوبت اور نادرستی کو کم کر سکیں تو اس بارہ میں کوتاہی نہیں کرنا چاہیے۔ ملک میں اس وقت نفسا نفسی کا عالم ہے بعض نشستوں کا تحفظ چاہتے ہیں بعض مخلوط انتخابات کے حامی ہیں اور بعض جداگانہ انتخابات کے متمنی ہیں جداگانہ نیابت کیا ہے؟ اس سخت مقام کی شدت کو کم کرنے کی کوشش ہے جو ہندوستان کی ترقی کے رستہ پر واقع ہے برابر کی طاقت رکھنے والے حریف ایک دوسرے کو عزت کی نگاہ سے دیکھ سکتے ہیں۔ اگر ایک کمزور ہو اور دوسرا طاقتور تو طاقتور زبردستی سے کام نکالے گا اور کمزور ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے اُس کا ناک میں دم کرنے کی کوشش کرے گا۔ جداگانہ نیابت فی الواقعہ انتشار انگیز ہے اور اس سے ملتوں کے شیرازے بکھر جاتے ہیں لیکن یہ اس وقت ہوتا ہے جب کسی ملت کی شیرازہ بندی مکمل طور پر عمل میں آ چکی ہو اور اُس کی ضمنی جماعتوں کے لیے جداگانہ نیابت کو اصولِ انتخاب بنا دیا جائے لیکن جس ملک کی آبادی مختلف جماعتوں اور فرقوں پر مشتمل ہو اور وہ جماعتیں اور فرقے اقتصادی و تعلیمی لحاظ سے غیر متوازن ہوں اُس کے لیے سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہوتی ہے کہ تمام آبادی کو ہر لحاظ سے ایک سطح پر لایا جائے تاکہ کسی ایک جماعت کی پس ماندگی تمام کی رفتارِ ترقی پر اثر انداز نہ ہو۔ ہندوستان میں جماعتی توازن قائم کرنا از حد لازمی ہے پس ماندہ جماعتوں کو گھسیٹ کر آگے لانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ ترقی یافتہ جماعتوں کے برابر ہو جائیں اور اُن کی بنا پر مؤخر الذکر جماعتوں کو بوقت

اقدام انتظار کرنے کی ضرورت نہ رہے۔ موجودہ شور و غل جو مخلوط حلقہ ہائے نیابت کے پرستاروں کی طرف سے ہو رہا ہے در اصل کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ اُن کی بے قراری کو ظاہر کرتا ہے نہ کہ تدبر کو۔ جداگانہ نیابت سے تمام جماعتیں اپنی اپنی جگہ مستحکم ہو کر بالآخر اس قابل ہو جائیں گی کہ ان کی شیرازہ بندی کر کے ملتِ ہندیہ کو متشکل کیا جائے لیکن اگر اس بارہ میں عجلت سے کام لیا گیا تو ممکن ہے کہ جماعتوں کے باہمی توازن کے فقدان کی وجہ سے ہماری اس جیسی ملت کا قصرِ حکومت متزلزل ہو کر منہدم ہو جائے ایسے انہدام سے ہماری ترقی رک جائیگی۔ امیدِ عروج بیمِ تنزل سے بدل جائے گی اور پھر کئی صدیوں تک کے لیے غلامی کی تاریکیاں ہم پر از سرِ نو مسلط ہو جائیں گی۔ اگر جماعتیں اس زریں موقعہ سے فایدہ اٹھاتے ہوئے اپنی اپنی جگہ پہ مستحکم ہو جائیں تو اس کے بعد اُن کا اختلاط عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ ایسا اختلاط دیرپا اور درست ہوگا۔ کیونکہ درمیانی عرصہ میں عوام کی سیاسی تربیت بھی ہو جائے گی اور آبادی میں تعلیم یافتوں کی تعداد بھی بڑھ جائے گی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان معاملات میں جن کا اثر ہندوؤں اور مسلمانوں پر یکساں طور پہ ہوتا ہے یہ جماعتیں باہم متفق ہیں اور اُن کے بارہ میں مجالسِ مقننہ میں بھی اُن کے نمائندوں میں اشتراکِ عمل رونما ہو جاتا ہے۔ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں سے جو بدسلوکی ہوتی ہے اس کے بارہ میں ہندو اور مسلمان ایک ہو گئے ہیں۔ غیر ملکی درآمد پر محصول کا سوال اُٹھتا ہے تو ہندو مسلم متفق ہوتے ہیں۔ اگر صنعت کی حوصلہ افزائی کے لیے کوئی تحریک پیش ہوتی ہے تو اس کے متعلق بھی ہندو مسلم نمائندے متحد ہو جاتے ہیں۔ درآمد برآمد یا صنعت و حرفت کے سوال در اصل ایسے معاملے ہیں جن کو مستقبل میں زیادہ اہمیت حاصل ہوگی قانون ساز مجلسوں اور ملازمتوں میں فرقہ دارانہ نمائندگی کا جھگڑا ایک وقتی اور عارضی معاملہ ہے۔ ملک جوں جوں ترقی کرتا جائے گا اس قسم کے جھگڑے کم ہوتے جائیں گے۔ لیکن جماعتی توازن کی ضرورت کے پیش نظر اس وقت ان جھگڑوں کو بھی از حد اہمیت حاصل ہو گئی ہے مگر اُن کی ضرورت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا غلامانہ تنگ نظری اور کاسہ لیسی کی عادت کا اثر ہے + تمام مذہبی جنگوں کی تہ میں خواہ وہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین ہوں

خواہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی اختلافات نہیں ہوتے بلکہ اقتصادی اغراض - ناموری کی خواہش یا نسلی تنفر ایسے محرک ہوتے ہیں۔ مذہب کو صرف آڑ بنایا جاتا ہے۔ موجودہ سیاسی ارتقا جس طریقہ سے عمل میں آ رہا ہے اُس کا یہ بھی ایک خاصہ ہے کہ اس سے اوروں کے مذہبی خیالات کی برداشت اور تحمل کی مشق ہوتی ہے۔ مغرب میں جس کی ہم اس وقت تقلید کر رہے ہیں مذہبی تفرقات کی بنا پر حشر برپا رہا ہے لیکن بالآخر فریقین محاربہ کو مذہب کے بارہ میں مکمل آزادی کے اصول کو تسلیم کرنا پڑا اور آہستہ آہستہ عوام میں بھی برداشت کا مادہ پیدا ہو گیا اور اب حالت یہ ہے کہ عیسائیت کے مختلف فرقوں کے پیروؤں کو سیاسیات میں اپنے مذہبی اختلافات کا کبھی خیال بھی نہیں آتا۔ اقتصادی مفاد نے انہیں متفق و متحد کر دیا ہے۔ مذہب کی بنا پر سیاسی اتحاد قائم نہیں ہو سکتا لیکن سیاسی اتحاد کی خاطر مذہب کو ایسی حیثیت دی جا سکتی ہے کہ اس کی بنا پر یا اس کو آڑ بنا کر ملکی معاملات میں مداخلت کرنا ناممکن ہو جائے۔ نہیں معلوم کہ آئندہ ہندوستان کے سب باشندوں کا ایک مذہب ہو گا یا موجودہ مذاہب اپنے تمام باہمی اختلافات کے ساتھ جوں کے توں قائم رہیں گے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا جائے گا اور اس کی آڑ میں ملی معاملات میں مداخلت نہ ہونے پائے گی۔ اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ہندو مسلم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ اگر غلہ مسلمان پیدا کرتے ہیں تو اس سے چیزیں تیار کرنے کا کام یا اس کو فروخت کرنے کا کام ہندوؤں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اسی طرح کارخانوں میں ہندو مسلم اکٹھے کام کرتے ہیں۔ بعض ہندو ریاستوں میں دیوان مسلمان ہیں اور مسلم ریاستوں میں وزیر ہندو ہیں۔ اگر ملک پر بوجہ قحط سالی یا زلزلہ کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو مصیبت زدگان کی مدد ہندوؤں اور مسلمانوں کی طرف سے متفقہ طور پر کی جاتی ہے۔ کم از کم اس وقت ہندوستانیوں کو اتنا تو علم ہو گیا ہے کہ حکومت کا غیر جانب دار ہونا لازمی ہے اور چونکہ آئندہ حکومت

نمائندہ حکومت ہوگی اس لیے اس کے کارکنوں کے لیے غیر جانب دار ہونا ضروری ہوگا ورنہ وہ اپنی سیاسی و غیر جانب دارانہ حیثیت کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ ملیت کی بنا پر حکومت خود اختیاری کے ارتقا کے بارہ میں جلدی نہیں کرنی چاہیئے۔ رائے عامہ کی نہایت سرعت سے تربیت ہو رہی ہے اور اس تربیت کے لیے اگرچہ عوام کے لیڈر ذمہ دار نہیں تاہم جو خوش توقعات اس سے وابستہ ہیں ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ رائے عامہ کی تربیت کی وجہ دیگر ممالک سے ہندوستان کے تعلقات کا قیام اور ان کی ترقی کی رفتار کا علم ہے۔ ہندوستانیوں کو یہ احساس پیدا ہو چکا ہے کہ وہ اور ملکوں کے لوگوں کے مقابلہ میں پس ماندہ ہیں ان کا یہ احساس ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے مہمیز کا کام دے گا۔ دیر آید درست آید۔ لیکن یہاں دیر سے مراد صرف چند سالوں کی دیر ہے۔ امید ہے کہ نئی اصلاحات کے نفاذ کے بعد چند سال نہیں گذرنے پائیں گے کہ مختلف جماعتوں کی ذہنیت اس قدر بدل جائے گی کہ ماسوائے دوربین اشخاص کے عام لوگ اس کا تصور نہیں کر سکتے۔ موجودہ فرقہ داری کے گرد و غبار سے اگرچہ اس وقت فضا تاریک ہو رہی ہے لیکن اس کو بٹھانے کے لیے مشترکہ اقتصادی مفاد کی بنا پر عام خوشحالی کی بارش کے چند قطرے کافی ہوں گے۔

یہ سوال کہ آئندہ کا مذہب کیا ہوگا ایک ایسا سوال ہے جو صرف موجودہ حالات کی بنا پر یعنی اس لیے کہ مذہب کو اس وقت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مستقبل کے ہندوستان میں بسنے والی آئندہ نسلیں موجودہ حالات کا تصور بھی نہیں کر سکیں گی اور ہمیشہ یہ سمجھنے سے قاصر رہیں گی کہ ایسے لایعنی سوالات کو جنہیں مذہب سے دور کا بھی واسطہ نہ ہوتا تھا کیونکر اتنی اہمیت حاصل ہو جایا کرتی تھی۔ ہندوستان بھر کا ایک مذہب نہیں ہوگا۔ بعض کا مذہب اسلام ہوگا بعض کا ہندو دھرم۔ کیونکہ مسلمانوں کا تمام ہندوؤں کو مسلمان کر لینا یا ہندوؤں کا تمام مسلمانوں کو ہندو بنا لینا ناممکن ہے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ البتہ یہ عین ممکن ہے کہ مغربیت کے اثر

سے بود و ماند کے طریقے یکساں ہو کر انہیں ایک دوسرے سے اتنا قریب کر دیں کہ اُن کے دلوں میں مذہبی اختلافات کا احساس ہی نہ رہے۔ جوں جوں وقت گذرتا جائے گا سکھوں کی ظواہر پرستی میں کمی آتی جائے گی اور وہ ہندوؤں میں شامل ہوتے جائیں گے اور ہندوؤں میں اُن کی حیثیت ایسی ہی ہوگی جیسے جینیوں یا بدھوں کی ہے۔ لیکن اُن کی شمولیت محض سیاسی ہوگی۔ جینیوں یا بدھوں کو بذاتِ خود اتنی سیاسی اہمیت حاصل نہیں لیکن سکھ اپنی سیاسی اہمیت کو بدستور برقرار رکھ سکیں گے۔

حکومت خود اختیاری ہندوستان میں عیسائیت کے لیے ایک ضرب کاری ثابت ہوگی اور دیسی عیسائیوں کا اس بارہ میں اضطراب بے معنی نہیں۔ بعض خاص اخراجات کی مدات جوں جوں مرکزی مجلس کی رائے کے تابع ہوتی جائیں گی عیسائیت کی اہمیت کم ہوتی جائے گی۔ اس وقت حکومت عیسائیت کی پشت و پناہ ہے اور عیسائیوں کی اکثریت ہندوستانیوں کی نیچ ذاتوں پر مشتمل ہے۔ غالباً یہ لوگ مذہبی لحاظ سے پھر ہندوستانیوں میں شامل ہونے کی طرف رجوع کریں گے اگر ان کا یہ رجحان ہوا جو اغلب ہے تو ان کی زیادہ تعداد مسلمانوں میں شامل ہوگی۔ کیونکہ ہندو جاتی میں شامل ہونا اپنے کو پھر نیچا کرنے کے مترادف ہوگا۔ عیسائیت کے فیض سے دیسی عیسائی تعلیم یافتہ اور روشن دماغ ہو گئے ہیں اور وہ ہندو دھرم میں شودر کی حیثیت سے شامل ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ البتہ آریہ سماج بشرطیکہ انہیں اعلےٰ ذات دینے کے لیے تیار ہوا تو ممکن ہے کہ انہیں شدھ کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن آریہ سماج کے سوا باقی ہندوؤں میں ذات پات کی سختی اس قدر زیادہ ہے کہ اگر دیسی عیسائیوں کو ہندو جاتی میں اعلےٰ حیثیت مل بھی گئی تو وہ اس سے تا دیر تمتع اندوز نہیں ہو سکیں گے۔ دو تین نسلوں کے گذرنے کے بعد تفویض کردہ کوئی ایسی حیثیت اُن سے چھن جائے گی۔ برخلاف اگر وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تو انہیں اس قسم کا خدشہ نہیں ہوگا۔ لہذا یہ اغلب ہے کہ نمائندہ حکومت کے قیام سے دیسی عیسائی مسلمان ہو جائیں۔ نیچ

اقوام اس وقت ہندوؤں میں سے نکل کر عیسائیوں اور مسلمانوں میں شامل ہو رہی ہیں۔ ایسی حالت میں ولیسی عیسائی ہندوؤں میں شامل ہو کر پھر نیچ بننے کے لیے کیونکر تیار ہو سکتے ہیں۔

ایک اور خیال جس کا کچھ عرصہ ہوا شمالی ہندوستان میں چرچا تھا پاکستان کی تجویز تھی۔ اس تجویز کا لب لباب یہ تھا کہ شمال مغرب میں واقع تمام مسلم علاقوں کو ملا کر ایک علیحدہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ خیال اس بنا پر کہ ان تمام صوبوں اور علاقوں میں ہم زبان اور ہم مذہب آبادی کی اکثریت ہے کچھ معقول نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک غلط نظریہ ہے۔ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو آجکل کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ البتہ یہ بڑی بڑی حکومتوں کے درمیان سرحدوں کا ضرور کام دیتی ہیں۔ اور اُن کی ہستی کو محض مربیانہ التفات کے طور پر قائم رہنے دیا جاتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ آئندہ کی حکومت خود اختیاری کی بنا اس طریقہ سے ڈالی جائے کہ تمام صوبوں کا ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی اقتصادی اور سوشل ایک ایسا تعلق قائم ہو جائے کہ اُن کے علیحدہ ہونے کا بالکل امکان نہ رہے۔ اگر ہندوستان بھر کی ایک ملی حکومت قائم کی جائے تو باقی ملتوں کی نظر میں اسے اہمیت اور عزت حاصل ہو گی اور اگر کوتاہ اندیشی سے مسلمانوں اور ہندوؤں نے علیحدگی کی ٹھانی تو عین ممکن ہے کہ اس لامرکزیت کی وجہ سے کسی اور غیر ملکی جماعت کو دندان آز تیز کرنے کی تحریک و تحریص ہو۔ وسعت کے لحاظ سے شائد اس وقت صرف ایک چھوٹی حکومت ہے جس نے دنیا سے اپنا لوہا منوایا ہے۔ جاپان کے بعد کوئی اور چھوٹی ریاست نہیں جس کو عزت و عظمت حاصل ہو۔ یورپ ایشیا کی سب چھوٹی چھوٹی ریاستیں کسی شمار و قطار میں نہیں ہیں۔ پاکستان یا کسی اور ایسی قلب شکن تجویز پر عمل کرتے ہوئے اگر ہندوستان کو دو یا تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تو یہ فعل ہندوستان کی اہمیت کو کم کر دے گا۔ پاکستان کی تجویز اس لیے بھی ناقابلِ عمل ہے کہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد بنگال میں آباد ہے۔ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں اہمیت حاصل ہے تو اس کی وجہ

یہ ہے کہ ۲۲ کروڑ ہندوؤں کے مقابلہ میں اُن کی تعداد ۷ ۳/۴ کروڑ ہے اور اتنی آبادی کو اکثریت رکھنے والی آبادی کسی طرح نہ تو زیر اثر لا سکتی ہے اور نہ ہی دبا سکتی ہے۔ ۸ کروڑ کی آبادی ایک نہایت قوی اور مستحکم اقلیت ہوتی ہے۔ اگر پاکستان کی تجویز کے مطابق شمال مغربی تمام علاقے ہندوستان سے علیحدہ کر دیے جائیں تو کیا ان کی تائید میں بنگال بھی علیحدگی کا خواہاں ہوگا یا باقی ہندوستان کے ساتھ شامل رہے گا۔ اگر علیحدہ ہونے کی ٹھانے گا تو اس کے پامال ہونے کا اندیشہ ہوگا اور اگر شامل رہے گا تو باقی ہندو ہندوستان کے مقابلہ میں جس کی اقلیت نہایت کمزور اقلیت ہوگی اور وہ پھر کبھی نہیں اُٹھ سکے گا۔ اگر تبادلہ آبادی کی تجویز کی جائے گی تو یہ دہلی سے دیوگری کا سفر ہوگا اور کوئی شخص اس دلخراش تاریخی واقعہ کے اعادہ کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ مسلمانوں کی اہمیت کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان بھر میں ان کی مجموعہ آبادی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ علیحدگی کی تجاویز خود مسلمانوں کے لیے باعثِ پریشانی ثابت ہوں گی۔ باقی صوبوں میں جو چند فیصدی مسلمان آباد ہیں اُن کی طرف سے بھی کسی ایسی تجویز کی شدید مخالفت لازمی ہے۔

ہندوؤں کا اس خیال سے وابستہ خدشہ کہ ہندی مسلمانوں کو سرحد سے لیکر قسطنطنیہ تک کے غیر ملکی مسلمانوں کی ہمدردی و اعانت حاصل ہے ایک بے بنیاد اندیشہ ہے۔ ہندی مسلم کا سرحد پار کے مسلمانوں سے کبھی سیاسی اتحاد نہیں ہو سکتا۔ زمانہ ماسبق میں اگر پنجاب کے مسلمان سرحد پار سے کمک آنے کی امید کر لیا کرتے تھے تو اس کی بھی ایک وجہ تھی اور وہ یہ کہ ان کی تعداد ہندوستان میں کم تھی اور ہندوؤں کے مقابلہ کے لیے وہ غیر ملکی مسلمانوں سے حمایت کے خواہاں ہوا کرتے تھے۔ ایک اور وجہ جس کی بنا پر ہندوستان کے مسلم سرحد پار درخواستِ امداد بھیج دیا کرتے تھے یہ تھی کہ اس وقت کی حکومت کا کئی صدیوں سے ایران و افغانستان سے تعلق چلا آتا تھا اور حکومت کے اس تعلق کی بنا پر ہندی مسلم کا غیر ملکی مسلموں سے رابطہ اتحاد بڑھا ہوا تھا۔ لیکن اب ان

کی تعداد اتنی کافی ہے کہ وہ پنجاب سرحدی صوبہ سندھ وغیرہ میں کسی غیر ملکی جماعت کو اپنے سر پہ لا بٹھانے کی کسی تجویز سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ مزید براں ہندی الاصل مسلم جن کی مسلمانوں میں بہت زیادہ اکثریت ہے سرحد پار کے تمام تعلقات کو گذشتہ ایک دو صدیوں کے دوران میں بالکل بھول چکا ہے اور مذہب کے سوا کوئی اور اقتصادی یا سیاسی ایسا مفاد نہیں جو اس ٹوٹے ہوئے رشتہ کو از سرِ نو جوڑ دینے کا مجاز ہو۔ اس وقت ایشیا میں جتنی بھی مسلم حکومتیں ہیں ان سب کی موجودہ حکمتِ عملی یہ ہے کہ فرداً فرداً استحکام حاصل کیا جائے۔ ان کے باہمی تعلقات ٹوٹ چکے ہیں۔ نہ ہندی مسلم کے پاس اتنا وقت اور طاقت ہے کہ ان کی کچھ مدد کر سکے نہ ان کو اتنی فرصت ہے کہ وہ اپنا گھر اوروں کے سپرد کر کے اس کی آواز پہ لبیک کہتے ہوئے چلے آئیں۔ انگریزوں سے پہلے مسلم حکومت کی بنا پر ہندی مسلموں کا سرحد کے اس طرف کے مسلمانوں سے رابطۂ اتحاد تھا۔ زبان اور تہذیب بھی ایک تھی۔ تمام درے آنے جانے والوں کے لیے کھلے تھے۔ لیکن اب زبان بدل گئی ہے۔ فارسی کا رواج جاتا رہا ہے۔ ہم مغربیت کی طرف مائل ہیں۔ بھلا ہمیں افغانستان فارس عرب اور ترکی سے کیا واسطہ۔ ہندوستان کا مسلم باوجود آزاد نہ ہونے کے باقی دنیا کے مسلمانوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ ہندی الاصل مسلمان جو بھروسہ ایک ہندو پر کر سکتا ہے وہ پٹھان پر نہیں کر سکتا۔ کنایتہً یہ کہہ دینا بیجا نہیں ہوگا کہ ہندو بوجہ اس پرخاش کے جو ان کو دیگر محکوم جماعتوں کی طرح انگریزوں سے ہے اور مسلمان بوجہ ہم مذہب ہونے کے اگر افغانستان سے ہمدردی کریں یا اس سے ہمدردی کے متوقع ہوں یا کسی سیاسی مقصد کے پیش نظر اس پر بھروسہ یا انحصار یا اعتماد کریں تو ایسا کرنا نہ صرف ایک غلطی بلکہ ایک سخت حماقت ہوگا۔ آئے دن نئی سیاسی اصلاحات کی تفویض اور ہندوستان کا آزادی کے نصب العین کی طرف بتدریج اقدام افغانستان کے لیے باعثِ خطرہ ہے اور افغان مدبرین بھی اس خطرہ سے غافل نہیں ہو سکتے۔ افغانستان کی آزادی صرف

اُسی حالت میں محفوظ رہ سکتی ہے جب کہ ہندوستان پر کسی ایسی قوم کی حکومت ہو جو ہندوستانیوں سے کسی ایک بات میں بھی متشابہ نہ ہوا اور اُن سے اپنے تصرفات اور امتیازات کی بنا پر ہمیشہ خائف رہے۔ جب کبھی ہندوستان پر ہندوستانیوں کی اپنی حکومت ہوگی یا کسی ایسی ملکی جماعت کی حکومت ہوگی جو ہر لحاظ سے ہندوستانی ہو چکی ہو تو وہ ہندوستان کے امن وامان اور تحفظ کی خاطر لازماً افغانستان کے بارہ میں مغلوں کی اس حکمت عملی پر کاربند ہوگی جس کی تقلید میں سکھ بھی جلال آباد تک کے علاقہ پر قابض ہو گئے تھے۔ تاریخ اس حکمتِ عملی کی موزونیت اور مناسبت کی شاہد ہے۔ مسلمانوں کا افغانستان سے خوشگوار توقعات رکھنا اپنے پر کم اعتمادی کی دلیل ہے۔ ان کا سرحدی اقوام سے اپنی امیدیں وابستہ کرنا بھی تاریخ کو جھٹلانا ہے۔ حضرت اسمٰعیل شہید کی قربانی وایثار اور سرحدیوں نے ان سے جو سلوک کیا مسلمانوں کے پیش نظر رہنا چاہیے۔ ایک قوم جس کا گذارہ لوٹ مار پر یا رشوت ستانی پر ہو کبھی قابل اعتماد نہیں ہو سکتی۔ افغانستان کی ہستی کا دارومدار کبھی حکومتِ برطانیہ اور کبھی سوویٹ روس سے ساز وباز پر ہے۔ افغانستان کو نہ تو ہندوستان سے نہ روس اور برطانیہ سے ہمدردی ہو سکتی ہے وہ صرف اُسی کا بہی خواہ اور دوست ہو سکتا ہے جو اُس کی مٹھی گرماتا رہے۔ ہندوستان میں خواہ ہندو راج ہو خواہ مسلم راج افغانستان ہر دو کے لیے باعثِ زحمت ہوگا۔ اور یہاں کے امن وامان کی خاطر مغلوں اور سکھوں کی تقلید لازمی ہوگی۔ عین ممکن ہے کہ افغانستان کو بھی اس کا احساس ہو اور وہ ہندوستان کو اصلاحات کی تفویض کے خلاف ہو۔

البتہ یہ بات ممکن ہے کہ کسی وقت پنجاب کے ساتھ سندھ کو شامل کرنے کی ضرورت پیدا ہو جائے اور وہ بھی اس کے شمالی حصہ کو + پنجاب میں ترقی کی رفتار بہت تیز ہے اور عین ممکن ہے کہ کچھ عرصہ کے گذرنے کے بعد یہاں صنعت وحرفت کافی ترقی کر جائے اور اس وقت پنجاب کو براہِ راست سمندر تک پہنچنے کی ضرورت ہو اور اس ضرورت کے تحت خود حکومتِ ہند کو یہ

احساس پیدا ہو کہ پنجاب اور سندھ کو خوش اسلوبی کار کے پیش نظر ایک مقامی حکومت کے تحت رکھنا بہتر ہے۔ اس امکان کو ممکن ہے کہ سندھ کی مزید آبپاشی کے مسئلہ کے پیش نظر اور اہمیت حاصل ہو جائے سندھ اور پنجاب کا پانی مشترکہ ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اگر آبپاشی کی کوئی سکیم تعمیر کرنے کی تجویز ہوتی تھی تو اس کے لیے حکومتِ پنجاب اور حکومتِ بمبئی میں اس بنا پر کہ صوبہ بمبئی کی مقدار بہم رسانی آب پر اثر نہ پڑے کشمکش شروع ہو جاتی تھی۔ مثلاً بھاکرا بند کی تعمیر کے متعلق حکومتِ ہند سے اپیل کرنی پڑی تھی۔ لہذا زراعت کی توسیع اور صنعت کی ترقی سے عین ممکن ہے کہ پنجاب اور سندھ کو آپس میں ملحق کر دیا جائے۔ تاکہ حکومتِ پنجاب اپنے دریاؤں کے پانی کی اس طرح تقسیم کرے کہ سندھ کے لیے بھی کافی پانی بچ رہا کرے۔ ایک اور بات جس کی بنا پر پنجاب اور سندھ کے الحاق کی ضرورت پیش آئے گی یہ ہے کہ پنجاب کی نوآبادیاں جو نہروں کے ذریعہ سے سیراب ہوتی ہیں اس وقت نہایت سُرعت سے سیم زدہ ہو رہی ہیں۔ سیم زدگی اور تھور کی بنا پر ان نوآبادیوں کے کافی رقبے غیر آباد ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ ماہرین کا خیال ہے ان علاقوں میں زراعت کی عمر کسی صورت میں تیس سال سے متجاوز نہیں ہو سکتی اور اس عرصہ کے گذرنے کے بعد یہ تمام علاقے سیم زدگی کی بنا پر ناقابلِ کاشت ہو جائیں گے۔ اگر ماہرین کا یہ قیاس درست ہے اور سیم زدگی کے بڑھنے کو روکنا بھی ناممکن ہے تو پنجاب کی توسیع اور آبادی کے انتشار کی ضرورت لازمی ہو گی۔ سندھ کے رقبہ پر آبادی کا بار اتنا زیادہ نہیں جتنا کہ پنجاب کے رقبہ پر ہے۔ سیم زدگی کو روکنے کی غرض سے بہم رسانی آب کی مقدار کی شدت کو کم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ رقبہ پر سے آبادی کے بار کو کم کر کے بہم رسانی آب کے مطالبہ میں کمی کی جائے۔ آبادی کے بار کو کم کرنے کے لیے باشندگان کی کچھ تعداد کو کہیں اور بھیجنے کی ضرورت ہو گی۔ اس قسم کی زائد آبادی سے سندھ کی اراضیات آباد ہو سکتی ہیں۔ نیز بہم رسانی آب کی مقدار میں کمی کرنے سے جو پانی بچے گا وہ سندھ

کی وسیع پیمانے پر آب پاشی کے لیے استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ اس وقت سندھ کی علیحدگی کے خلاف یہ عذر ہے کہ وہ ایک علیحدہ حکومت کے اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔ علیحدگی سندھ ہو چکی ہے۔ عین ممکن ہے کہ عملی تجربہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ واقعی سندھ اپنے اخراجات پورے کرنے سے قاصر ہے زرعی و صنعتی مفاد کے پیش نظر سندھ کی پنجاب کے ساتھ شمولیت ایک مفید خیال ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مہاراج رنجیت سنگھ صاحب کا بھی یہ خیال تھا کہ سندھ کا پنجاب کے ساتھ الحاق ملکی مفاد کے پیش نظر بہتر ہے۔ اگر اس زمانہ میں اس نکتہ رس حاکم کو اس میں بہتری نظر آتی تھی تو کیا یہ ممکن نہیں کہ عملی تجربہ کے بعد مہاراجہ مذکور کا خیال درست ثابت ہو۔ اور سندھ اور پنجاب کا مشترکہ مفاد ان کے الحاق کا مطالبہ کرے۔ اگر پنجاب نے صنعتی ترقی کر لی تو سندھ یا سندھ کے شمالی حصّہ کے الحاق کا سوال ہندوؤں کی طرف سے پیدا کیا جائے گا۔ کیونکہ صنعتی ترقی سرمایہ داری کی دست نگر ہے اور یہ خدمت پنجاب میں ہندو ہی سرانجام دے سکتے ہیں۔ زراعتی ترقی کے پیش نظر یہ مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے ہوگا کیونکہ کاشتکار اور زمیندار مسلم ہیں۔ زراعت کی نیز صنعت کی ترقی سے بندرگاہ اور سمندر سے براہ راست تعلق کے قیام کی ضرورت محسوس ہوگی۔ الحاق سندھ کے اس امکان پر غور کرنے کے لیے ہندو مسلم کے باہمی تعصبات سے بلند ہونے اور زمانہ مستقبل میں پنجاب کی صنعتی و زراعتی ترقی کی بنا پر آبادی کے مشترکہ مفاد کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ صنعتی و زراعتی ترقی کے بعد پنجابیوں کو اپنی تیار شدہ اشیا اور پیداوار کے لیے ملک کے دیگر حصوں میں اور دیگر ممالک میں بھی منڈیاں تلاش کرنے کی ضرورت ہوگی جس کے لیے پنجابی کراچی کے ذریعہ ساحلی جہازرانی اور ساحلی تجارت کو اپنے ہاتھ میں لینے کے خواہاں ہوں گے۔ اس وقت کے حالات کے تحت.... پنجابی ہندو کی طرف سے اس بارہ میں اقدام ہوگا۔ ساحلی جہازرانی اور تجارت پر قبضہ جمانے کی خاطر مسلم۔ الحاق سندھ کے حق میں ہوں گے۔ کھانڈ کی صنعت سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ پنجابی

ہندو صنعت و حرفت کے میدان میں کس قدر زیادہ اقدام کر سکتا ہے۔ پنجاب کا ۵ اکروڑ روپیہ کھانڈ کے کارخانوں پر ہندوستان بھر میں لگا ہوا ہے اور اگر مرکزی حکومت نیا ٹیکس لگا کر صنعت شکر سازی کی حوصلہ شکنی کا باعث نہ بنتی تو اب تک پنجاب نے اس صنعت پر اور زیادہ سرمایہ لگا دیا ہوتا۔ نئی اصلاحات کے نفاذ کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر کسی اس قسم کے مشترکہ رجحان کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔

سندھ کا تمام رقبہ تقریباً ریگستان ہے۔ سوائے اس علاقہ کے جس میں سے دریائے سندھ گذرتا ہے یا جہاں پانی کی موجودگی کی وجہ سے کچھ آبادی ہو گئی ہے + علاقہ سندھ میں داخل ہونے کے بعد دریائے سندھ میں کوئی ایسے معاون نہیں گرتے جن سے دریا کے اردگرد کچھ فاصلہ تک علاقہ کی آبپاشی ممکن ہو سکے۔ دریائے سندھ بھی کناروں سے باہر اچھل کر اردگرد کے علاقہ کی آبپاشی اس طرح جس طرح دریائے نیل کی طغیانی سے ہوتی ہے نہیں کرتا ہے۔ نیز سندھ مون سون ہواؤں کی پہنچ سے باہر ہے۔ اوسط سالانہ بارش ۴ انچ سے زیادہ نہیں۔ لہٰذا اس کی زرعی ترقی پنجاب کی ہمدردی کے بغیر نہایت دشوار ہے۔ لیکن اگر اسے پنجاب کے ساتھ ملا دیا جائے تو حکومتِ بمبئی کے مقابلہ میں حکومتِ پنجاب اپنی انہار کی توسیع سے اور پنجاب کے مطالبہ بہم رسانی آب میں کمی کر کے سندھ کی مزید آبپاشی کا زیادہ بہتر انتظام کر سکتی ہے۔ اگر آبپاشی کا انتظام خاطر خواہ ہو جائے تو سندھ کی نہ صرف ترقی ممکن ہے بلکہ یہ اپنے اخراجات ادا کرنے کے بعد منافع بھی دے سکتا ہے۔

پنجاب کی گندم اور سرسوں وغیرہ کی تجارت کے بڑھ جانے کی وجہ سے لاہور سے کراچی تک ریلوے لائن بنانے کی ضرورت پیش آئی تھی اور چونکہ بعد میں یہ تجارت اور بھی ترقی کر گئی اس لیے دوہری ریلوے لائن بنانی پڑی۔ کراچی گندم کی برآمد کے لیے ہندوستان بھر میں اول درجہ کی بندرگاہ ہے

اور یہ درجہ اُسے صرف پنجاب کی گندم کی تجارت کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ سندھ اور پنجاب کے الحاق کے حق میں کہا جا سکتا ہے کہ سندھ جغرافیائی لحاظ سے پنجاب سے ملحق ہے نہ کہ بمبئی سے۔ اس کے اور صوبہ بمبئی کے باقی حصے کے درمیان سمندر کا ایک بہت بڑا ٹکڑا جسے رن کچھ کہتے ہیں حائل ہے۔

سندھ کی آبادی ۲۵ لاکھ کے قریب ہے اور پنجاب اور بمبئی کی آبادی تقریباً برابر ہے۔ سندھ کا کل رقبہ ۴۷۰۰۰ مربع میل ہے۔ پنجاب کا کل رقبہ ۱۳۴۰۰۰ مربع میل ہے۔ بمبئی کا کل رقبہ بمعہ سندھ ۱۸۸۰۰۰ مربع میل ہے اور اگر اس میں سے رقبہ سندھ کو نکال دیا جائے تو یہ ۱۴۱۰۰۰ مربع میل رہ جاتا ہے۔ اگر رقبہ سندھ کو پنجاب میں شامل کر دیا جائے تو پنجاب کا رقبہ ۱۸۱۰۰۰ مربع میل ہو جاتا ہے یعنی بمبئی اور سندھ کے رقبہ سے ۷۰۰۰ مربع میل کم۔ لیکن اگر نصف رقبہ سندھ کو پنجاب میں شامل کیا جائے تو پنجاب کا رقبہ ۱۵۷۵۰۰ مربع میل ہوتا ہے اور بمبئی کا رقبہ ۱۶۴۵۰۰ مربع میل رہ جاتا ہے۔ ان اعداد و شمار کے پیش نظر سندھ کے شمالی حصے کو پنجاب کے ساتھ شامل کر دینے سے بلحاظِ وسعت زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ صوبہ بمبئی بہت لمبا صوبہ ہے کوئی ۲ ہزار میل لمبا اور سندھ اُس کے عین شمال میں واقع ہے یعنی ایک سرے پر محلِ وقوع کی وجہ سے وہ مرکز سے اتنا دور ہے کہ اس دوری کا اثر اس کی ترقی پر پڑتا رہا ہے شروع ہی سے اسے یا تو ایک الگ صوبہ ہونا چاہیے تھا یا اس کے کل رقبہ کو پنجاب میں شامل کر دیا جانا چاہیئے تھا۔ بمبئی سے سندھ کی بذاتہٖ علیحدگی اگرچہ مکمل ہو چکی ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آئندہ حالات کے پیش نظر بحیثیت صوبہ اس کی علیحدگی کہاں تک درست ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے سندھ کے اقتصادی مفاد پنجاب کے ساتھ وابستہ ہیں نصف سندھ کو پنجاب کے ساتھ شامل کرنا سندھ کے لیے مفید نہیں۔ کل سندھ کا الحاق پنجاب سے ہونا اس کے حق میں زیادہ مفید ہے۔

پنجاب اور سندھ کے باہمی اقتصادی مفاد کی بنا پر عین ممکن ہے کہ کسی وقت پنجاب اور سندھ کے

الحاق کا سوال پھر کامیابی سے اُٹھایا جائے + لیکن یہ خیال کہ شمال مغربی مسلم علاقے غیر ہندوستانی
مسلم ملکوں سے کسی قسم کا رشتۂ اتحاد جوڑ سکیں گے ایک وہم اور بے معنی خیال ہے۔ اس خیال
کے بودے پن کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس وقت پنجابی مسلم باوجود اپنی غلامی کے اتنا بے عمل اور
ذہنی طور پر بے حس نہیں جتنا کہ ایران یا عرب یا مصر کے مسلمان ہو چکے ہیں۔ باوجود آزادی کے مسلم
ممالک نے مغرب کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ترقی نہیں کی اور اپنے کیا داخلی اور کیا خارجی معاملات میں انہوں
نے اپنی خود اختیاری حکومتوں سے کچھ فائدہ نہیں اُٹھایا ہے محض آزادی کی بنا پر اُن کو ہندی مسلم
پر ترجیح دینا ایک غلط دلیل ہے۔ اگر آج ہم کو حکومتِ خود اختیاری مل جائے اور ہم کم از کم اپنے
اندرونی معاملات کے بارہ میں آزاد ہو جائیں تو اس اندرونی آزادی کی تفویض کے چند سالوں بعد شمال مغربی
علاقوں کی مسلمانوں اور غیر ملکی مسلمانوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آنے لگے گا۔ دیکھنے والوں کو خود بخود اس
امر کا احساس ہوگا کہ ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا رہا اور وہ حقیقت کو دیکھنے سے قاصر رہے۔ اس وقت
لوگ محض لاعلمی کی بنا پر ہندی مسلم پر ایشیائی و افریقی مسلموں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہندوستانی و دیگر
جماعتوں کو جس مسلم خطہ کے متعلق ایسے شکوک ہیں اُس کا مرکز پنجاب ہے۔ صوبجاتی حکومت خود
اختیاری کے ملنے کے بعد یہاں کے باشندوں میں بہت جلد احساس برتری پیدا ہو جائے گا۔
اور اس کے اسباب جو اس وقت اپنا عمل نہیں دکھا رہے ہیں یہ ہیں + صوبہ پنجاب کی مقامی ترقی قریبًا
پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہے۔ وہ ذرائع جن سے کسی ملک کو استحکام حاصل ہوتا ہے اسے حاصل ہیں۔
لیکن ان سے ابھی مناسب طریقہ پر کام لینا شروع نہیں کیا گیا۔ پنجاب میں ریل کا ایک مکمل سلسلہ
موجود ہے جس نے اس کے مختلف حصوں کو باہم ملحق کر رکھا ہے۔ ایشیا بھر میں ایسا ذریعۂ آمد و
رفت جس کی شاخیں ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی ہوں اور کہیں موجود نہیں۔ پنجاب کے پانچوں
دریا اس کی قدرتی دولت ہیں۔ ایسے دریا کسی اور ملک کو شاذ ہی نصیب ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ حکومت

نے انہار آبپاشی کے کئی سلسلے جاری کر رکھے ہیں ستلج ویلی پراجیکٹ اور ایسی دیگر انہار کا تمام صوبہ میں جال بچھا ہوا ہے۔ ان کے علاوہ آبپاشی کی وہ تجاویز بھی ہیں جو اگرچہ ابھی تک خیالی ہیں لیکن چونکہ عوام کی توجہ اُن کی طرف مبذول ہو چکی ہے اس لیے ایک نہ ایک روز ضرور حقیقی ہو کر رہیں گی مثال کے طور پر بھاکڑا بند سکیم ہے۔ اس پر عوام کی توجہ مرکوز ہے۔ جس دن بھی یہ سکیم معرض وجود میں آئی دنیا بھر میں عدیم المثال ہوگی۔ ایسی سکیموں کی تعمیر و تکمیل سے اس علاقہ کو اور بھی چار چاند لگیں گے۔ ہائیڈرو الیکٹرک سکیم کی تعمیر و تکمیل ہو چکی ہے اور اب اس سے کام لیا جانے لگا ہے۔ جوں جوں وقت گذرتا جائے گا ہمیں اس کو استعمال کرنے کی استعداد نیز ذرائع استعمال بھی حاصل ہوتے جائیں گے۔ جب ہم اس برقی طاقت کو جو ہائیڈرو الیکٹرک سکیم سے پیدا ہو سکتی ہے مکمل طور پر استعمال میں لانے کے قابل ہو جائیں گے تو اس کا بھی صوبہ کی زراعت اور صنعت و حرفت پر بہت مفید اثر پڑے گا۔ یہ سب ذرائع ترقی جب خدمتِ خلق کے شائق اور ملک کے ہمدرد لوگوں کے ہاتھوں میں چلے جائیں گے تو اس تبدیلی سے ترقی کی رفتار تیز ہو جائیگی اور بہت خوشگوار نتائج برآمد ہونگے اور چند سالوں کے اندر اندر اس تمام علاقہ کی حالت۔ نیز یہاں کے باشندوں کی ذہنیت بالکل بدل جائے گی۔ اس وقت غیر ملکی مسلموں کے مقابلہ میں ہندی مسلم جتنا معیب نظر آتا ہے اتنا ہی نجیب ہو جائے گا۔ ملکی ارتقا سے اس کا اسلامی ممالک سے کوئی ایسا سیاسی اتحاد جو ہندی مفاد کے منافی ہو ناممکن بن جائیگا اور اس کو خود اس امر کا احساس ہو جائے گا کہ پس ماندہ اسلامی ممالک سے اس کی وابستگی خود اس کے لیے نقصان دہ ہے۔ اسلامی ممالک اس پر کسی قسم کا اثر ڈالنے کی بجائے خود اس کی مثال کی پیروی کرنے کے متمنی ہوں گے غیر ملکی مسلموں کے مقابلہ میں ہندی مسلم پہلے ترقی کرے گا۔ کیونکہ ترقی کے سب وسیلے اس کو تیار ملیں گے حکومت خود اختیاری سے وہ ان وسیلوں کو منفعت بخش طریقہ پر استعمال کر سکے گا + اسکا یہ احساس کہ ترقی کے لحاظ سے وہ دیگر اسلامی ممالک سے آگے ہے اسے ان سے کسی قسم کا سیاسی اتحاد

کرنے سے روکے گا۔ ایشیائی و افریقی پس ماندہ ممالک سے رشتۂ اتحاد جوڑنے کی ضرورت شمال مغربی مسلم علاقہ کو شاید اس وقت پیش آئیگی جب کہ ہندوستان میں ہندی مسلموں سے زکوۃ لینے کا مستحق کوئی نہ رہے گا۔

مزید برآں اس وقت تک تجارت صنعت اور زراعت کی ترقی سے شمال مغربی مسلم علاقوں کے تعلقات ہندوستان کے دیگر صوبوں سے اس قدر محکم اور گہرے ہوچکے ہوں گے کہ کسی کو اُن کے توڑنے کا مقدور نہیں ہوگا۔ اگر غیر ملکی اشیا کی درآمد بند ہوجائے اور ملک میں مصنوعات بننی شروع ہوجائیں تو ان صنعتی نیز زراعتی اشیا کی تجارت کے لیے سب سے پہلے اندرونِ ملک منڈیاں تلاش کرنی پڑیں گی اور یہ کافی تعداد میں مل سکتی ہیں۔ اگر شمال مغربی علاقوں کی زرعی و صنعتی اشیا کی درآمد ہندوستان کے دیگر صوبوں میں شروع ہوجائے اور وہاں کی ایسی دیگر اشیا جن کی مانگ اوّل الذکر کو ہو مثلاً بنگال کا کوئلہ ورسن سنگڑہ وغیرہ ایسی اشیا یہاں آنی شروع ہوجائیں تو اس قسم کا تجارتی تعلق ہندوستان بھر کو آپس میں گانٹھ دے گا اور اس ایک مشترکہ اقتصادی مفاد کی وجہ سے متعاہدین میں سے کسی ایک کے لیے علیحدگی اختیار کرنا ناممکن ہوجائیگا۔ کیونکہ اس سے اُسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوگا۔

ہم یہ کسی طرح باور نہیں کرسکتے کہ ہندوستانی مسلموں کا غیر ہندوستانی مسلموں سے کسی قسم کا اتحاد ہونا ممکن ہوسکتا ہے۔ مذہبی یکسانیت کی بنا پر ہمدردی ہوسکتی ہے لیکن اس ہمدردی کو حب الوطنی پر تفوق نہیں دیا جاسکتا۔ ایک اور خیال جو پیدا ہوچکا ہے لیکن ابھی تربیت پاکر پروان نہیں چڑھا مشرقیت کا خیال ہے۔ ہند میں حکومت خود اختیاری کے استحکام سے ہندی مسلم غیر ملکی مسلموں سے ہمدردی کرے گا لیکن اس کی ہمدردی موجودہ زمانہ کی مقابلہ میں زیادہ عملی لہذا زیادہ کارآمد اور مفید ہوگی۔ اور اس ہمدردی کا اظہار ہندوؤں کی اعانت۔ اشتراک اور مخلصانہ رضامندی سے ہوگا کیونکہ اتحاد بین المسلمین سے متعلقہ مغرب کے خدشات اور زرد اقوام کے خطرہ کی پرورش مشرقیت کی گود میں ہورہی ہے۔ اور مشرقیت تمام ایشیائی ممالک کے مختلف مفادوں کا حاد مشترک ہے جس سے ہندو، جاپانی، چینی، ترک وعرب اور ایرانی گویا کہ سب لگاؤ رکھتے ہیں۔

باب پنجم

ذات پات کی تمیز

ذات پات کی تمیز

باب چہارم کے مطالعہ سے واضح ہو گیا ہو گا کہ ہندو دھرم کا خمیر مذہب اور سماج کی آمیزش سے اُٹھایا گیا ہے۔ ملیت کے نکتۂ نگاہ سے اہم مذہبی امور اور اُن کے اثرات کا مختصر بیان ہو چکا ہے لیکن سماج کا بیان اور اُس سے مترتب ہونے والے اثرات کی تحقیق و تدقیق ابھی باقی ہے۔ ہندو سماج کا سب سے نمایاں پہلو ذات پات کی تمیز اور جاتی میں برہمن کی عزت و توقیر ہے۔ ذاتوں کی ابتدا کے متعلق کئی ایک نظریے قائم کیے گئے ہیں لیکن ان میں سے دو قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل خود ہندوستانیوں کا نظریہ۔ یہ نظریہ منو شاستر میں درج ہے اور اس کے مطابق ہندوؤں کی چار ذاتیں برہمن کھشتری ویش اور شودر با ترتیب برہما کے منہ بازوؤں رانوں اور پاؤں سے پیدا ہوئیں۔ ان چاروں ذاتوں کو اُن کے درجہ کی مطابق کام سپرد کیے گئے۔ برہمنوں کا کام شاستروں کا مطالعہ گیان دھیان تپسیا وغیرہ تھا۔ کھشتریوں کا فرض برہمن اور دیگر ذاتوں کی حفاظت کیلئے یدھ کرنا تھا۔ ویشوں کے ذمے بیوپار زراعت اور ساہوکارہ ایسے کام تھے۔ شودروں کا فرض اوّل الذکر تینوں ذاتوں کی خدمت بجا لانا تھا۔ ان ابتدائی چار ذاتوں کے باہمی ازدواجی تعلقات سے آگے اور ذاتیں پیدا ہوئیں۔ اس کے بعد سر ڈینزل ایبٹسن کا نظریہ ہے۔ اس کی رو سے ذات پات کی تمیز کے ارتقا کے پانچ مرحلے ہیں۔ (اوّل) آغاز میں سوسائٹی کی مختلف قبیلوں میں تقسیم جیسا کہ عام طور پر ہر ملک میں ہوا ہے (دوم) ان لوگوں کے جتھے جو آبا و اجداد سے ایک ہی پیشہ کرتے آئے ہوں

یعنی گلڈز (سوم) برہمنوں کی حد سے زیادہ منتا۔ (چہارم) اعلیٰ حسب و نسب کا فخر۔ (پنجم) اس فخر کی بیاہ شادیوں کی رسوم چھوت چھات کی پابندیوں اور مختلف جاعتوں کے باہمی اختلاط سے متعلقہ قیود کے ذریعہ سے برقراری۔

ہندوؤں میں ذات پات کی موجودگی کوئی انوکھی بات نہیں۔ دوسرے ممالک اور دوسری اقوام میں بھی کسی نہ کسی صورت میں اس قسم کی تمیز خواہ وہ ذاتوں کے ذریعہ سے کی گئی ہو خواہ سوسائٹی کو مختلف درجوں میں تقسیم کرنے کے ذریعہ سے عمل میں لائی گئی ہو مروج رہی ہے۔ یونانیوں میں فرقے موجود تھیں۔ اہل روما بھی ذاتوں کے مترادف مختلف گروہوں میں منقسم تھے۔ جاپانیوں کا بھی پہلے یہی حال تھا۔ نہ صرف ان مختلف ممالک کے لوگ ذات پات کی تمیز کی بنا پر ہندوستانیوں سے ملتے جلتے تھے بلکہ ذات پات کے تفصیلی امور مثلاً بیاہ شادی کے رسم و رواج میں بھی ہندوؤں سے مشابہ تھے۔ اہل روم عام طور پہ دو گروہوں میں منقسم تھے۔ ایک عوام (پیلبین) اور دوسرے خواص (پٹیریشن) عوام کی شادیاں خواص کے ساتھ نہ ہو سکتی تھیں اور اس امتیاز کو دور کرنے کے لیے عوام کو ایک طویل عرصہ تک خواص کے خلاف جدوجہد جاری رکھنی پڑی تھی۔ یہی حال اہل یونان کا تھا۔ ایک ذات کے یونانی دوسری ذات کے یونانیوں سے شادیاں نہ کر سکتے تھے۔ ہندوؤں کا یہ رواج کہ اعلیٰ ذات کے ہندو مرد نیچ ذات کی ہندو عورتوں سے شادیاں کر سکتے ہیں اہل روما میں بھی پایا جاتا تھا۔ درجہ خواص کے مردوں کی شادیاں عوام کی عورتوں سے ہو سکتی تھیں۔ اور جس طرح ہندوؤں میں بیاہ کے بعد بیوی کی ذات وہی متصور ہوتی ہے جو خاوند کی ہو اہل روما میں بھی عورت کی ذات وہی تصور کی جاتی تھی جو اُس کے خاوند کی ہو۔ یعنی جس طرح ہندوستان میں ایک برہمن کھشتری عورت سے شادی کر سکتا ہے اسی طرح اہل روم میں بھی خواص کے طبقہ کا کوئی مرد عوام کے طبقہ کی عورت سے شادی کرنے کا مجاز تھا۔ اس قسم کی شادی سے عورت کی ذات نیز اُس کے

بطن سے پیدا ہونے والی اولاد کی ذات بھی جس طرح ہندوؤں میں ہوتا ہے وہی متصور ہوتی ہے جو مرد کی ذات ہو۔ اسی طرح اہلِ روما میں بھی مرد کی ذات کو اُس کی بیوی اور اولاد کی ذات سمجھا جاتا تھا۔ اور اس سے اولاد کے حقوقِ وراثت پر کسی قسم کا اثر نہ پڑتا تھا + اہلِ روما کی کھانے پینے سے متعلقہ پابندیاں مردے جلانے کی رسوم اور مندروں سے خارج کرنے کے رواج بھی ہندوؤں کے ایسے ہی رواجوں سے ملتے جلتے تھے۔ باشندوں کی مختلف گروہوں یا ذاتوں میں اس قسم کی تقسیم قدیم یونانیوں اور جاپانیوں میں بھی موجود تھی۔ لیکن اب یہ جماعت بندی نہ تو یونانیوں میں رہی ہے اور نہ ہی جاپانیوں میں اور نہ ہی اہلِ روما کی اولاد موجودہ باشندگانِ اٹلی میں + ایران کی پرانی کتب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی عوام کو چار گروہوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

اگرچہ دیگر ممالک میں بھی عوام کو ذاتوں اور گروہوں میں تقسیم کیا گیا لیکن ہندوستان میں یہ عمل اتنی دیر تک جاری رہا کہ عوام کی لاتعداد ذاتیں بن گئیں۔ دوسرے ممالک میں عوام کی مختلف جماعتیں ایک عارضی تقسیم کے بعد پھر آپس میں مل گئیں۔ لیکن ہندوستان میں برہمنی اقتدار نے اس قسم کے اختلاط کو روکا۔ برہمنوں نے "محکمی جستن زتدبیرِ نفاق" کے اصول کے مطابق عمل کیا اور آہستہ آہستہ سوسائٹی کو توڑ کر چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کرتے رہے۔ آگنی کل اچھوتوں کی چار ذاتیں برہمنوں کے طفیل ہی معرضِ وجود میں آئیں۔ دوسرے ممالک میں مذہبی پیشوا سیاسی وسماجی کاموں میں پیش پیش تو رہے لیکن وہاں کوئی ایسی جماعت پیدا نہ ہو سکی جو برہمنوں کی طرح اپنے اقتدار کو صدیوں تک متواتر قائم رکھنے کے علاوہ اسے بطور حق وراثت اپنی اولاد کے لیے بھی چھوڑ جاتی۔ ہندوستان کی تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ آغاز سے لے کر اخیر تک برہمنوں کا اقتدار ماسوا اس زمانہ کے جب کہ ہندوستان بھر میں بدھ مت پھیل گیا ہے کبھی کم نہیں ہوا۔ دوسرے ممالک میں کبھی کسی جماعت کو نہ تو ایسا استحکام اور اقتدار حاصل ہوا ہے اور نہ ہی محض پیدائش کی وجہ سے کسی شخص

کو برہمن کا سا درجہ فوقیت حاصل ہوا ہے اور قوموں میں دولت وحشمت کی فراوانی یا کمی کی وجہ سے کسی شخص کا سوسائٹی میں درجہ بدل سکتا تھا لیکن ہندوستان میں جنم کو ایسی اہمیت دے دی گئی کہ برہمن کے گھر جنم پانے والا خواہ اخلاقی طور پر کتنا ہی گرا ہوا کیوں نہ ہو برہمن ہی رہتا ہے اور شودر کے گھر خواہ دیوتا بھی جنم لے شودر ہی رہے گا۔ ذات دوسری اقوام میں ارتقا کے رستہ کی ایک منزل تھی جس پر سے گذرنے کے بعد انہوں نے ذات کے امتیازات کو مٹا کر یکرنگی اختیار کر لی۔ لیکن ہندوستان میں سائٹی اس منزل میں قدم رکھنے کے بعد آگے نہ بڑھی اور سیاسی ارتقا کا سلسلہ بجائے اس کے کہ ایک دفعہ شروع ہو جانے کے بعد جاری رہتا جیسا کہ دوسرے ممالک میں ہوا فوراً رک گیا اور عوام کی تمام تر توجہ آگے قدم اٹھانے کی بجائے ذات پات کی منزل میں ہی رہ کر اپنے کو مزید حصوں میں تقسیم کرنے کی طرف لگ گئی۔ یہ درست ہے کہ اگر کوئی بات خاص حالات میں مفید ثابت ہو اور اس پر عمل شروع کر دیا جائے تو بعد میں ان حالات کے بدل جانے پر بھی جبکہ اس پر عمل کرنے کی قطعاً ضرورت نہ ہو اس پر متواتر عمل کیا جاتا ہے لیکن ہندوستان میں ذات پات کی تمیز کے مطابق عمل کرنے کو اتنا زیادہ عرصہ تک جاری رکھا گیا کہ ایسا کرنے کی ضرورت نہ تھی ایسے غیر ضروری تسلسل کی مثال کسی اور ملک میں نہیں ملتی ہے جو رواج ایک دفعہ شروع ہو جائے وہ پھر آسانی سے بند نہیں ہو سکتا۔ قدامت پرستی کا جذبہ اس کی اعانت کرتا ہے اور لوگ اس کو بدستور قائم رکھنے پر مصر ہوتے ہیں۔ ہندوؤں میں ذات پات کی تمیز جب ایک دفعہ قائم ہو گئی تو قدامت پرستی کی وجہ سے اسے اور بھی تقویت ملی۔ اور آہستہ آہستہ اس کو اتنی اہمیت حاصل ہو گئی کہ اب اگرچہ سیاسی نکتۂ نگاہ سے یہ سخت نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے لیکن اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو گیا ہے۔ برہمنوں پر یہ الزام دیا جاتا ہے کہ ذات پات کی برقراری کے لیے وہ ذمہ دار ہیں۔ یہ الزام اگرچہ غلط نہیں لیکن اس وقت جیسا کہ ہم آگے چلکر بیان کریں گے برہمن اس کی برقراری کے لیے ذمہ دار نہیں ہیں۔ خود لوگ اس کو اب چھوڑنا نہیں چاہتے۔ قدامت پرستی کی روح

اس کے حق میں ہے۔ ملیت کے لیے یگانگت و یکسانیت کی ضرورت ہے۔ اور ذات پات کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہوتے جاتے ہیں اور چھوت اور بیاہ شادی کی پابندیوں کی بنا پر نہ صرف ایک دوسرے سے الگ ہی رہتے ہیں بلکہ متنفر بھی۔ ملیت کے قیام کے لیے اگرچہ ذات پات نقصان دہ ہے لیکن ایک تاریخی نظیر موجود ہے جس سے اس بارہ میں حوصلہ افزائی ہوتی ہے کہ ممکن ہے کہ ذات پات کی تمیز ہنگامی ضرورت کی بنا پر اڑ جائے۔ پہلے زمانہ میں ذاتیں بدل سکتی تھیں۔ برہمن شودر اور شودر برہمن ہو سکتے تھے۔ لیکن بعد میں برہمنوں کا اقتدار جوں جوں بڑھتا گیا ذاتیں بدلنے کا دستور بھی کم ہوتا گیا حتیٰ کہ بدھ کے زمانہ کے قریب برہمنوں کو اتنا اقتدار حاصل ہوا کہ وہ سوسائٹی پر چھا گئے اور انہوں نے رسم ورواج کی پابندیوں سے لوگوں کو اس طرح جکڑ دیا کہ وہ تنگ آ گئے۔ چنانچہ جب مہاتما بدھ نے برہمنوں کی زبان سنسکرت کو چھوڑ کر پراکرت میں اپنے مذہب کا پرچار شروع کیا تو عوام فوراً برہمن مذہب سے باغی ہو کر اُن کے پیرو بن گئے اور بہت کم عرصہ میں بدھ مت ہندوستان بھر میں رائج ہو گیا۔ مہاتما بدھ ذات پات کے قائل نہ تھے اور انہوں نے لوگوں کو ذات پات کی قیود سے نجات دلائی۔ اور برہمنوں کا کوئی پرسان حال نہ رہا۔

گرو نانک اور بعد میں گرو امر داس صاحب نے جو سکھوں کے تیسرے گرو ہیں ذات پات کی تمیز کو اُٹھا دینے کی کوشش کی۔ موخر الذکر نے دیکھا کہ ذات پات کی وجہ سے چھوت اس قدر زیادہ بڑھی ہوئی ہے کہ ان کے پیرو خواہ ایک ہی کنبہ سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں کھانا کھانے کے لیے اپنا اپنا چوکا علیحدہ بناتے ہیں اور اس سے جماعت میں سوائے انتشار کے کوئی اور بات پیدا نہیں ہوتی چنانچہ لوگوں کو اس کے مہلک اثرات سے بچانے کے لیے انہوں نے عام اعلان کر دیا کہ وہ اپنے ایسے پیروؤں سے ملاقات نہیں کریں گے جنہیں سنگت کے ساتھ ایک جگہ بیٹھ کر پرشاد چکھنے سے پرہیز

ہوگا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ سکھوں میں ذات پات کی تمیز اور چھوت چھات دور ہوگئی ۔ اس سے ان میں عمومیت کی روح پھیلی مساوات بڑھی اور اتفاق پیدا ہوا۔ لیکن افسوس عام ہندو سوسائٹی تک اس کے اثرات سرایت نہ کر سکے ۔ موجودہ وقت میں لوگ اقتصادی و سیاسی پسماندگی کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے ہیں اور وہ ایسے اثرات کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں جن سے غربت اور سیاسی افتاد کا علاج ممکن ہو ۔ اگر کوئی علاج ہو سکتا ہے تو اس سے ذات پات کی تمیز اور دیگر متعلقہ رسم و رواج کا ایثار کرنا لازمی آتا ہے ۔ اگر ان دونوں اصولِ ملیت دنیا بھر میں ہر دل عزیز ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس اصول پر کاربند ہونے سے لوگوں نے اپنی عملی زندگی میں بہت فائدہ اٹھایا ہے ۔ مختلف ملکوں کے باشندوں نے ملیت کا جذبہ پیدا کر کے نہ صرف دنیا سے خراجِ تحسین حاصل کیا ہے بلکہ اپنی خوشحالی کو بھی چار چاند لگائے ہیں ۔ اس وقت ہندوستانیوں کی نظریں بھی اس نصب العین کی طرف اٹھ رہی ہیں ۔ اور ان میں اس کے حصول کی خواہش دن بدن بڑھ رہی ہے ۔ جذبۂ ملیت ذات پات کی قیود سے سوسائٹی کو نجات دلا سکتا ہے اور ذات پات کی زنجیروں کا ملیت کی آگ میں پگھل کر سیّال مادہ کی طرح بہ جانا بھی ممکن ہے ۔ یہ اصول خواہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اپنی انتہائی صورت میں نقصان دہ اور بدزیب ہوتا ہے ۔ ذات پات کا اصول ایک غائت حد سے تجاوز کر چکا ہے ۔ اس کی تنسیخ یا ترمیم لازمی ہے ۔ جہاں تک ترمیم کا تعلق ہے ملیت کے اثر کے بڑھنے سے مستقبل قریب ہی میں اس کی ترمیم ہو جائیگی ۔ لیکن کلی تنسیخ کے لیے کچھ عرصہ اور انتظار کرنا پڑے گا ۔ ملیت کے قیام کے لیے نہ صرف ہندو جاتی نے اندرونی طور پر ذاتوں کی نفی سے یکسانی پیدا کرنی ہے بلکہ اس نے مسلمانوں اور عیسائیوں سے بھی مل کر اپنے تمام ان اختلافات کو دور کرنا ہے جو ہندوستان کی سیاسی ترقی کی راہ میں حائل ہیں ۔ ہندوؤں مسلمانوں اور عیسائیوں کے باہمی تعاون سے پیشتر ذات پات کی تنسیخ اور ہندو جاتی کا اندرونی کلی اتحاد لازمی ہے ۔ اسلام

کے سب اصول جمہوریت پر مبنی ہیں اور ان کی وجہ سے مسلمان جمہوریت پسند واقع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی ذہنیت ملیت پرستی کے جذبات سے بھی مملو ہے۔ عیسائی بھی ملت پرست اور جمہوریت پسند واقع ہوئے ہیں۔ سکھ بھی مذہبی لحاظ سے جمہوریت پسند ہیں۔ لیکن ہندو ذات پات کی وجہ سے اخوت و مساوات کے قائل نہیں اور نیچ ذاتوں کا دعوائے ہمسری اُن کی سرشت کے خلاف ہے۔ اُن کی یہ غیر جمہوری ذہنیت ملیت کے اصول کے نقیض ہے۔ لہٰذا ملت کے قیام سے پہلے اُن کے لیے ذات پات کی تمیز کو چھوڑنا لازمی ہے۔ ملت ہندیہ کے قائم کرنے کے لیے ہندو مسلم کا اتحاد عمل میں آنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ ذات پات کی تمیز کو اُڑا کر خود ہندوؤں کے درمیان یگانگت پیدا کرنا مشکل ہے لیکن اگر ہندو حقیقتاً ملکی ترقی کے خواہاں ہیں تو اُن کو ذات پات کی تمیز کو چھوڑنا پڑے گا۔ موجودہ حالات کی روش سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذات پات کو چھوڑ رہے ہیں۔ ہندو مسلم کا سوال جو اس وقت ہندوستان میں پیدا ہو رہا ہے ہندوؤں کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنے ذاتی تفرقات کو بالائے طاق رکھ کر مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک ہو جائیں۔ ایک بڑی دقت جس کی بنا پر ہندو ذات کی قیود سے تنگ آئے ہوئے ہیں یہ ہے کہ بعض ہندو ذاتوں میں لڑکیوں کی کثرت ہے اور لڑکوں کی کمی۔ اور چونکہ ذات پات کی تمیز کی وجہ سے مختلف ذاتیں آپس میں شادیاں نہیں کر سکتیں اس لیے اچھے بر ملنے مشکل ہو گئے ہیں لہٰذا ہندوؤں کو بڑے بڑے جہیز دینے پڑتے۔ اسی دقت کی وجہ سے کسی زمانہ میں ان میں دختر کشی کی رسم جاری تھی۔ لیکن موجودہ زمانہ میں وہ اس قسم کی رسم کے اجرا سے اس مشکل سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا وہ اس معاشرتی تکلیف کی وجہ سے ذات کا ایثار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ ذات پات کی تمیز ملک کی نہ صرف سیاسی بلکہ صنعتی ترقی کے لیے بھی مضر ہے۔ کیونکہ یہ پیشہ کے آزادانہ انتخاب کے بھی مانع ہے۔ ایک شخص

کسی خاص کام کے لیے بہت زیادہ موزوں ہوتا ہے لیکن اس کی ذات اس کو اس پیشہ کے اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اس طرح اس کی قدرتی استعداد اور لیاقت سے بالکل فائدہ نہیں اُٹھایا جاسکتا۔ ہندوستانیوں کے موجودہ رجحانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ذات پات کی گرفت روز بروز کمزور ہو رہی ہے اب لوگوں میں پیشہ اختیار کرنے کے بارہ میں آزادی پیدا ہو گئی ہے اور وہ اپنے ذاتی پیشوں کو چھوڑ کر دوسرے پیشے اختیار کرنے کی طرف نہایت دلیری سے مائل ہو رہے ہیں۔ برہمنوں کا ذاتی پیشہ شاستروں کا مطالعہ اور بھکشا لینی ہے۔ لیکن مردم شماری کی رپورٹوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس ذاتی پیشہ کو ترک کر رہے ہیں۔ ۱۹۰۱ء میں بنگال کے ۱۷ فی صدی اور بہار کے ۸ فی صدی برہمن ایسے تھے جنھوں نے اپنے ذاتی پیشہ کو قائم رکھا تھا۔ ۱۹۱۱ء کی رپورٹ مردم شماری سے ظاہر ہوتا ہے کہ برہمنوں کی کل تعداد کا تقریبًا پانچواں حصّہ ایسا ہے جو اب تک اپنے آبائی پیشہ کو اختیار کیے ہے۔ ۱۹۱۱ء کی بنگال کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق وہاں کے برہمنوں نے زراعت کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ مغربی اور مرکزی بنگال میں کاشتکار برہمنوں کی تعداد آبائی پیشہ پر قائم رہنے والے برہمنوں کی تعداد کے مقابلہ میں دوگنی ہے۔ شمال مغربی بنگال میں برہمنوں کا چوتھا حصّہ۔ بہار میں اُن کا ساتواں حصّہ اڑیسہ اور چھوٹے ناگپور میں اُن کا دسواں حصّہ بھکشا وغیرہ پر گزارہ کرتا ہے۔ اس طرح دوسری ذاتیں مثلاً چمار جولاہے تیلی کمہار وغیرہ اپنے آبائی پیشوں کو ترک کر کے اور پیشے جو مقابلتًا زیادہ باعزت ہوں اختیار کر رہے ہیں۔ برہمنوں سے متعلقہ مذکورہ اعداد سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت ملّی اور جمہوری خیالات کی توسیع کی مخالفت برہمنوں کی طرف سے نہیں ہو رہی کیونکہ وہ ذات کی جہاں تک اس کا پیشہ سے تعلق ہے عملی زندگی میں خود تنسیخ کر رہے ہیں + برہمنوں کی طرح ہندوؤں کی اور اُونچی ذاتیں بھی ایسے پیشے اختیار کر رہی ہیں جن کو کسی وقت حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

ہندوؤں کی ہمسائیگی سے مسلمانوں میں بھی اگرچہ ذات پات کی تمیز آگئی ہے لیکن انہوں نے ہندو دھرم سے چھوت چھات کے مسئلہ کو اخذ نہیں کیا ہے۔ جہاں تک بیاہ شادی کا تعلق ہے اگرچہ ایک ذات کے مسلمان دوسری ذات میں شادی نہیں کرتے۔ لیکن اس وقت اپنی ہی ذات میں شادی کرنے کا رواج ان میں کمزور ہو رہا ہے۔ مسلمانوں میں ذات پات کی تمیز جہاں تک تفاصیل کا تعلق ہے ہندوؤں کی ذات پات کی تمیز سے مختلف ہے۔ کسی ہندو لڑکی کی شادی کے لیے پڑوہت کو کسی ایسے ناتے کی تلاش ہوتی ہے جس کی ذات تو وہی ہو جو لڑکے کی ہے لیکن اُس کی گوت لڑکے کے والدین کی گوتوں سے مختلف ہو۔ مسلمانوں میں شادی کے معاملہ میں اس قسم کی تمیز نہیں کی جاتی۔ چچازاد ماموں زاد خالہ زاد بہن بھائیوں کی آپس میں شادیاں ہو سکتی ہیں۔ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں کی بعض ذاتوں میں بیوگان کی شادیاں نہیں ہوتی ہیں مثلاً راجپوت ایسی لحاظ سے مسلم راجپوتوں اور مسلم جاٹوں میں یہ فرق ہے کہ مسلم راجپوت بیوہ کی شادی نہیں کرتے لیکن جاٹوں میں بیوہ کی شادی ہو جاتی ہے۔ لیکن اب جس طرح ہندوؤں میں بیوگان کی شادی کا رواج ہو رہا ہے مسلمان راجپوت بھی بیوگان کی شادیاں کرنے لگے ہیں۔ نیز اپنی ہی ذات میں شادی کرنے کا رواج بھی مسلمانوں میں کمزور ہو رہا ہے۔ اور مختلف ذاتوں کے مسلمان اب شادی کے معاملہ میں زیادہ آزادی سے کام لینے لگے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ جہاں تک وطنیت کا تعلق ہے ہندو ملیت پسند ہیں کیونکہ ہندوؤں کے لیے سمندر پار جانا مذہبی طور پر ممنوع ہے اور سمندر پار جانے والے ہندوؤں کو ذات سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ یہ رسم کہ سمندر پار واقع غیر ممالک میں جانے والے ہندو بھرشٹ ہو جاتے ہیں اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ ہندوؤں کو وطن سے ایک خاص اُنس ہے جس کی بنا پر ترک وطن کرنے والے ہندو جاتی سے گر جاتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ اس وطنی علاقہ کی وجہ

سے آپس میں متحد ہیں۔ انہیں آپس میں اس قسم کی وطن پرستی کی بنا پر ایسی وابستگی نہیں کہ جسے ملیت کے جذبہ کا مترادف یا بدل کہا جا سکے۔ ذات پات کی تمیز سے ہندوؤں کے مختلف طبقوں کا کلی طور پر انطباق عمل میں نہیں آیا۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کے تمام طبقے مذہبی اور سیاسی نقطۂ نگاہ سے مساوی ہیں۔ مسلمان نہ صرف سیاسی آزادی کے حصول کے مقصد کے پیش نظر ملیت پسند واقع ہوئے ہیں بلکہ اُن کی ملیت پسندی اس بالغ النظری کی بنا پر جو انہیں مذہب کی طرف سے عطا ہوئی ہے اپنی حدود سے تجاوز کر کے حُب الخلقی کے درجے کو پہنچ چکی ہے۔ ہندو ذات پات کی بندھنوں کی وجہ سے خلافِ جمہوریت اور خلافِ ملیت جذبات کا حامل ہے۔ ملتِ ہندیہ کے قائم ہونے سے پیشتر ہندوؤں کا اندرونی اتحاد مکمل ہونا لازمی ہے۔ سیاسی وسعتِ نظر جو اس وقت ان میں مفقود ہے اور مسلمانوں میں فطرتاً موجود ہے جب تک تمام ہندوستانیوں میں یکساں طور پر پیدا نہیں ہو جائے گی ہندوستان کی ملی آزادی کا معاملہ کھٹائی میں پڑا رہے گا۔ ذات پات کے رسم و رواج میں حالات کے مطابق تبدیلی اور ترمیم ہوتی رہی ہے۔ موجودہ سیاسی حالات ممکن ہے کہ ذات پات پر اپنا اثر ڈالنے میں کامیاب ہو جائیں اور ہندو ذات پات کی کوئی ایسی شکل عمل میں لائیں جو دورِ حاضرہ کی سیاسی ضروریات کے مطابق ہو۔ اگر ذات پات میں کوئی ایسی تبدیلی کرنا ممکن ہو اور ہندو جاتی موجودہ وقت کی طرح غیر مسلطح نہ رہے تو ملیت کے ارتقا کا دوسرا مرحلہ آسان ہے۔ یعنی ہندو اور مسلم اتحاد ممکن ہے۔ اور اُن کے باہمی تعاون کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ متعاہدین سیاسی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے برابر ہوں۔ موجودہ ملکی بیداری کی بنا پر ممکن ہے کہ یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ چونکہ ہندو مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ سرگرم کار ہیں اس لیے اُن کی سیاسی تربیت مقابلتاً زیادہ ہو چکی ہے۔ اُن کی موجودہ سرگرمیوں کی بنا پر کوئی ایسا نتیجہ اخذ کرنا ایک سطحی اثر کو اہمیت دینے کے مترادف ہے۔ ہندوؤں

کی سیاسی سرگرمی کی وجہ ان کا یہ احساس ہے کہ وہ سیاسی تربیت کے لحاظ سے پس ماندہ ہیں۔
برعکس اس کے مسلمانوں کی مقابلتاً خاموشی، ورجمود اس امر کی دلیل ہے کہ ان کا نفس اجتماعیہ غیر شعوری
طور پر اس حقیقت سے واقف ہے کہ ان میں وہ سیاسی پختگی جس سے سیاسی تحریکات کو کامیابی
نصیب ہوا کرتی ہے موجود ہے۔ اس وقت مسلمانوں کی سیاسی مساعی کے راستہ میں ہندو جاتی
کی بے تنظیمی حائل ہے۔ مسلمانوں کی قوت کا راس وقت ظاہر ہوگی جب اُن کے باقی وطنی بھائی
بھی اس قابل ہو جائیں گے کہ اُن کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہو کر اُن سے اشتراکِ عمل کر سکیں۔ اس
وقت ہندوؤں کی تمام سرگرمیاں اور شورشیں اس اندرونی اتحاد کی ضرورت کی راہبر ہیں جو ذات پات
کی تمیز کی وجہ سے اس وقت تک ان میں مفقود و معدوم ہے۔ ہندو جاتی کو اس امر کا احساس ہو چکا ہے
کہ وہ سیاسی تربیت کے لحاظ سے بہت پس ماندہ ہے اور یہ امر باعث خوشنودی ہے کہ انہوں
نے ایک مدت سے اس بارہ میں کوششیں جاری کر رکھی ہیں کہ تمام ہندوؤں کی ذہنیت میں بھی
جمہوریت پسندی اور وطن پرستی کے عناصر داخل ہو جائیں۔ ہندوؤں کی سیاسی تربیت عہدِ
مغلیہ میں شروع ہوئی۔ اور اب تک جاری ہے۔ لیکن اتنے عرصہ کی کوشش و کاوش کے مقابلہ
میں جو انہیں کامیابی نصیب ہوئی ہے وہ بہت کم ہے۔ مغلوں نے ذات پات کے معاملہ میں
ہندوؤں پر اپنا اثر ڈالا اور اس بات کی کوشش کی کہ اُن کو ان غیر فطری امتیازات سے رہائی مل جائے
کسی حد تک مغلوں کی یہ کوششیں کامیاب ہوئیں لیکن ان سے کوئی محسوس و مرئی نتائج برآمد نہ ہو
سکے۔ مغلوں نے ہندوؤں کے زندگی بسر کرنے کے معیار کو بھی قدرے بلند کیا اور تمام ملک کو ایک
حکومت کے ماتحت لا کر تمام ہندو آبادی کو یہ احساس دلایا کہ وہ سب ایک ہیں۔ مغلوں نے
اپنی بالغ نظری کی وجہ سے جہاں ہندوؤں پر اپنے اثرات ڈال کر انہیں اندرونی طور پر متحد کرنے
کی کوشش کی وہاں ہندو اور مسلمان کی تمیز اور اُن میں رشتۂ اتحاد پیدا کرنے کی طرف بھی قدم اُٹھایا۔

لیکن ہندوؤں کے باہمی اختلافات ایسے نہ تھے کہ جلد مٹ جاتے۔ دوسرا اہم واقعہ جس سے ہندوستان میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی یہ تھا کہ مغلوں کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کو یہاں غلبہ نصیب ہوا اور اس نے یورپ سے مغربی خیالات کی ترسیل کی۔ کمپنی کے بعد سلطنت کی باگ ڈور حکومتِ برطانیہ کے ہاتھ آئی اور اس نے ہندوستان میں اشاعتِ تعلیم کا بیڑا اٹھایا۔ تعلیم مغربی طریقہ اور اصول کے مطابق شروع کی گئی جس سے سیاسی خیالات عوام میں پھیلنے شروع ہوئے۔ حکومت برطانیہ کے قائم ہونے کے وقت سے اب تک جتنا عرصہ گزرا ہے اس میں بشرطیکہ ہندوستان کے خاص حالات کو مدِ نظر رکھا جائے تو عوام نے کچھ کم ترقی نہیں کی۔ مغرب میں بھی ملیت کا خیال کچھ زیادہ پرانا خیال نہیں ہے۔ ملیت کا خیال یورپ میں انیسویں صدی میں پیدا ہوا ذات پات کی تمیز، برہمن کے اقتدار اور عوام کی لاعلمی اور پس ماندگی کے پیش نظر ہندوستان نے اب تک جس قدر بھی ترقی کی ہے وہ کچھ کم نہیں ہے۔ البتہ یورپ میں ملیت کا خیال اب اپنے انتہائی عروج کو پہنچ کر اگلی منزل یعنی بین الملی خوشگوار تعلقات کے قیام کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندوستان میں ابھی تک ملیت کے خیال کی ہی تکمیل نہیں ہوئی اور اس بارہ میں بھی بعض متفکرین کو شکایت ہے کہ آیا اسے یہاں کبھی پوری پوری ترقی حاصل بھی ہوگی یا نہیں۔ ذات پات کے رسم و رواج آزادی مساوات اور اخوت کے منافی ہیں اور یہی وہ باتیں ہیں جو ملیت اور جمہوریت کے نصب العین کے عنصر ہیں۔ جس طریقہ سے ذاتیں معرضِ وجود میں آتی ہیں اگر اس طریقے کا تجزیہ کیا جائے تو یہ امر ممکن معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت ملیت کا جذبہ ذات پات کی سنگین دیواروں میں رخنے ڈال دے گا اور تمام ذاتیں ایک دوسری سے مل کر ایک ہو جائیں گی۔ ذاتیں پیشہ کی نسبت سے بھی بنتی ہیں اور جائے سکونت کی تبدیلی کی وجہ سے بھی۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذاتیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ اگر ذاتیں تبدیل ہو سکتی ہیں تو ممکن ہے کہ ملیت کی ضروریات کے مطابق ان میں

ترمیم بھی ہو سکے۔ ان دنوں لوگوں میں پیشہ کے انتخاب کے بارہ میں آزادی پیدا ہوگئی۔ بنگال کے برہمن جیسا کہ بیان کیا گیا ہے زراعت کرنے لگے ہیں اور اسی طرح دیگر ذاتیں بھی اپنے آبائی پیشوں کو چھوڑ کر نئے نئے پیشے اختیار کر رہی ہیں اور پیشہ کی اس تبدیلی کی بنا پر خواہ وہ حقیر پیشہ ہی کیوں نہ ہو انہیں ذات برادری سے خارج نہیں کیا جاتا۔ اگر کوئی شخص کھتری ہو کر چمڑے کا کام اور بوٹ بیچنا شروع کر دے تو اس پیشہ کے اختیار کرنے کی پاداش میں جو در اصل چماروں کا پیشہ خیال کیا جاتا ہے کھتری برادری اسے اپنے میں سے خارج نہیں کرتی۔ یہ بردباری جو ہندوؤں میں پیشہ کے انتخاب کے بارہ میں پیدا ہوگئی ہے ممکن ہے اور زیادہ بڑھ جائے اور پھر دوسری سماجی مجبوریوں سے مل کر جو ہندو جاتی کو اس وقت درپیش ہیں ذات پات کی زنجیروں کو توڑنے میں کامیاب ہو جائے۔

اس کے علاوہ ایک اور بات جس کی بنا پر ہندو ذات پات کی تمیز کو ترک کر کے آپس میں متحد و متفق ہونے کی کوشش کر رہے ہیں وہ رقابت ہے جو اُن کو مسلمانوں سے ہے اس باہمی رقابت کی بنا پر دونوں جماعتیں اندرونی استحکام حاصل کر رہی ہیں۔ اور اسی رقابت کی بنا پر ذات پات کی رسوم کی کلی تنسیخ کی امید کی جا سکتی ہے۔ گذشتہ سیاسی و اصلاحی تحریکات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ان سب میں اس رقابت اور مسابقت کی جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً کچھ عرصہ ہوا کہ شدھی کا پرچار نہایت شدت سے ہونے لگا تھا۔ ہندوؤں نے ملک کے کونے کونے میں شدّھی کی تحریک کو جاری کر دیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ نیچ اقوام ہندو جاتی میں شریک ہو جائیں اور مسلمانوں کے مقابلہ میں بلحاظ تعداد ان کی اکثریت غالب اکثریت میں بدل جائے۔ اس کے مقابلہ میں مسلمانوں نے تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا اور مسلمان مبلغین نے اپنی مساعی سے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔ اس مسابقت کی بنا پر دونوں جماعتیں اپنی اپنی جگہ ایک دوسری سے

مخدوش ہوئیں اور اس خدشہ سے اُنکا اندرونی استحکام اور بھی محکم ہوگیا۔ آریہ سماج جہاں ہندو دھرم
کی اصلاح کی ایک تحریک ہے وہاں اس کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے۔ یہ سیاسی پہلو یہ ہے کہ ہندو
جاتی کی تنظیم کی جائے اور اس میں ملیت کا جذبہ پیدا کر کے اسے حکومت خود اختیاری کے قابل بنا یا
جائے۔ جب کسی جماعت کے افراد کے دلوں میں مذہبی اصولوں کی درستی کے متعلق شکوک
پیدا ہونے لگتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ مذہب میں ترمیم کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں
مغربیت کے اثر سے ہندوستان میں نئے حالات پیدا ہو گئے۔ ان حالات میں اور پُرانی رسوم
میں کوئی مطابقت نہ تھی۔ اس سے ہندو دھرم کے پیروؤں کی عقیدت میں کمی واقع ہوگئی اور لوگوں کو
مذہب کی ترمیم کا احساس ہوا جس کا اثر یہ ہے کہ ہندوستان جدید میں ایک تھوڑے عرصہ کے اندر
اندر آریہ سماج اور ایسے دیگر کئی فرقے پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ سب فرقے آزادی کے حامی ہیں۔ انہوں
نے ذات پات کی تمیز کو یک لخت اڑا دیا ہے۔ آریہ سماج ذات پات کا مخالف ہے۔ برہمو سماج
اور پراتھنا سماج بھی ذات پات کے مخالف ہیں۔ اسی طرح ملک بھر میں کئی ایسے ادارے قائم
ہوئے ہوئے ہیں جو ذات پات کے قائل نہیں اور جو ہندو دھرم کی اصلاح کی کوشش کرتے رہتے
ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ مشہور گوکھلے کا ادارہ ہے۔ اس کا نام سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی
ہے۔ یہ پونا میں قائم ہے۔ اس ادارہ نے مذہبی اور اصلاحی کافی خدمات سرانجام دی ہیں۔ اس
کے علاوہ ہندوؤں میں ہندو ملت کے قائم کرنے کی بھی تحریک برپا ہے۔ اس تحریک کو سیواجی
کے نام سے منسوب کر کے اور سیواجی کا جنم دن منانے سے تقویت دی جاتی ہے۔ اس
تحریک کا مقصد یہ ہے کہ ہندوؤں کے یہ بات ذہن نشین کرائی جائے کہ ہندو مذہب اور ہندو
تمدن مغربی تمدن اور اسلامی تہذیب نیز عیسائیت اور اسلام ہر دو کے مقابلہ میں اعلیٰ اور ارفع
ہے۔ اس تحریک کا آغاز ۱۸۹۵ء میں ہوا جب کہ سیواجی کی پہلی برسی منائی گئی تھی۔ یہ تحریک

نہایت قابلِ افسوس واقعات کے پیدا کرنے کی ذمہ دار ہوئی۔ تحریک سودیشی اور تحریک ہرتجن کا مقصد بھی ہندو ملت کا قیام اور استحکام تھا۔ یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہندو ملت اور ملتِ ہندیہ میں فرق ہے۔ ہندو ملت میں صرف ہندو جماعتیں شامل ہوں گی اور ملت ہندیہ میں ہندوستان کے سب باشندے بلا تمیز مذہب یا رنگ و نسب شامل ہوں گے۔ اسی طرح فنونِ لطیفہ مثلاً راگ شاعری سنگ تراشی۔ تعمیر علم و ادب وغیرہ سے بھی ہندوؤں نے اپنی جُداگانہ ہندو ملت قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ گورنمنٹ سکول آف آرٹ کلکتہ۔ بنارس یونیورسٹی اور گروکل کانگڑی ایسے ادارے اور سر رابندرا ناتھ ٹیگور ایسے اشخاص کے نام ہندو ملیت کے نشانات ہیں۔ اس کے جواب میں مسلمانوں میں اپنی جُداگانہ ملت قائم کرنے کے رجحانات خود بخود پیدا ہو گئے اور انہوں نے بھی ایسے ادارے اور تحریکات شروع کر دیں جن سے ہندوؤں کے اقدام کا مقابلہ مقصود تھا۔ جہاں تک علم و ادب فنونِ لطیفہ اور شعر و شاعری کا تعلق ہے مسلمانوں کی جداگانہ ملیت کے نشانات امتیاز علی گڑھ یونیورسٹی۔ حیدرآباد دکن میں ادارہ اُردو اور اشخاص میں سے سر سید۔ سر فضل حسین اور سر اقبال ایسے اشخاص کے نام ہیں۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ہندو ملت کے جذبہ سے اثر پذیر ہو کر بنگال میں کلکتہ یونیورسٹی نے ایک ایسا تعلیمی ادارہ قائم کیا ہے کہ جس میں بی۔ اے تک تعلیم بنگالی زبان کے ذریعہ بنگالی علم و ادب میں ہوتی ہے اور اس تعلیمی سلسلہ کو ہر دل عزیز بنانے کے لیئے کئی شخص رضاکارانہ کام کرتے ہیں۔ اُن کی پیروی میں اسلامی ملت کی تقویت کے لیے حیدرآباد دکن میں مغربی علم و ادب کو اردو زبان میں منتقل کیا جا رہا ہے اور اس میں ریاستِ مذکور کو ایک بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ سر رابندرا ناتھ ٹیگور نے بول پور واقع بنگال میں جو ایک سکول جاری کر رکھا ہے اس کا مقصد بھی ہندو ملت کو تقویت دینا ہے۔ اس سکول میں دورِ حاضرہ کے سیاسی رجحانات

کو ہندو دھرم کے مذہبی اصولوں کے پہلو میں جگہ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہندو مذہبی ملیت کی تحریک سے جو نتائج برآمد ہوئے وہ خلافِ مصلحت تھے اس پرچار نے کہ "ہندو مذہب سب مذہبوں سے بہتر ہے اس کے پیرو ہی اصل معانی میں فرزندانِ وطن ہیں اور ان کو ہی یہاں آزادی سے رہنے کا حق حاصل ہے اور باقی سب لوگ غیر ملکی ہیں"۔ ہندوؤں میں دوسری جماعتوں کے خلاف ایک ہیجانِ تعصب و تنفر برپا کر دیا جس سے پین اسلامزم کے دبے جذبات ہندی مسلمانوں میں عود کر آئے۔ اور وہ بجائے اس کے کہ وطنِ ہند سے اپنے جذبات کو مانوس کرتے مسلم ممالک کی طرف نظریں اٹھانے اور پین اسلامزم سے امیدیں وابستہ کرنے لگ گئے تاکہ اس کی امانت سے ہندوستان میں اپنی کھوئی ہوئی پوزیشن حاصل کر سکیں یہ اشتعال جو مسلمانوں کو ہندوؤں کی طرف سے دیا گیا ملتِ ہندیہ کی تشکیل کے مانع تھا۔ اس وقت فہمیدہ مسلم لیڈر عوام کے اس قسم کے رجحانات کی روک تھام کی فکر میں ہیں اور وہ اس بارہ میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ جُداگانہ انتخابات اور فرقہ دارانہ تحفظ کے تقاضے اسی مخالفانہ اقدام کا نتیجہ ہیں جو ہندوؤں کی طرف سے گذشتہ نصف صدی کے دوران میں ہوتا رہا ہے لیکن ان سب تقاضوں سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے جذبات ملی کو وطنِ ہند سے علاقہ ہے اور وہ اپنے حقوقِ ملی کے تحفظ کے بارہ میں بیدار مغزی سے کام لے رہے ہیں۔

ملتِ ہندیہ کے نصب العین کے حصول کو آسان اور ممکن بنانے کے لیے اس امر کی ازحد ضرورت ہے کہ ایسی تمام تحریکات کو روکا جائے جن سے جماعتوں کے مذہبی جذبات کے مشتعل ہونے کا اندیشہ ہو اور جن سے تناقض عمل میں آتا ہو۔ مختلف جماعتوں کی توجہ ان کی اپنی اندرونی اصلاح کی طرف لگانی ازبس ضروری ہے۔ بلحاظ جوشِ مذہبی اسلامی ذہنیت ہندو ذہنیت سے بہت زیادہ حساس ہے۔ اگر کسی ہمسایہ اسلامی سلطنت کی طرف سے کبھی اس بارہ میں

ترغیب و تحریص دلائی گئی تو اس کے نتائج ملت ہندیہ کے لیے مفید نہیں ہوں گے۔ ممالک اسلامی کی طرف سے ہندی مسلم کو اس طرح پر اکسایا جانا اس وقت ناممکن ہو چکا ہے۔ گذشتہ ۸۰ سالوں سے ہندوستان میں بالکل امن و امان قائم ہے اور اس کو اندرونی استحکام بھی جتنا کہ ممکن ہے حاصل ہے۔ موجودہ حکومت کی بنا پر ہندی مسلمانوں کے اسلامی ممالک سے سیاسی تعلقات منقطع ہو چکے ہیں۔ اور وہ اب اس قسم کے سیاسی تعلقات کے قائم رکھنے کے عادی بھی نہیں رہے ہیں۔ اسلامی ممالک میں بھی اس وقت اتنی ہمت نہیں کہ وہ اپنی مصروفیتوں کو چھوڑ کر ہندی مسلمانوں کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ لیکن اس قسم کی تحریکات جو ہندو مذہبی ملت کے مقاصد کی برآری کے لیے گذشتہ سالوں میں ہندوستان میں جاری ہوئیں اور جن سے موجودہ حکومت کی عدم موجودگی کی صورت میں عین ممکن تھا کہ ہندی مسلم غیر ہندی مسلموں کی طرف اور زیادہ جھک جاتے اگر پھر کبھی اس وقت جب کہ حکومت خود اختیاری کا عنصر زیادہ ہو جائے گا شروع کر دی گئیں تو یہ امر بعید از قیاس نہیں کہ ان سے ملتِ ہندیہ کے قیام کا نصب العین خاک میں مل جائے۔ اگر گذشتہ زمانہ میں ہندو مذہبی ملت کی تحریک نے ہندی مسلمانوں کا رُخ غیر ہندی مسلمانوں کی طرف پوری طرح نہیں موڑ دیا تو اس کی بھی وجہ تھی اور وہ یہ کہ حکومتِ برطانیہ نے دونوں جماعتوں کے درمیان توازن قائم کرنے کی کوشش کی جس سے مسلمانوں کی مجبوری اتنی زیادہ نہ بڑھی کہ وہ عملی طور پر اسلامی ممالک کی ہمدردی اور اعانت حاصل کرنے کے لئے کوئی کارروائی کرتے لہذا ہر دور اندیش ہندوستانی لیڈر کو چاہیے کہ وہ ایسے اشتعال انگیز سوالات کے پیدا ہونے کو روکے جن سے دونوں جماعتوں میں ایک دوسری کی مدافعت کے لیے جوابی تحریکات کے شروع ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ ہر وہ تحریک جو ایک جماعت میں شروع ہوتی ہے بالآخر دوسری جماعت میں بھی شروع ہو جاتی ہے

اگر ان تحریکات کا رُخ جماعتی سیاسیات کی طرف سے پھیر کر سماجی یا اصلاحی کاموں کی طرف کر دیا جائے تو بہت بہتر ہوگا کیونکہ ایک تو ان جماعتوں کی قوتِ کار بے معنی باتوں میں ضائع نہ ہوگی اور دوسرے اُن کی اندرونی اصلاح سے عام سیاسی فضا بھی بدل جائے گی۔ سماج سدھار ایسی تحریکات جو مختلف ذاتوں میں جاری ہوئی ہیں یا ہوتی رہتی ہیں قرینِ مصلحت ہیں کیونکہ ان کا مقصد زیادہ تر اصلاح ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات کہ جو کام ہندو شروع کرتے ہیں وہ بالآخر مسلمان بھی شروع کر دیتے ہیں اور جو اقدام مسلمانوں کی طرف سے ہوتا ہے اس کی تقلید میں کوئی ویسا ہی اقدام ہندوؤں کی طرف سے بھی عمل میں آجاتا ہے ایک حقیقت ہے ہندوؤں نے ایسے جلسے منعقد کرنے شروع کیے جن کا مقصد یہ تھا کہ ذاتوں کی اندرونی طور پر اصلاح کی جائے۔ ہندوؤں کی پیروی میں مسلمانوں کی مختلف ذاتوں نے بھی اس قسم کے جلسے اور کانفرنسیں کرنا شروع کر دیا۔ یہ جلسے قابلِ تحسین اور مصلحت انگیز تھے۔ اگر دونوں جماعتیں ایک دوسری کی پیروی اور تقلید میں ایسی سیاسی سرگرمیوں کی بجائے جن سے اُن کے باہمی تعلقات کشیدہ ہوتے ہیں اس قسم کے اصلاح کے کام شروع کریں تو بہت بہتر ہوگا۔ سب سے پہلی کانفرنس جو کسی ذات نے منعقد کی کیستھوں کی کانفرنس تھی جسے انہوں نے ۱۸۸۷ء میں منعقد کیا تھا۔ اس کی تقلید کرتے ہوئے باقی ذاتوں نے بھی اپنے اپنے جلسے کرنے شروع کر دیے اور اب اس قسم کے جلسے ملک میں اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ ان جلسوں کے اغراض و مقاصد یہ ہوا کرتے ہیں کہ مختلف ذاتیں اپنے ذاتی حقوق کی حفاظت کر سکیں۔ مذہب کی حوصلہ افزائی کے بارہ میں کوشش کی جا سکے۔ تعلیم کی اشاعت کے لیے قراردادیں منظور کی جائیں اور اپنے حقوق کے مطالبہ کے لیے حکومت کو میموریل بھیجے جائیں وغیرہ۔ ہندوؤں کو دیکھ کر مسلمانوں نے بھی اس قسم کے جلسے منعقد کرنے شروع کیے اور مسلم راجپوتوں مسلم جاٹوں اور کشمیریوں کی کانفرنسیں ہونے لگیں۔ ہندوؤں اور

مسلموں کے اس قسم کے جلسوں کا مقصد سوشل اصلاح ہوا کرتا ہے اور اس لیے ان میں زیادہ تر اصلاح کے ایسے کاموں پر زور دیا جاتا ہے مثلاً اشاعت تعلیم پر، تہذیب و ترقی نسواں پر، بیاہ شادیوں کے اخراجات کو کم کرنے پر اور مذموم رسموں کو ترک کرنے پر۔ نیچ اقوام کے اس قسم کے جلسے بھی اپنی سوشل حالت کو درست کرنے اور حقوق طلبی کے لئے ہی کئے جاتے ہیں۔

بعض سیاست دانوں نے ان جلسوں کی مذمت اور نکتہ چینی کی ہے اور کہا ہے کہ ان کے اثرات انتشار انگیز ہیں۔ لیکن جیسا کہ بیان کیا گیا ہے ان جلسوں کی نوعیت سیاسی نہیں بلکہ اصلاحی ہے اس لیے ان سے اجزائے ملت کے منتشر ہونے کا اندیشہ نہیں بلکہ یہ ملک کی عام بیداری کے نشان ہیں۔ یہ جلسے نیز اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ مغربیت نے یہاں بھی آزادی کی روح کو متحرک کر دیا ہے اور ہر طبقہ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے بیقرار ہو رہا ہے۔ مختلف ذاتوں کے ان جلسوں کے علاوہ پیشہ ورانہ نوعیت کے جلسے اور ہڑتالیں بھی ہوتی ہیں۔ مزدوروں کے جلسے تانگے والوں کے جلسے بھنگیوں کے جلسے اور ہڑتالیں عام بعثت و بیداری کی دلیل ہیں۔ ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ایک جماعت حکومت میں بذریعہ نمائندگی حصہ لینے کے لیے مچل رہی ہے اور مشرق کی ملوکیت پرستی جس کا اظہار اس شعر سے ہوتا ہے:۔

"رموزِ سلطنت خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش"

اب مغرب کی سی جمہوریت پسندی کے سامنے سرنگوں ہو رہی ہے۔

ذاتوں کے ان جلسوں کی بنا پر ایک اور عجیب و غریب نتیجہ جو اخذ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ آئندہ کی نمائندہ حکومت خود اختیاری جماعتی عنصروں پر مشتمل ہو گی۔ اور ہر ایک ذات

رلئے دہی کے معاملہ پر اپنا اثر ڈالا کرے گی اور جو شخص ہم ذات لوگوں کی مرضی کے خلاف رائے دے گا اسے برادری سے خارج کردیا جایا کرے گا۔ یہ اندیشہ اس بنا پر کیا جاتا ہے کہ گذشتہ انتخابات کے دوران میں اکثر رائے دہندگان کو ہم ذات ہونے کی بنا پر اپیلیں کی جاتی رہی ہیں۔ اگر ہندو امیدواروں نے اپنی اپنی ذاتوں سے ذات کے تعلق کی بنا پر اپیلیں کی ہیں تو مسلمان بھی اس بارہ میں پیچھے نہیں رہے ہے۔ مسلم جاٹوں نے مسلم جاٹ امیدوار کی طرف داری کی ہے۔ مسلم راجپوتوں نے مسلم راجپوت امیدوار کے حق میں ووٹ دیئے ہیں۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ ہندوستان سے ملک میں جہاں اتنی ذاتیں موجود ہوں جمہوری طرز کی حکومت کے آغاز میں اس قسم کی بات کا ہونا تعجب انگیز نہیں لیکن عوام کی جوں جوں سیاسی تربیت ہوتی جائے گی ذات کی بنا پر تفوق دیتے کا مرض خود بخود کم ہوتا جائے گا۔ اور بالآخر رائے دہندگان کو اس بات کی سمجھ آجائے گی کہ ووٹ لینے کا وہی شخص زیادہ مستحق ہو سکتا ہے جو اُن کی نمائندگی بحیثیت مجموعی بہترین طریقہ پر کرنے کی استعداد رکھتا ہو۔

مختلف ذاتوں کے جلسوں میں جیسا کہ بیان کیا گیا ہے اکثر اشاعتِ تعلیم کے بارہ میں زور دیا جاتا ہے اور تعلیم سے مراد مغربی تعلیم ہوتی ہے جو مغربی خیالات کی حامل ہے اور مغربی خیالات ملیت اور جمہوریت کے خیال ہیں۔ لہٰذا اس قسم کی تعلیم سے تنگ نظری کا انسداد لازمی ہے۔ ذاتوں کے جلسوں کے دو پہلو ہیں۔ پہلا پہلو تو اصلاح کی غرض وغایت ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ دوسرا پہلو اُن کے طریقِ کار کا پہلو ہے۔ ان کا انعقاد اور طرزِ عمل جمہوری ضبط ونسق کے قواعد کے مطابق ہوتا ہے جس سے عوام سیاسی تربیت پاتے ہیں۔ مغربیت کے زیر اثر آنے سے پیشتر ہر ایک ہندوستانی کے لیے تمام دلچسپی کا مرکز سب سے پہلے اس کا کنبہ اور اس کے بعد اُس کی اپنی برادری یا برادری کی پنچایت ہوا کرتی تھی۔ لیکن مغربی خیالات کی درآمد سے نئے حالات پیدا

ہو گئے اور سوسائٹی فرد کی دلچسپی کا مرکز بن گئی۔ اس تبدیلی سے جو نئے حالات پیدا ہوئے انہوں نے افراد کو فراخ دل بنا دیا جس سے وہ پرانی قسم کی پنچائتوں سے رشتۂ عقیدت توڑ کر نئی قسم کے جمہوری نوعیت کے جلسوں میں شامل ہونے لگے۔ سوسائٹی کے فرد کی ذہنیت میں اس تبدیلی کا پیدا ہونا ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ اگر مساوات، اخوت، حریت ایسے اصولوں سے کسی جماعت کے وقار کو صدمہ پہنچ سکتا ہے تو وہ برہمنوں کی جماعت ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ برہمن اپنے جلسوں میں تعلیم کی اشاعت پر بہت زور دے رہے ہیں حالانکہ ازروئے دھرم پڑھنے لکھنے کا انہوں نے اجارہ لے رکھا تھا اور وہ یہ حق اوروں کو خاص کر شودروں کو دینے کے سخت خلاف تھے۔ اس وقت ملک کی تعلیمی حالت ایسے پست خیالات کی قاطع ہے۔ جنوبی ہندوستان میں باقی آبادی کے مقابلہ میں برہمن زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ بنگال میں بیدیہ، سبرانا مانک اور اگروال بلحاظ تعلیم بہت بڑھے ہوئے ہیں بہار اڑیسہ میں کرن بیدیہ سبرانا مانک اور اگروال بہت زیادہ تعداد میں تعلیم یافتہ ہیں۔ پنجاب میں کھتری اگروال اور روڑے بلحاظ تعلیم پیش پیش ہیں ہندوؤں میں تعلیم سے متعلقہ اس حقیقت سے ظاہر ہوتا ہے کہ برہمن جن کا پیشہ تعلیم و تدریس تھا اس میدان میں نمایاں طور پر کامیاب نہیں ہیں اور وہ جماعتیں جو پہلے ایک معمولی حد تک خواندہ تھیں اب اُن کو بالکل پیچھے چھوڑ گئی ہیں۔ اسی طرح اگر مختلف صوبوں میں سرکاری ملازمین کے اعداد و شمار پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ برہمن ملازمتوں میں بھی کافی تعداد میں ہیں۔ یعنی انہوں نے جس طرح بنگال میں اپنے آبائی پیشہ کو ترک کر کے زراعت کرنا شروع کر دیا ہے اسی طرح عام طور پر ہندوستان بھر میں سلسلۂ ملازمت میں شامل ہو کر بھی پنڈت کے آبائی پیشہ کو ترک کر دیا ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ مغربی خیالات کی درآمد کی مخالفت برہمنوں کی طرف سے نہیں ہو رہی مسلمان اسلامی شعار اور اسلامی تمدن کی بنا پر جمہوریت پسند اور مرکزیت کے حامی تھے۔ ہندوؤں نے چونکہ مسلمانوں سے پہلے مغربی علوم

کی تحصیل شروع کی اس لیے مذہب کی بنا پر ان کی ذہنیت میں جمہوریت پسندی کا جو عنصر پیدا نہ ہوا تھا مغربی تہذیب کے اثر سے پیدا ہوگیا۔ نیز دھرم کی بنا پر جو تشدا انگیزی ان میں موجود تھی اس کا بھی قلع قمع ہوا اور اس طرح ان دونوں ہمسایہ جماعتوں کی سیاسی ذہنیت کے کسی حد تک یکساں ہو جانے سے ان میں ایک توازن قائم ہوگیا اور اب جوں جوں وقت گزرتا جائے گا ان میں سیاسی ترقی کے رستہ پر ایک دوسرے کے ہمدوش آگے بڑھنے کی زیادہ اہلیت پیدا ہوتی جائے گی۔

ہندو اور مسلمان جب ہندوستان کو چھوڑ کر مغربی ممالک میں جاتے ہیں تو وہاں کے حالات دیکھ کر انہیں اپنی پس ماندگی کا شدید طور پر احساس ہوتا ہے۔ نیز مغربی ممالک کی آزاد فضا ان کی آنکھوں پر سے تعصب کی پٹی کھول دیتی ہے اور وہ دیکھنے لگتے ہیں کہ ہندو مسلم کے اختلافات نہایت معمولی باتوں کے متعلق ہیں۔ نیز ان کے رجعت پسندانہ رسم و رواج بھی مضحکہ خیز ہیں۔ اس پر وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ مغربی ممالک کی سی ترقی کرنے کے لیے ان باتوں کو چھوڑ دینا ہی کار ثواب ہے۔ چنانچہ جب وہ واپس آتے ہیں تو ان میں ایسی تنگ دلی اور تنگ نظری نہیں ہوتی جس کا انکشاف عام طور پر ہندوستان میں رجعت پسند طبقوں کی طرف سے ہوتا رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی بیان کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ہندوؤں میں ولایت دیدہ اشخاص کو اچھوت تصور کیا جایا کرتا تھا اور مسلمانوں میں ان پر لا مذہبیت کا الزام لگایا جایا کرتا تھا۔ لیکن اب یہ تنگ نظری جاتی رہی ہے اور ہندو ولایت دیدہ ہندوؤں کو پھر جاتی میں شامل کر لیتے ہیں اور اس بارہ میں کسی قسم کی سختی نہیں برتتے۔ نہ صرف یہ بلکہ اب تو اس قسم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مسلمان بھی اب لا مذہبیت کا الزام عائد کرنے سے رک گئے ہیں۔

جاپان

جاپان کے حالات ہندوستان کے حالات سے ملتے جلتے تھے۔ اور وہاں بھی سوسائٹی ہندوستان کی چار ذاتوں کے سے تین طبقوں میں منقسم تھی۔ اور ان طبقوں نے بھی ایک دوسرے سے اتنی علیحدگی اختیار کر رکھی تھی جتنی کہ کسی زمانہ میں ہندوؤں کی مختلف ذاتوں نے ایک دوسری سے اختیار کر رکھی تھی۔ صحیفۂ ایاشو جاپانیوں کی مشہور کتاب ہے۔ اس میں جاپانیوں کے ان مختلف طبقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ تمام جاپانی تین گروہوں میں منقسم تھے۔ اوّل بادشاہ اور اُس کے درباری (میکاڈو اور کیوج) دوم فوجی (بیوک یا سمورائے) سوم عوام (ہیمن)۔ میکاڈو کو خدا مانا جاتا تھا اور اُس کو دیکھنے کا حق سوائے اُس کی بیویوں اور درباریوں کے کسی کو نہ تھا۔ حکومت کا کام بڑے بڑے نواب (شوگن) اور سمورائے سرانجام دیتے تھے۔ درباریوں یعنی کیوج کے مختلف خاندان تھے اور یہ سب لوگ جاپان کے کسی نہ کسی پہلے فرماں روا کی اولاد میں سے ہوا کرتے تھے۔ کیوج بذریعہ وراثت حکومت کے تمام بڑے بڑے عہدوں پر مقرر ہونے کا حق رکھتے تھے۔ لیکن اُن کو تنخواہ وغیرہ نہ ملتی تھی۔ اس کے بعد فوجیوں میں سمورائے کا طبقہ اہم تھا۔ تمام انتظامیہ عہدے اُن کو دیے جاتے اور اُن کو نسلاً من نسل بذریعۂ حق وراثت جاگیریں ملتے۔ تیسرا طبقہ ہیمن یعنی عوام کا طبقہ تھا اُن کو کوئی سوشل حیثیت حاصل نہ تھی۔ بہت سے تلوار لگانے کے حق سے بھی محروم تھے۔ یہ لوگ صنعت و حرفت سے اپنی روزی کماتے تھے۔

ہیمن کے بھی تین گروہ تھے۔ پہلا گروہ کسانوں کا تھا۔ کسانوں کو ایک تلوار لگانے کا حق تھا۔ لیکن اُن کے مقابلہ میں سمورائے دو تلواریں لگا سکتے تھے۔ دوسرا گروہ اہلِ فن اور پیشہ وروں کا تھا۔ ان میں سنگ تراش زرہ ساز و دیگر ایسے پیشہ ور شامل تھے۔ تیسرا گروہ تاجروں کا تھا۔ تاجروں کو سب سے کم سوشل حیثیت حاصل تھی۔ ہیمن کے علاوہ دو اور گروہ بھی تھے ایک ایتا اور دوسرا ہینن

ریٹا تو اچھوت تھے اور ہینن ایسے تھے جیسے ہمارے ہاں کے ڈوم۔ ان کو حقیر پیشے اختیار کرنے کی ہی اجازت تھی۔ یہ لوگ صرف اپنے طبقے ہی میں شادیاں کر سکتے تھے۔ بستیوں کے باہر چھوٹے چھوٹے ڈیروں میں رہتے اور انہیں اونچے طبقے کے لوگوں کے ساتھ مل کر کھانے پینے کی بالکل اجازت نہ تھی۔

جاپانیوں کی ذات پات کی اس تمیز کو منسوخ ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ جاپان میں ذات پات کی تنسیخ کی وجوہ چار ہیں۔ پہلی وجہ سیاسی ہے اور وہ یہ کہ سترھویں صدی میں جنوبی قبیلوں کو یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ٹوکوگوا کے اقتدار و اختیار کو اس سے چھین کر اپنے قبضے میں کیا جائے۔ انہوں نے اس بارہ میں کوشش شروع کی جس سے ایک سیاسی ہیجان پیدا ہو گیا دوسری وجہ یہ تھی کہ سمورائے کی تربیت اور ملک کی عام حالت ایسی تھی کہ سیاسی بیداری کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ تیسری وجہ مذہبی ہے یعنی شنٹو ازم کو جو جاپانیوں کا پہلا مذہب تھا دوبارہ مقبولیت اور ہر دل عزیزی حاصل ہونا۔ چوتھی وجہ غیر ملکی لوگوں سے میل ملاپ کی بنا پر جاپانیوں میں احساس ملی کا پیدا ہو جانا۔

قبیلہ سیٹسموا کے سمورائے نے جب حکومت کی باگ ڈور کو اپنے قبضہ میں لے لیا تو انہوں نے دیگر جنوبی قبیلوں سے اتحاد کرنے اور اُن کے شکوک کو مٹانے کی خاطر بادشاہ کو دوبارہ تخت نشین کرنے سے پیشتر اُس سے یہ وعدہ لیا کہ وہ ایک مجلس بنائے گا جس کا کام ملکی معاملات کے متعلق غور و خوض اور رائے زنی کرنا ہوگا۔ اس معاہدہ سے جاپان کی موجودہ نمائندہ حکومت معرض وجود میں آئی۔

مصلحین کا مقصد اگرچہ صرف یہ تھا کہ قومی اتحاد و اتفاق پیدا ہو سکے۔ لیکن جب اُنہوں نے دیکھا کہ مختلف قبیلوں کی مقامی خود اختیار حکومتوں کی وجہ سے ملک بھر کا قانون اور نظام ایک

نہیں اور یہ نیرنگی قومی اتحاد کے منافی ہے تو انہوں نے اس بارہ میں زور دیا کہ تمام قبیلے اپنے اس قسم کے حقوق بادشاہ کو تفویض کر دیں تاکہ وہ تمام جاپان میں یکساں قسم کا قانون اور یکساں قسم کا نظام رائج کر سکے۔ اس بارہ میں سیٹسموا چوشو ٹوسا اور ہیزن قبیلوں نے پیش قدمی کی اور ان کی تقلید میں اور قبیلوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ملی اتفاق و اتحاد کی خاطر یہ انتہائی ایثار تھا جس کی مثال جاپانیوں کے مختلف قبیلوں نے برضا و رغبت قائم کی۔ اس قربانی کی نظیر سے حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوا اور اس سے تمام ذاتی خود غرضیاں دب گئیں۔

پہلی حکومت جو قائم ہوئی اس میں مختلف قبیلوں کے نمائندے شامل تھے۔ ان نمائندوں نے سمورائے کو وعدہ دیا کہ ان کی حیثیت کو اگرچہ اس قسم کے امتیازات ملیت اور جمہوریت کے منافی ہیں برقرار رکھا جائے گا لیکن پھر بھی آہستہ آہستہ سمورائے کا وقار کم ہوتا گیا اور بالآخر مواجبات کے بارہ میں ان کے جدی حقوق بھی مٹ گئے۔ ۱۸۷۳ء میں جب یہ اچھی طرح سے واضح ہو گیا کہ جمہوری طرز کی نمائندہ حکومت میں کسی خاص طبقہ سے امتیازی سلوک کرنا مشکل اور مفادِ عامہ کے خلاف ہے تو سمورائے کے حقوق کی باقاعدہ تنسیخ عمل میں لائی گئی اور اگرچہ جدی مواجبات سے ان کو اس حکومت نے محروم کیا جو انہی کی مدد سے قائم ہوئی تھی لیکن حب الوطنی اور جذبۂ ملی کی وجہ سے وہ بالکل خاموش رہے اور چون و چرا تک نہ کی۔ ان میں سے بہت تو ۱۸۷۳ء سے بھی بہت عرصہ پہلے برضا و رغبت جدی مواجبات نیز اپنے امتیازی حقوق سے دست بردار ہو کر کاشتکاروں اور تاجروں کے پیشے اختیار کر چکے تھے۔ سمورائے کے اس ایثار کی مثال بھی لاثانی ہے۔ ان کو جب یہ احساس پیدا ہوا کہ ان کی اعلیٰ سوشل حیثیت وطن کی ترقی کی راہ میں حائل ہے تو انہوں نے اپنے خصوصی امتیاز کو ملک پر قربان کر دیا اور اپنے دیگر ملکی بھائیوں کی طرح گاڑھے پسینہ کی کمائی سے اپنا پیٹ پالنا شروع کیا۔ سمورائے ہمارے ملک کے

برہمنوں سے بھی زیادہ اقتدار رکھتے تھے لیکن ملکی ضرورت کے پیش نظر انھوں نے اچھوت ہریجن اور شودر بننا گوارا کر لیا۔

جمہوریت ملیت نمائندگی یعنی ترقی کی لہریں جاپان میں بھی اُٹھیں اور اُن کا وہاں کے مخالف حالات سے تصادم بھی ہوا لیکن جاپانیوں نے نہایت مستقل مزاجی سے نئے طریقوں اور پُرانی روشوں میں تطابق پیدا کیا۔ اُنھوں نے اپنی ذہنیت اور سیرت میں وہ تمام تبدیلیاں پیدا کر لیں جو نئی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے لازمی تھیں۔ محکمہ فوج میں محکمہ ریل میں محکمہ تعلیم میں محکمہ طب میں گویا کہ ہر جگہ وہاں بھی غیر ملکی مدد کی ضرورت محسوس ہوئی اور انھوں نے انگریز جرمن اطالوی امریکی وغیرہ ماہرینِ فن کو بلایا اُن کی خدمات حاصل کیں ان سے کام سیکھا اور پھر جب خود اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے قابل ہو گیے اور ان غیر ملکی ماہرین کی خدمات کی ضرورت نہ رہی تو انہیں الوداع کہہ کر اپنے اپنے ملکوں کو واپس لوٹا دیا۔ جاپانی ملیت اور جمہوریت کی آبیاری اپنے خون سے کرتے ہیں۔ اور یہی اُن کا طغرائے امتیاز اور کامیابی کا راز ہے۔

جاپانی ملت کے قیام میں شنٹو ایزم (مذہب) کی دوبارہ ہردل عزیزی نے بھی کافی مدد دی۔ شنٹو ایزم جاپانیوں کا قدیم مذہب ہے۔ نویں صدی میں بدھ مذہب کے سامنے یہ دب گیا تھا۔ لیکن سترھویں صدی میں چند علما اور مصنفین کی مدد سے پھر مقبول عام ہو گیا اس سے جاپانیوں کو مذہبی لحاظ سے یگانگت حاصل ہو گئی جس کی بنا پر اُن کے مختلف طبقے آپس میں ایک دوسرے سے مل گئے۔ ملیت کی خاطر جو پرامن انقلاب جاپان میں پیدا ہوا اس کی ایک وجہ اس مذہب کی عام مقبولیت بھی تھی۔ لیکن بعد میں جب یہ مذہب اپنی خدمت سر انجام دے چکا اور اس کی ضرورت نہ رہی تو پھر بدھ مذہب کا چرچا ہو گیا۔

اگرچہ ان حالات کے پیش نظر ہندوستان کی حالت جاپان کی حالت سے ملتی جلتی ہے

لیکن ایک بڑا فرق یہ ہے کہ جاپان میں ملیت کا جذبہ کیا عوام اور کیا خواص سب میں یکساں طور پر پیدا ہوگیا تھا۔ لیکن ہندوستان میں یہ احساس صرف ان خواندہ اشخاص تک محدود ہے جو قصبات میں آباد ہیں۔ ۹۰ فی صدی دیہاتی آبادی ابھی تک اس جذبہ سے ناآشنا ہے۔ دیہاتی لوگ اپنی تعلیمی اور اقتصادی پس ماندگی کی وجہ سے ملکی ضروریات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ آبادی کی ایک غالب اکثریت کو ابھی تک اپنی ذلت اور پس ماندگی کا احساس نہیں ہوا اور لوگ اپنی حالت کے بدلنے کی طرف بالکل دھیان نہیں دے رہے ہیں۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ آیا جذبہ ملت پرستی خواندہ آبادی سے بڑھ کر کبھی ان تک بھی پہنچے گا یا نہیں۔ خواندہ آبادی میں اگرچہ جذبۂ ملی موجود ہے لیکن عملی طور پر ابھی ان میں اتنا دل وگردہ نہیں کہ وہ قصبات کی آسائشوں کو چھوڑ کر دیہات میں پھیل جائیں اور وہاں جذبہ ملی کو پھیلانے کی کوشش کریں۔ ہندوستان کی خواندہ جماعتوں میں جاپان کے طبقہ سموراۓ کا سا ایثار ابھی پیدا ہونا باقی ہے۔ انہیں اگرچہ دیہاتی آبادی کی سیاسی تربیت کی ضرورت کا احساس ہے لیکن تاحال اس بارہ میں عملی طور پر کوئی کاروائی کرنے کا شوق پیدا نہیں ہوا۔ ملک میں دن بدن تعلیم بڑھ رہی ہے۔ اور اس ترقی تعلیم سے جوں جوں تعلیم یافتہ طبقہ کی تعداد میں اضافہ ہوگا ملیت پس ماندہ طبقوں میں بھی سرایت کرتی جائے گی۔ لیکن سب سے پہلے جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ان کو اپنی مجانست اور مجاورت کی طرف توجہ دلا کر باہم دگر مانوس کر دیا جائے تاکہ ملت کی بنیاد مضبوط اور پائیدار ہو +

باب ششم

حکومتِ برطانیہ کے ماتحت

سیاسی اتحاد

حکومتِ برطانیہ کے ماتحت
سیاسی اتحاد

"حکومت برطانیہ کے اقتدار نے اسے اس قابل بنا رکھا ہے کہ جس قدر وہ اپنی رعایا کی حفاظت کر سکتی ہے۔ اس قدر کوئی دیسی ریاست اپنی رعایا کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ اس کے دستور اور آئین سے اس کی رعایا کو اندرونی بدامنی سے اسقدر زیادہ تحفظ حاصل ہے کہ جو ریاستوں کے باشندوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا ہے۔ لیکن یہ برکات انہیں بہت گراں پڑی ہیں۔ انہوں نے اپنی آزادی کو اپنے ملی کیریکٹر کو گویا کہ اپنی ہر ایک ایسی چیز کو جس سے کہ قومی وقار قائم ہو سکتا ہے بھینٹ چڑھا کر اُن کو حاصل کیا ہے۔ برطانوی صوبوں کے باشندے بغیر خوف و خطر اپنے روزانہ کاروبار میں مصروف رہ سکتے ہیں اور اپنی محنت کے ثمر سے نہایت امن و چین اور اطمینان سے تمتع اندوز ہو سکتے ہیں۔ لیکن حیوانوں کی سی ایسی خوش باشی اور پھلنے پھولنے کی حالت سے بلند کسی اور ارفع مقصد کو جو (انسانوں کے شایانِ شان ہو) اپنا مطمح نظر نہیں بنا سکتے۔ ان میں سے کوئی بھی یہ امید نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے ملک کی سول اور ملٹری میں یا اس کے لیے قانون بنانے میں شریک ہو سکتا ہے۔"

سر تھامس منرو کے مراسلہ کے یہ چند فقرات جو انہوں نے ۱۸۱۷ء میں حکومتِ انگلستان

کو تحریکیا حقیقت سے لبریز ہیں۔ ان فقرات کی تشریح سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے عواقب کی تصریح کے مترادف ہوگی۔ لہذا ان غلیظ و تعفن انگیز چیتھڑوں کی برسرِ عام شست و شو غیر ضروری ہے اس زمانہ میں ملکی پراگندگی کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان بحیثیت مجموعی ایک مسلسل گھبراہٹ کا شکار ہو رہا تھا اور مایوس کن حالات کے تاریک بادل اس قدر گھر کر چھائے تھے کہ امید کی کوئی کرن کہیں بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ اس یاس و پریشانی کی حالت میں لوگوں کو قومی عزت ملکی توقیر اور ہندی وقار کو اندرونی امن و امان کی بحالی کی خاطر قربان کر دینے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ چنانچہ بدامنی اور تخریب باہمی کو روکنے کے لیے غیر ملکی حکومت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا نہ صرف مصلحت انگیز بلکہ ضروری بھی تھا انگریزوں کو بھی اس قربانی کا پورا پورا احساس تھا جو عام ہندوستانی طبقوں نے امن حاصل کرنے کی خاطر کی تھی۔ ان کے اس احساس سے جو نتائج برآمد ہوئے ان میں سے امن سب سے پہلا اہم نتیجہ ہے قیامِ امن کے بارہ میں انگریزوں نے اپنے فرضِ منصبی کو بطریقِ احسن سرانجام دیا۔ امن قائم ہوگیا تو حاکموں اور محکوموں کو اندرونی اصلاح کی طرف توجہ دینے کا موقع ملا۔ یہاں اندرونی اصلاح سے ہماری مراد فی الحال محکمہ جات ریل خبر رسانی انہار و تعلیم وغیرہ سے ہے۔ علم اقتصاد کے بعض مصنفین نے ان محکمہ جات کے قیام کے متعلق لکھا ہے کہ انگریزوں نے ان محکموں کو ہندوستان کے باشندوں کی حقیقی بہتری اور بہبودی کے پیشِ نظر شروع نہیں کیا تھا۔ بلکہ اُن کے جاری کرنے میں ان کی اپنی ذاتی اغراض پنہاں تھیں۔ اُن کے قول کے مطابق ریلوں کے جاری کرنے کی ضرورت دو وجوہات کی بنا پر پیش آئی تھی۔ اول اس لیے کہ سپاہ کو ملک کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں لے جانا آسان ہو جائے اور اُس کی نقل و حرکت پر زیادہ وقت صرف نہ کرنا پڑے۔ دوم اس لیے تاکہ خام اجناس کو ملک کے اُن حصوں سے جو بندرگاہوں سے بہت دور واقع ہوں بندرگاہوں تک آسانی سے اور کم عرصہ میں لایا جا سکے۔ محکمہ ڈاک اور تار برقی کو معرضِ وجود میں لانے کی وجہ بھی انہوں نے حکومت

کی ذاتی اغراض بیان کی ہے۔ اور وہ یہ کہ ملک کے مختلف حصوں کا ان محکموں کے ذریعہ سے آپس میں تعلق قائم ہو جائے اور اگر کسی حصہ میں سیاسی شورش پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو اس کا فوراً پتہ چل جائے تاکہ فوری انتظام ممکن ہو سکے۔ اس طرح محکمہ انہار کے کھولنے کی وجہ انہوں نے یہ بتائی ہے کہ حکومت چاہتی تھی کہ ملک کی زرعی پیداوار بڑھ جائے تاکہ ہندوستان میں پیدا ہونے والی خام اجناس کی ایک بڑی مقدار کم قیمت پر انگلستان کو بہم پہنچائی جاسکے۔ نیز زراعت کی ترقی سے آبیانہ اور دیگر محاصل کے بڑھنے کی بھی توقع تھی۔ اسی قسم کے خیالات کا اظہار اشاعتِ تعلیم کے متعلق بھی کیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ انگریزی تعلیم دینے کا مقصد ہندوستانیوں کی بہتری اور بہبودی نہ تھا بلکہ غرض یہ تھی کہ محکموں کا کام چلانے کے لیے ایسے کلرک پیدا کیے جاسکیں جو کم تنخواہوں پر کام کرنے کے لیے تیار ہوں اور بڑی بڑی تنخواہیں دے کر انگلستان سے کلرک لانے کی ضرورت نہ رہے۔ نیز یہ کہ انگریزی پڑھانے سے ایک ایسا طبقہ ملک میں پیدا کیا جائے جو انگریزوں کا ہم خیال اور مداح ہو تاکہ اس کی اعانت و حمایت سے سلطنت کو استحکام حاصل ہو اور ۱۸۵۷ء کی سی بغاوتوں کے امکانات کم ہو جائیں۔ یہ نتیجہ کہ انگریزوں کے ہم خیال اور مداح طبقہ کے پیدا ہو جانے سے حکومتِ برطانیہ کو مزید استحکام حاصل ہو سکے گا ۱۸۵۷ء کے غدر کے حالات سے مترتب ہوا تھا۔ غدر میں حصّہ لینے والے نہایت قدامت پسند ایسے ہندو اور مسلمان تھے جن کو کبھی مغربیت کی ہوا تک نہ لگی تھی۔ بنگال کی دیسی پیادہ سپاہ جس نے غدر میں حصہ لیا اودھیا کی پوتر بھومی سے بھرتی کی گئی تھی اور اسی طرح مسلمانوں کا رسالہ بھی نہایت پرانے خیال اور پرانی وضع کے مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ برعکس اس کے ایسے ہندوستانیوں نے جنہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی اور جو مغربی دستور کے مطابق ملکی ترقی کے خواہاں تھے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ بنگالی جنہیں انگریزی تعلیم و تربیت ملی تھی انگریزوں کے طرفدار اور وفادار رہے اور غدر میں ایسے ہندوستانیوں پر بھی مصیبت آئی تھی کانپور

میں بابو لوگوں کو خوب لوٹا گیا اور انہیں ہر طرح کی اذیتیں بھی پہنچائی گئیں۔ اسی طرح دہلی میں انگریزی بولنے والے ہندوستانی بھی قتل ہوئے۔ ان حالات سے قدرتاً اس نتیجہ کا اخذ کیا جانا ممکن تھا کہ انگریزی خواں طبقہ کی تعداد میں اضافہ ہونے سے انگریزی حکومت بھی زیادہ مستحکم ہو جائے گی۔ ہمیں اس سے کچھ تعرض نہیں کہ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو تعلیم کس مقصد سے دی۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس تعلیم کا اثر کیا ہوا۔ انگریزی کی تعلیم سے تمام مغربی خیالات کی ترویج ہوئی اور ہندوستانی بھی آزادی چاہنے لگے۔ ہندوستانی لارڈ میکالے کے مشکور رہیں کہ اُنہوں نے انگریزی کی تعلیم پر اصرار کیا۔ انگریزی تعلیم کے اثرات نے مختلف ایسے اصلاحی اداروں اور سیاسی تحریکوں کی صورت اختیار کی جن کا ذکر آگے چل کر کیا جائے گا۔ یہاں اتنا بیان کر دینا کافی ہوگا کہ ہندوستانیوں کے سیاسی لیڈروں میں سے زیادہ تو ایسے ہیں کہ اُنہوں نے سرکاری مدرسوں اور کالجوں میں تعلیم پائی ہے۔

ہمیں حاکموں کی نیک نیتی یا بد نیتی سے تعلق نہیں۔ حاکموں نے یہ سلسلے خواہ اپنی ذاتی اغراض سے جاری کیے یا باشندوں کی سہولت کے لیے یہ ایک علیحدہ سوال ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اندرونی اصلاح کے ان ذرائع سے جہاں تک ملت کا تعلق ہے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ ریلوں کے ذریعہ سے جب ملک کے تمام حصّے باہم ملا دیے گئے تو سب سے پہلا نتیجہ جو برآمد ہوا یہ تھا کہ تمام باشندوں کو کم و بیش اپنی ملکی وحدانی حیثیت کا احساس ہوا اور وہ اجنبیت جو مختلف خطوں کے لوگ آپس میں محسوس کیا کرتے تھے دور ہو گئی۔ عام آمد و رفت اور میل ملاپ سے وہ ایک دوسرے کو جاننے لگے اور وہ غیریت اور جھجک جو پہلے وہ ایک دوسرے سے محسوس کرتے تھے جاتی رہی۔ ریلوں میں سفر کرنے سے اعلےٰ اور ادنےٰ ذاتوں کی تمیز کو بھی کاری دھچکا لگا۔ چھوت چھات کی وجہ سے عوام کے طبقوں میں جو باہمی طور پر منافرت اور تنگ دلی تھی اس کی

بھی ایک بڑی حد تک بیخ کنی ہوئی۔ برہمن جب شودر کے ساتھ ریل کے ایک ہی خانے میں بیٹھ کر سفر کرنے پر مجبور ہوگئے تو سفر کی سہولت اور آسانی کی خاطر انہوں نے چھوت کے بارہ میں سختی سے کام لینا چھوڑ دیا اور تحمل اور بردباری سے کام لینے لگے۔ یہ ہیبت اور جمہوری مساوات کی طرف ملک کا پہلا قدم تھا۔ اس کے بعد محکمہ خبر رسانی نے بھی یہی خدمت سرانجام دی کہ لوگوں کو مسافت اور دوری کا احساس جاتا رہا اور اس سے وہ ایک دوسرے کے قریب تر ہوگئے۔

محکمہ انہار سے زرعی پیداوار بڑھی اور اس پیداوار کی اندرونی درآمد و برآمد سے مختلف صوبوں کے لوگوں کے آپس میں تجارتی تعلقات قائم ہوگئے۔ نیز غیر ملکی برآمد سے بھی لوگوں کو کچھ فائدہ پہنچا جس سے زندگی بسر کرنے کا معیار جو بہت پست تھا قدرے بلند ہوگیا۔ نیز ان تمام ذرائع آمدورفت سے ایک صوبہ کے لوگوں کو دوسرے صوبہ کے لوگوں سے ہمدردی پیدا ہوگئی۔ پہلے جب قحط پڑتا تو لوگ ہزاروں کی تعداد میں فاقہ کشی کے شکار ہوتے لیکن اب چونکہ ملک کی زرعی پیداوار بڑھ گئی تھی نیز ذرائع رسل و رسائل بھی موجود تھے اس لیے قحط زدگان کی امداد کے لیے ملک کے کونہ کونہ سے اپیلیں ہو جاتیں اور اس طرح ان کو بھوک کا شکار ہونے سے بچا لیا جاتا۔ اس باہمی ہمدردی سے لوگوں کو اپنے ایک ہونے کا احساس پیدا ہوا۔ یہ احساس بھی ملت کے حق میں بہت مفید تھا۔ ان کے علاوہ ملکی یگانگت کو بڑھانے اور ملی و جمہوری خیالات کی پرورش کرنے والی دو باتیں جو غیر ملکی حکومت کی وجہ سے معرض وجود میں آئیں حسب ذیل تھیں:۔ اوّل معدلت گستری۔ دوم مذہبی آزادی اور سوم لوکل سیلف گورنمنٹ۔ معدلت گستری کی بنا غیر جنبہ داری قانون اور یکسانی قانون پر رکھی گئی امیر غریب مالک اور مزارع ہندو اور مسلمان کے لیے ایک ہی قانون نافذ کیا گیا۔ عدالتوں کے سامنے برہمن اور شودر سے جب یکساں سلوک ہونے لگا تو اس سے مختلف ذاتوں جماعتوں اور طبقوں کے باہمی امتیازات مٹ گئے۔ اور سوسائٹی کے تمام نشیب و فراز ہموار ہوکر پست اور بلند افراد کو بھی برابر کر گئے۔ مذہبی آزادی

قانوناً روا رکھی گئی ۔ اس سے مختلف مذہبوں کے پیروؤں کو مجبوراً تحمل اور بردباری کا ثبوت دینا پڑا اور پھر آہستہ آہستہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کا سلوک کرنے کے بھی عادی ہو گئے اس سے حقیقی معنوں میں مذہبی تعصب اور مغائرت دور ہوئی ۔ خود حکومت نے لوکل سیلف گورنمنٹ کے بارہ میں عوام کی حوصلہ افزائی کی ۔ لارڈ رپن کی حکومت نے لوکل سیلف گورنمنٹ کی توسیع کی حمایت میں کافی خدمات سرانجام دیں اور مدعا یہ تھا کہ اس کے ذریعہ عوام میں تعلیم پھیلے اور اُن کی سیاسی تربیت ہو ۔ چنانچہ کمیٹی ہائے قصبات خورد میونسپل کمیٹیاں اور ڈسٹرکٹ بورڈ لوگوں میں ادبی و سیاسی تعلیم کے پھیلانے میں کافی حد تک مفید ثابت ہوئے ہیں ۔

سب سے بڑی بات جس نے ہندوستانیوں کے سب طبقوں کو متحد و متفق کیا ملک میں ایک ایسی جماعت کی موجودگی تھی جو ہندوستانیوں سے متنفر تھی اور سیاسی اصلاح اور حکومت کے کاموں میں اُن کی شمولیت کی مخالفت کیا کرتی تھی یہ اینگلو انڈین جماعت تھی ۔ رشک اور مسابقت کی بنا پر حکمران اور محکوم طبقے علیحدہ علیحدہ نظر آنے لگے جس سے موخر الذکر کو اپنے انتشار کا احساس پیدا ہوا اور انہوں نے از سر نو اپنی شیرازہ بندی کی فکر کی ۔ یہی احساس قدامت پسند انگریزوں کے مقابلہ میں انہیں متحد و متفق کر کے اُن میں ملی جذبہ پیدا کرنے کا ذمہ وار ہے ۔

سنہ ۱۸۸۰ء میں انگلستان کی قدامت پسند حکومت کو انتخابات میں شکست ہوئی ۔ اس وقت لارڈ لٹن ہندوستان کے گورنر جنرل تھے ۔ قدامت پسند حکومت کی شکست پر وہ مستعفی ہو کر واپس انگلستان چلے گئے اور وزیر اعظم مسٹر گلیڈسٹون نے لارڈ رپن کو لارڈ لٹن کی بجائے وائسرائے مقرر کر کے ہندوستان بھیجا تاکہ وہ سیاسی اصلاح سے حکومتِ ہند میں آزادی کے عنصر کا اضافہ کریں ۔ لارڈ رپن کی حکمتِ عملی سے اگرچہ عملی طور پر تو کچھ مفید نتائج برآمد نہ ہوئے لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اینگلو انڈین آبادی مشتعل ہو گئی اور اس نے سیاسی اصلاح کی حکمتِ عملی کے اور لارڈ رپن کے خلاف

ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اس زمانہ میں اینگلو انڈین اس قدر آتش زیر پا ہوئے کہ اُنھوں نے حسد اور ضد کی بنا پر ہندوستانی تعلیم یافتہ لوگوں سے ہتک آمیز سلوک کرنا شروع کر دیا۔ ان کی یہ ذہنیت اسی زمانہ میں البرٹ بل کے پیش ہونے پر اور زیادہ بگڑی اور ان میں سے اکثر ایسے آگ بگولا ہوئے کہ انہیں حکومتِ برطانیہ کی عزت اور وقار کا بھی خیال نہ رہا یعنی وہ اس قسم کی بے معنی تجاویز سوچنے لگے کہ وائسرائے کو جہاز میں بٹھا کر جبراً واپس انگلستان بھیج دیا جائے۔ لیکن اس کے مقابلہ میں ہندوستانیوں نے لارڈ رپن کی بہت عزت و توقیر کی یہ بات اُنکے اپنے حق میں بھی از حد مفید ثابت ہوئی۔ لارڈ رپن کی قدر اور عزت کے اظہار کے طور پر اُنھوں نے مختلف موقعوں پر شاندار مظاہرے کیے اور جب وہ اپنا عرصہ تعیناتی پورا کرنے کے بعد ہندوستان سے واپس انگلستان روانہ ہوئے تو کلکتہ سے لے کر بمبئی تک تمام راستے میں اس قسم کے مظاہروں کا تانتا بندھ گیا۔ یہ مظاہرے ہندوستانیوں کے دلوں میں اس ہر دل عزیز وائسرائے کی جو عظمت و محبت تھی اُس کا ثبوت تھے۔

البرٹ بل کا مقصد یہ تھا کہ یورپین آبادی کو یہ جو امتیاز حاصل ہے کہ ان کے خلاف مقدمات اُن کی اپنی خاص عدالتوں کے روبرو ہی پیش ہو سکتے ہیں بالکل اڑا دیا جائے اور اُنکے مقدمات کی سماعت کا کام عدالت ہائے عالیہ کے سپرد کر دیا جائے تاکہ کلکتہ میں ہندوستانی اعلیٰ درجہ کے مجسٹریٹوں کی عدالتوں میں بھی اُن کی سماعت ہو سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اینگلو انڈین ہندوستانیوں کے سخت خلاف ہو گئے اور ہر ممکن کوشش کی کہ ان کو حکومت میں حصہ نہ مل سکے۔ اس طرح ہندوستانیوں کی حکومت میں شمولیت اور شرکت کے متعلق وہ حکمت عملی جس کا آغاز سر ٹامس اور لفنسٹن ایسے نیک طینت انگریزوں نے کیا تھا۔ اینگلو انڈین جماعت کے تعصب و تنافر کے جذبات کی بنا پر کچھ عرصہ کے لیے معرضِ التوا میں پڑ گئی۔ ایک معمولی انگریز سے لے کر وائسرائے

تک کو یہ احساس پیدا ہو گیا کہ وہ ایک ایسی قوم کا فرد ہے جو خدا کی طرف سے حکومت کرنے کے لیے منتخب ہوئی ہوئی ہے چنانچہ وہ مونٹ سٹورٹ کے حسب ذیل الفاظ کو جو انہوں نے ۱۸۵۰ء میں ایک خط کے سلسلہ میں تحریر کیے تھے بالکل بھول گئے۔

"اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں دائمی قبضہ کے خواب نہیں دیکھنے چاہئیں۔ بلکہ کوشش سے اس طرح عمل کرنا چاہیے کہ وہ ہمارے مفاد کے لیے بھی اور اُن کے (ہندوستانیوں کے) مفاد کے لیے بھی اور باقی دنیا کے لیے بھی بہتر ثابت ہو۔"

"اگر ہم باشندوں کو تعلیم دے کر (رتبہ میں) اپنے برابر کر لیں گے تو یہ ممکن نہیں کہ وہ اس پوزیشن پر قانع رہیں جو (ہم نے اس وقت) اُن کو دے رکھی ہے۔ جب تک وہ تمام ہندوستان پر اپنا حق ثابت نہ کر لیں گے خاموش نہیں بیٹھیں گے۔"

لارڈ میکالے کا بھی یہی خیال تھا کہ تعلیم کی اشاعت سے ہندوستانیوں کو حکومت خود اختیاری کے قابل بنایا جائے۔ اُن کے چند فقرات خالی از دلچسپی نہ ہوں گے۔

"... ہم اچھی حکومت قائم کر کے اپنی رعایا کو بطریق احسن اپنے پر حکومت کرنے کی تعلیم دے سکتے ہیں اور ممکن ہے مغربی علم کی تحصیل کے بعد وہ کسی آئندہ وقت پر یورپی نوعیت کے اداروں کے قیام کا بھی مطالبہ کریں۔ آیا وہ دن کبھی آئیگا جب وہ اس قسم کا مطالبہ کریں گے؟ میں اس کے متعلق اس وقت کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میں ایسے روز کے طلوع ہونے کو روکنے یا ملتوی کرنے کی ہرگز کوشش نہیں کروں گا۔ جب کبھی بھی ایسا دن آئے گا وہ دن ایسا ہوگا کہ تاریخ انگلستان میں اس پر سب سے زیادہ فخر کیا جایا کرے گا۔"

اگرچہ عام اینگلو انڈین جماعت یہ باتیں اور ایسے نیک نصب العین بھول چکی تھی لیکن انگریزوں کا ایک سمجھدار اور صاحب اختیار ایسا طبقہ موجود تھا جسے اپنے فرض کا احساس تھا اور جو اس امانت

کے سلسلہ میں جو اُن کو حکومتِ انگلستان کی طرف سے سپرد ہوئی تھی ایمانداری اور دیانتداری سے کام لیتے ہوئے ہندوستانیوں کو حکومت میں حصہ دینے کے حق میں تھا۔ اسی زیرک اور دور بین انگریز طبقہ کی بدولت ہندوستان کی سیاسی حالت بہتر ہوتی گئی حتیٰ کہ ۱۸۵۸ء کے اور سنہ ۱۹۰۰ء کے حالات میں زمین و آسمان کا فرق نظر آنے لگا۔ لیکن اسی پراپاغنڈا کے اثر سے جسے اینگلو انڈین آبادی نے ۱۸۶۲ء سے شروع کیا تھا کرزن ایسے مدبر انگریزوں کو بھی یہ فرق نظر نہ آسکا اور اُنھوں نے بھی اپنی تمام تر ہمدردی کے باوجود ہندوستان کی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا۔

"...... اپنے گرفتار کنندگان کے سامنے استادہ ایک حسین عورت نہ کوئی جس کا پرسانِ حال ہو اور نہ ہی معاون و مددگار۔ اکیلی ہو۔ نہ تو کوئی اُس کی زبان سمجھتا ہو اور نہ ہی اُسے کوئی جاننے والا ہو۔"

لارڈ کرزن ایسے دور اندیش شخص کو بھی اینگلو انڈین پراپاغنڈا سے دھوکہ ہوا اور اُنھوں نے ہندوستان کو پس ماندہ بہرہ اور اپاہج تصور کیا اور یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ بیداری جس کا احساس منرو لفنسٹن اور میکالے کی سی شخصیتیں قبل از وقت کر سکی تھیں پیدا ہو گئی ہے۔ اینگلو انڈین آبادی کی کوتاہ اندیشی اور بدنیتی کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ اصلاحات جو ۱۸۸۰ء کے قریب تفویض ہونی چاہیے تھیں ۴۰ سال بعد ۱۹۱۹ء میں نافذ العمل ہوئیں۔

لارڈ کرزن کی مندرجہ صدر ہندوستان کی لفظی تصویر کا مقابلہ اور موازنہ جو اُنھوں نے رومان کے پیرایہ میں کھینچی ہے گوکھلے کے حسب ذیل بیان سے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

"میں چاہتا ہوں کہ ہندوستان دنیا کے بڑے بڑے نیشنوں میں سیاست اقتصاد۔ صنعت۔ مذہب۔ ادب آرٹ اور سائنس گویا ہر پہلو سے اپنا مناسب درجہ حاصل کرے

ہیں یہ سب کچھ جانتا ہوں لیکن مجھے اس کا بھی پورا پورا احساس ہے کہ یہ خواہش بہتر اصلی اور حقیقی طور پر دولتِ برطانیہ کے ساتھ شامل رہنے ہی سے پوری ہوسکتی ہے۔"

لارڈ کرزن کے الفاظ اُن کے اپنے عہد کی خوشگوار اور امید افزا حالت کی تصویر نہیں ہیں۔ بلکہ عہد کمپنی کے وقت کی تاریکی کے مظہر ہیں۔ اُن کے یہ فقرے سنہ ۱۹۰۰ء کے قریب جس قدر ترقی ہوچکی تھی اس کا صحیح خاکہ پیش نہیں کرتے ہیں +

اس قسم کے نقصان دہ اور فتنہ پرداز رجحانات سے جو عام انگریزی طبقہ میں پیدا ہوگئے تھے ہمارے ہندوستان کے سیاسی مفاد کو بچانے کے لیے حکومتِ برطانیہ ہی ذمہ وار ہے اس نے ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو مسٹر مانٹیگو کی زبان سے اس لاثانی حکمتِ عملی کا اعلان دار العوام کے سامنے غیر مبہم الفاظ میں کرایا جس پر سرمنرو اور لفنٹس کے سے بیدار مغز انگریز بہت عرصہ پہلے کاربند ہوجانے کے متمنی تھے۔

لارڈ کرزن کا خیال تھا کہ ہندوستان میں دو قسم کی حکومت ہی ممکن ہوسکتی ہے اول خالص اور مطلق العنان نوکر شاہی کے ذریعہ دوسرے وائسرائے کے زیر نگرانی اور تابعِ فرمان نوکر شاہی کے ذریعہ۔ صاحب ممدوح موخر الذکر قسم کی حکومت کے حق میں تھے۔ لیکن انہیں ۱۹۱۷ء میں اپنی رائے کو بدلنا پڑا اور بحیثیت ممبر کابینہ مسٹر مانٹیگو کے حسب ذیل بیان کی تائید کرنی پڑی +

"ہندوستان میں اس کے ممالکِ محروسہ برطانیہ میں شامل رہ کر ذمہ وار حکومت کے بتدریج قیام کے پیش نظر حضور ملکِ معظم کی حکومت کی حکمت عملی یہ ہے کہ حکومتِ خود اختیاری کے اداروں کا تدریجی نشو و ارتقا عمل میں لایا جائے۔"

حکومتِ برطانیہ نے سب سے پہلا احسان جو ہندوستان پر کیا یہ تھا کہ زمامِ حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے لے کر اپنے ہاتھ میں لے لی اور بعد ازاں مناسب طریق پر ہندوستانیوں کیلئے

حکومتِ خود اختیاری کے نصب العین کی طرح ڈال کر اُس کے حصول کی سعی کی اور ہندوستان کے مفاد کو ان تمام مخالف تحریکات سے بچایا جو خود پسند انگریزوں کی طرف سے مختلف وقتوں میں جاری کی جاتی رہیں۔ اس بات کا ہی احساس کر لینا کہ ہندوستان کی حالت افریقہ امریکہ و آسٹریلیا سے مختلف ہے ایک بڑی بھاری خدمت تھی۔ اور یہی ایک بات تھی جسے قدامت پسند انگریز سمجھنے سے قاصر تھے۔ انفرادی حیثیت سے امریکہ افریقہ اور آسٹریلیا میں انگریزوں کی خود پسندی اور تحکم کی خو کامیابی سے قائم رہ سکتی تھی۔ کیونکہ ان ممالک کے اصل باشندے بالکل پس ماندہ اور غیر مہذب تھے لیکن ہندوستان کے باشندے ایک پرانی اور محکم تہذیب کے وارث تھے۔ اور یہاں انگریزوں سے پیشتر جو بھی حکومتیں قائم رہی تھیں خواہ مغلوں کی ہوں یا پٹھانوں کی اُنہوں نے باشندوں کو حکومت میں ہر قسم کے عہدے دیے تھے اور نہ صرف یہ بلکہ حکمران خاندانوں اور اُن کی اقوام نے بھی یہاں ہندوستان میں سکونت اختیار کر کے ہندوستانیوں پر یہ ظاہر ہی نہ ہونے دیا تھا کہ وہ ان سے مختلف ہیں۔ مغل اور پٹھان اگرچہ غیر ملکوں سے آئے لیکن انہوں نے یہاں کے باشندوں سے مل کر ان کی اعانت و ہمدردی سے ایک طرح سے ملی حکومتیں قائم کیں اور وہ حکومتیں صرف نام کے تعلق سے ہی حکمران خاندان کی قوم سے منسوب تھیں۔ برعکس اور ملکوں میں جہاں انگریز گئے یہ حالت نہ تھی۔ آسٹریلیا غیر مہذب تھا۔ افریقہ تاریکی میں تھا اور امریکہ کے باشندے بھی بالکل پس ماندہ تھے۔ لیکن ہندوستان کے باشندے آئینِ حکومت تجارت صنعت آرٹ حکمت۔ طب اور علم سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔ صرف فرق یہ تھا کہ اُن کی تہذیب مغربی تہذیب سے مختلف تھی۔ ان خصوصیات کی بنا پر انگریزوں کے عام طبقہ کی سینہ زوری اور حکومت پسندی کا دائمی طور پر کامیاب ہونا ناممکن تھا۔ حکومتِ برطانیہ نے اس کا احساس کیا اور قدامت پسند انگریزوں کے دلوں میں اس قسم کے خیالات اور رجحانات کے پیدا ہونے اور تقویت پکڑنے کو روکا۔ اس سے ہندوستان

کو سیاسی طور پر متحد ہونے کا اور بھی زیادہ موقعہ ملا +

ہندوستان کی طاقت اور کمزوری کا راز ایک ہی بات میں مضمر ہے۔ اس کی آبادی ۳۳ کروڑ نفوس پر مشتمل ہے۔ یہی اس کی کمزوری ہے اور یہی اس کی طاقت۔ ۳۳ کروڑ آبادی کو جو دو اڑھائی ہزار میل طویل و عریض ملک میں پھیلی ہوئی ہو متحد و متفق کر کے اس میں ایک مکمل اجتماعیت کی خصوصیتیں پیدا کرنا ازحد مشکل ہے۔ جماعت جتنی چھوٹی ہوگی اتنی ہی زیادہ فہمیدہ اور منظم ہوگی لیکن جوں جوں اس کے افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا تنظیم مشکل اور اتحاد مفقود ہوتا جائے گا۔ لیکن یہی ۳۳ کروڑ کی آبادی ہندوستان کے اب تک بصورت موجودہ تحفظ کی ذمہ دار ہے۔ امریکہ افریقہ اور آسٹریلیا میں اصل باشندے موجود تھے لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی۔ سفید اقوام کے لیے ان ممالک میں داخل ہوکر وہاں سے اصل باشندگان کا اخراج عمل میں لانا آسان تھا۔ ہندوستان میں انسانوں کا ایک خود رو جنگل بستا ہے اور ایسا جنگل جسے نہ کوئی اکھاڑ سکے نہ جلا سکے اور نہ اپنی جگہ سے ہلا سکے اور جو دن بدن بڑھتا ہی جائے۔ نہ پٹھان ہندوستان کو اصل باشندوں سے خالی کرا سکے نہ مغل۔ وہ آئے اور کچھ عرصہ امتیاز و عزت سے دن کاٹ کر بالآخر خود بھی اس انسانوں کے جنگل میں شامل ہو گئے۔ اسی طرح انگریز بھی اس انسانی جنگل کی پرورش ہی کر سکتے تھے نابید کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی البتہ وہ سلیقہ شعار مالیوں کی طرح اس میں روشیں بنا کر اس کی قدرتی خوبصورتی کو اور جلا دے سکتے تھے اگر مہذب آبادی اس قدر زیادہ نہ ہوتی تو امریکہ کے ریڈ انڈین افریقہ کی سیاہ اقوام اور آسٹریلیا کے جنگلی باشندے ہم سے کسی بات میں کم نہ تھے۔ یہی ایک نکتہ تھا جسے قدامت پسند حکومت کے خواہاں اینگلو انڈین سمجھنے سے قاصر رہے لیکن حکومت برطانیہ سمجھ گئی اور اپنے پیشرو مغل شہنشاہوں کی پیروی میں ملک کے عام سیاسی، اخلاقی اور تمدنی معیار کو بلند کرنے کے کام میں مشغول ہوگئی۔ اسی خدمت کے لیے وہ ہمارے شکریہ کی مستحق ہے +

اب ہم چند ایک ایسے نتائج کا ذکر کریں گے جو مغرب کے ساتھ رابطۂ اتحاد بڑھ جانے کی وجہ سے براہِ راست مترتب ہوئے اور جن کے بارہ میں خود عوام کی طرف سے اقدام ہوا۔

ہندوستان اور انگلستان کے سیاسی و تجارتی تعلقات کو اور مستحکم کرنے کے لیے ۱۸۶۹ء میں نہر سویز کی تعمیر کی گئی۔ اس نہر کی تعمیر سے نہ صرف ہندوستان انگلستان کے قریب تر ہو گیا بلکہ مشرق اور مغرب بھی آپس میں مل گئے۔ اس ملاپ سے مشرقی ممالک کو اور خاص کر بلادِ اسلامیہ کو اپنے تنزل کا مغربی ممالک کے اوج سے مقابلہ کرنے کا اور زیادہ موقعہ ملا۔ مشرقی ممالک کو اپنی پستی اور انحطاط کا جب احساس ہوا تو ایشیا کے طول و عرض میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ تمام مشرقی اقوام بیدار ہو گئیں اور اپنے اپنے مفاد کے تحفظ کی فکر میں لگ گئیں۔ اسلامی ممالک میں تحریک بین اسلامزم کا چرچا ہوا۔ مصر میں مہدی سوڈانی کی آواز کی گونج، ترکی میں سید جمال الدین افغانی پر خلیفہ عبدالحمید کی نظرِ کرم اور ایران میں مغرب زدہ نوجوان فریق کی ہستی اس اسلامی ہیجان کے ظاہری نشان ہیں اور اس سے خود مغرب بھی خائف ہوا۔ اسی طرح جاپان بھی مغرب کے نقشِ قدم پر چل کر اور اپنے کو اس کے ہتھیاروں سے چاک و چوبند کر کے خراجِ تحسین حاصل کرنے لگا۔ بھلا یہ مغربی خیالات جن کا ایشیا کے باقی ممالک پر اس قدر زیادہ اثر ہوا ہندوستان میں مقبولِ عام ہونے سے کیونکر رہ سکتے تھے اور خاص کر ایسی حالت میں جب کہ اُسے انگریزوں کی دن رات کی صحبت حاصل تھی۔ چنانچہ انگریزوں کی موجودگی اور مغرب سے میل ملاپ کی بنا پر جو سیاسی و مجلسی نتائج مترتب ہوئے انھوں نے حسبِ ذیل محسوس و مرئی صورتیں اختیار کیں:۔

(اول)۔ تحریک برہمو سماج۔ راجہ رام موہن رائے اور اُن کے قابل جانشینوں کی قابلِ قدر اور مخلصانہ کوششیں بار آور ہوئیں کئی سماجی خرابیوں کا استیصال ہوا۔ مختلف مذاہب کے پیروؤں کا باہمی تنافر گھٹا۔ اوہام پرستی اور جہالت کی بھی کسی حد تک بیخ کنی ہوئی۔ اور چونکہ اس وقت کلکتہ

ہندوستان کا دارالسلطنت تھا اس لیے یہی شہر انگریزوں اور دیگر یورپی لوگوں کی آماجگاہ تھا۔ مغرب اور مغربی خیالات کا اثر سب سے زیادہ اور سب سے پہلے اسی شہر پر ہوا اور پھر یہاں سے یہ اثر بنگال بھر میں پھیلا۔ بعد ازاں تحریک برھمو سماج کی مدد سے تمام ہندوستان میں سرایت کر گیا۔ اس سے وہ بالغ نظری اور فراخ دلی جو بنگالیوں کو مغربی اقوام کے لوگوں کی وساطت سے نصیب ہوئی تھی آہستہ آہستہ ہندوستان کے تمام باشندوں میں پیدا ہو گئی۔

دوم۔ آریہ سماج۔ ۱۸۷۵ء میں سوامی دیانند نے بمبئی میں آریہ سماج کی بنیاد ڈالی۔ دو سال بعد وہ لاہور تشریف لائے اور یہاں بھی آریہ سماج کا آغاز کیا۔ ان دو مرکزوں سے یہ ملی جلی مذہبی اور سیاسی تحریک تمام شمالی ہندوستان میں پھیلی۔ ہندوؤں میں مجلسی اصلاح اور ملی استحکام کا کام آریہ سماج نے نہایت تن دہی اور کوشش سے سرانجام دیا ہے۔ ہندوؤں کی سیاسی بیداری اور قومی اتحاد و اتفاق آریہ سماج ہی کی کوششوں کا مرہونِ منت ہے۔ آریہ سماج نے ذات پات کی تمیز کے خلاف جو ملیت کے منافی ہے جہاد کیا اور تعلیم کی اشاعت کے سلسلے میں بھی نہایت قیمتی خدمات سرانجام دیں۔ اسی فرقہ کی مساعی جمیلہ نے بالواسطہ اور بلاواسطہ ہر دو طریقوں سے ہندوستان کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا ہے۔

سوم۔ تھیاسوفیکل سوسائٹی۔ یہ سوسائٹی ۱۸۷۵ء کے قریب پہلے پہل امریکہ میں قائم ہوئی۔ اس کے بانی میڈم بلاوٹسکی ایک روسی خاتون اور کرنل اسکاٹ تھے۔ اس سوسائٹی کے قیام کا مقصد سنسکرت کا احیا اور دیگر علومِ شرقیہ کے بارہ میں تحقیق و تدقیق تھا۔ شروع میں آریہ سماج اور تھیاسوفیکل سوسائٹی میں اشتراکِ عمل رہا۔ اور ان کی متحدہ کانفرنسیں بھی ہوتی رہیں لیکن چونکہ ان دونوں تحریکوں کے اغراض و مقاصد میں بہت اختلاف تھا اس لیے بالآخر انہیں ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی اور سوسائٹی مذکور نے اڈیار واقعہ مدراس میں اپنا مستقل مستقر بنا کر کام کرنا

شروع کر دیا۔ اس سوسائٹی کے قیام نے بھی ہندوستان کی مکدر فضا کو ایک کافی حد تک صاف کرنے میں مدد دی۔

چہارم۔ تحریکِ سرسید۔ سرسید کو مسلمانوں کے عزل و انحطاط کا احساس پیدا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے وسیع پیمانے پر اُن کی تعلیم و تربیت کے بارہ میں کوشش شروع کی اور بہت قلیل عرصہ میں ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں بیداری کی روح پھونک دی۔ جو کام سوامی دیانند نے ہندوؤں کے لیے کیا وہی کام سرسید نے مسلمانوں کے لیے سرانجام دیا۔ مذہب کے بارہ میں ہندوؤں کی رجعت پسندی کو جس طرح سوامی دیانند کی شخصیت سے ایک ضرب کاری لگی اسی طرح مسلمانوں کی قدامت پرستی کو سرسید کی ہستی سے ایک پرزور دھچکا لگا۔ انہوں نے خیالات جدیدہ سے متاثر ہو کر قرآنِ شریف کا ترجمہ بھی کیا۔ لیکن اس سلسلہ میں اُن کے ہم مذہبوں اور خاص کر ملاؤں کی طرف سے اُن کی بہت دل شکنی ہوئی۔ علی گڑھ کالج جو ۱۸۷۵ء میں قائم ہوا۔ آپ ہی کی یادگار ہے۔

پنجم۔ انڈین ایسوسی ایشن۔ ۱۸۷۶ء میں بنگال میں انڈین ایسوسی ایشن قائم ہوئی جسکے اغراض و مقاصد یہ تھے کہ ہندوستان بھر کے باشندوں کو بلاتمیز مذہب و ملت مشترکہ سیاسی مفاد کی بنا پر متفق و متحد کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ تمام ملکی تحریکات میں عوام بھی حصہ لینے لگیں بہت کم عرصہ میں اس ایسوسی ایشن کی شاخیں ملک بھر میں قائم ہوگئیں اور یہ کلکتہ سے جو اس کا مستقر تھا اُن کی نگرانی اور نظم و ضبط کے بارہ میں خدمات سرانجام دیتی۔ اس کی پیروی میں بمبئی مدراس اور پونہ میں بھی اس قسم کی مجالس تنظیم قائم ہوگئیں۔ ان مجالس نے مجموعی طور پر ہندوستان کو سیاسی حیثیت سے متحد و متفق کرنے میں نہایت اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔

ششم۔ انڈین نیشنل کانگرس۔ ایلن آکٹیویس ہیوم نے ۱۸۸۵ء میں بمبئی میں

کانگرس کو قائم کر کے مورخہ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو اس کا پہلا اجلاس منعقد کیا۔ کانگرس متذکرۃ الصدر تمام سیاسی اداروں تحریکوں اور مغربی اثرات کا نچوڑ ہے۔ آغاز میں یہ سرکاری افسرانِ اعلیٰ کے زیرِ سایہ پرورش پاتی رہی اور اس کا کام ہر سال کرسمس کے دنوں میں اجلاس منعقد کرنے اور چند بے ضرر قراردادیں منظور کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن جوں جوں ملک میں سیاسی بیداری بڑھتی گئی اس کے ممبران کی سیاسی ذہنیت میں بھی ترقی ہوتی گئی۔ حتےٰ کہ اس کے مطالبات بڑھنے لگے اور اس کا لب و لہجہ بھی بدل گیا۔ اس سے حکومت کو قدرے خطرہ پیدا ہوا اور اس نے سختی شروع کی۔ لارڈ ڈفرن نے ظاہراً کانگرس کو مذموم قرار دے کر اس کی تقبیح بھی کی۔ اس سے کانگرس میں ایک جوش پیدا ہوا۔ لیکن بعد میں اسی وائسرائے کے ایک مکتوب محررہ ۱۸۸۸ء بنام وزیرِ ہند کی رو سے جو انہوں نے کونسلوں میں ہندوستانیوں کی نیابت کو بڑھانے کی حمایت میں لکھا تھا حکومتِ انگلستان نے ہندوستانی کونسلوں میں ہندوستانیوں کی نمائندگی میں توسیعات کر دیں۔ ان توسیعات کو ۱۸۹۲ء کی اصلاحات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ کانگرس کے ممبران کی توجہ ملکی تنظیم اور عوام کی سیاسی تربیت کی طرف سے ہٹ کر کونسلوں کے لئے ممبر منتخب ہو جانے کی طرف لگ گئی جس سے کچھ عرصہ کے لیے کانگرس کی سرگرمیاں رُک گئیں۔

تعطل کے اس دور کے گذر جانے کے بعد لارڈ کرزن کے عہد میں اُن کی قدامت پسندانہ استبدادی حکمتِ عملی کی بنا پر جب کانگرس کی دل شکنی ہوئی تو اس نے پھر صدائے احتجاج بلند کی جس سے ملک میں کچھ عرصہ کے لیے سیاسی اضطراب پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد پھر ایک عرصہ کے لیے ہنگامہ خیزیوں کے دور رک گئے اور کانگرس پر ایک خاموشی اور مردنی سی طاری ہو گئی اور اس کے سالانہ اجلاسوں نے بھی ایک رسمی سی صورت اختیار کر لی۔ یہ حالت جمود کافی عرصہ تک رہی۔ حتیٰ کہ اختتامِ جنگ کا زمانہ آ گیا۔ ہندوستان نے جنگِ عظیم میں انگلستان کے لیے ہر ممکن ایثار کیا اور

اُس کے ایثار کو تسلیم بھی کیا گیا اور یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ زمانہ امن میں اُس کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ یہاں اس وقت کے وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج کے الفاظ کا حوالہ دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

"ہندوستان نے مصیبت کے وقت برضا و رغبت جو ہماری گرانقدر اعانت کی ہے اس کی یادداشت کو جنگ کے ختم ہونے کے بعد محو نہیں کر دیا جائے گا۔"

جب جنگ کا خاتمہ ہوا تو مسٹر لائڈ جارج نے ازسرِ نو اپنے وعدہ کو حسب ذیل الفاظ سے تازہ کیا۔

"جب صلح کی کانفرس ہو تو اس میں ہندوستان کی ضروریات کو بھول نہ جائیں۔ چار سال تک متواتر ہمارے بھائیوں کے سے شاندار تعلقات قائم رہے ہیں۔ ان تعلقات کا یہیں پر خاتمہ نہیں ہو جانا چاہیے۔"

لیکن جب امن قائم ہوا اور ہندوستانیوں کی امیدوں کے برآنے کا وقت آیا تو اس وقت تک یہ تمام وعدے زینتِ طاقِ نسیاں ہو چکے تھے۔ جنگِ عظیم میں اتحادیوں کی فتح سے انگریزوں کا احساس برتری بدرجۂ اتم محکم ہو گیا اور اپنی قوت و استیلا کے نشہ سے وہ اور بھی سرشار ہو گئے۔ چنانچہ ہندوستان کے ساتھ اُس کی جنگی خدمات کے معاوضہ میں خسروانہ سلوک کرنے کی بجائے انہوں نے اسے اَور بھی دبانا چاہا۔ اسی دوران میں رولٹ ایکٹ کا اسمبلی میں پیش کیا جانا بارود پر چنگاری کے مترادف ثابت ہوا۔ ان تمام حالات سے ہندوستانیوں کی سخت دل شکنی ہوئی اور اس دل شکنی کی بنا پر کانگرس نے سنہ ۱۹۲۰ء میں تحریک عدم تعاون کا آغاز کیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک کانگرس سرگرم کار رہی ہے۔ البتہ گاہے گاہے تعطل کے وقفے بھی آتے رہے ہیں۔ کانگرس سیاسیاتِ ہند کی واحد نمائندہ ہے اور اسی کانگرس کے طفیل جس کی تکوین و تدوین انگریزوں کے ہاتھوں مغربی دستور کے

مطابق عمل میں آئی تھی ملک کو نہایت اعلےٰ پایہ کے ایسے سیاسی راہنما اور ہمدرد ملے جنہوں نے اپنی زندگیاں ملک و ملت کی خدمات کے لیے وقف کر دیں اور جو اپنے آخری لمحاتِ حیات تک ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں رہے۔

ہندوستان میں حکومتِ برطانیہ کی وساطت کے بغیر مغربی خیالات کی اس درجہ نشر و اشاعت ناممکن تھی۔ اگر حکومت برطانیہ ہندوستان میں قائم نہ ہوئی ہوتی تو ہندوستان کو اتنے مخلص اور بیدار مغز لیڈر کبھی میسر نہ آسکتے تھے۔ اس بارہ میں خود حکومت کی طرف سے ہندوستان کی اعانت ہوئی اور حکومتِ برطانیہ کا لائحہ عمل بھی یہی ہے کہ ہندوستان کو مغربی طریقہ کے مطابق حکومت خود اختیاری کے قابل بنایا جاسے۔ آئندہ کے تاریخ دان حکومت اور کانگرس کی باہمی کش مکش اور چشمک کو کچھ اہمیت نہیں دیں گے بلکہ وہ ان دونوں کو اپنی اپنی ہٹ پر پکے ہونے کے لیے حق بجانب تسلیم کرتے ہوئے اس آخری نتیجہ کو دیکھیں گے جو اُن کی باہمی کشمکش سے برآمد ہوا۔ یہ نتیجہ جو وہ اخذ کریں گے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوگا کہ عوام کے عام طبقوں کی سیاسی تربیت کانگرس کے مظاہروں اور حکومت کی طرف سے اُن کی روک تھام کے انتظامات سے آہستہ آہستہ مکمل ہوتی گئی حتےٰ کہ سب نے حکومت اختیاری کو مشترکہ طور پر اپنا نصب العین بنالیا۔

غیر ملکی حکومت کی موجودگی نے خود بخود لوگوں کے سامنے حق آزادی کے مشترکہ منتہا کو پیش کیا جس سے یہ بات کہ اُن کی اپنی ملکی حکومت ہونی چاہیے اُن کے باہمی اتحاد و اتفاق کے لیے ایک مستقل محرک بن گئی۔ نسل زبان اور مذہب کے تمام اختلافات عوام کے اس ایک مشترکہ حق کی یکسانیت کے سامنے سمٹ جایا کرتے ہیں۔ حق آزادی اور اُس کے حصول کے لیے مختلف طبقوں کی متحدہ مساعی ہندوستان میں ملیت کی بنیاد ہیں۔ حق آزادی کے اس مشترکہ نصب العین کی یکسانی کی اعانت تمام ملک کی یکسان آب و ہوا سے تربیت پانے والے ایک جیسے ہندوستانی

کیریکٹر سے ہوتی ہے۔ آب و ہوا کی یکسانیت۔ اور تمام ہندوستانیوں کی بالعموم یک دوسرے سے ملتی جلتی سیرت اور جغرافیائی لحاظ سے باقی ممالک سے اُن کی علیحدگی ملیت کے ایسے عناصر ہیں جو بذاتِ خود تو مذہب نسل اور زبان کے اختلافات کا مقابلہ نہیں کر سکتے لیکن جب اُن کے ساتھ عوام کے حق آزادی کے مشترکہ نصب العین کو شامل کر دیا جاتا ہے تو اُن کی نوعیت بالکل بدل جاتی ہے۔ ہندوستان کی یکسانیت کے ان تمام عناصر کو حکومتِ برطانیہ کے وجود سے تقویت پہنچی ہے۔ مغرب کی تعلیم جس کا موقعہ ہندوستانیوں کو یہاں حکومتِ برطانیہ کے اتفاقیہ قیام سے ملا ہے، یک نہ ایک دن ضرور ایک مکمل اور محکم ملت میں بدل دے گی۔ اسی خیال کو سر ابراہیم رحمت اللہ نے مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۳ء کے وقت اپنے خطبۂ صدارت میں ان الفاظ میں بیان کیا تھا:-

"میں ان شخصوں میں سے ہوں جو اس بات کے خواب دیکھتے ہیں کہ اگر ہندوستان میں ایک طویل عرصہ تک حکومتِ برطانیہ قائم رہی تو ہم حقیقی معنوں میں متحد ہو کر ایک ملت بن جائیں گے۔"

ہندوستان میں صحافت کی ترقی بھی مغربیت کے زیر اثر ہوئی۔ صحیفہ نگاری نے بھی ہندوستان کو اپنی اجتماعیت کا احساس پیدا کرنے میں کافی خدمات سر انجام دی ہیں۔ شروع میں کچھ اینگلو انڈین اخبارات جاری ہوئے اور سب سے پہلا شخص جس نے اخبار جاری کیا جیمز ہکس تھا اس نے ۲۹ جنوری ۱۷۸۰ء کو ایک ہفتہ وار اخبار جس کا نام "ہکیز بنگال گزٹ" تھا جاری کیا۔ یہ اخبار نیم سیاسی اور نیم اشتہاری نوعیت رکھتا تھا۔ اس کے اجرا کے قریباً ۲۰ سال بعد کے عرصہ کے دوران میں کئی اور اخبارات جاری ہوئے۔ مثلاً انڈین گزٹ۔ کلکتہ گزٹ۔ بنگال جرنل۔ انڈین ورلڈ۔ بنگال ہرکارو۔ ٹیلیگراف وغیرہ۔ اس زمانہ میں اخبارات کے ایڈیٹروں کو حکومت کے خلاف کچھ تحریر کرنے کے لیے یا تو قید کی سزا دی جاتی یا اخبار بند کر دیا جاتا یا ایڈیٹر کو جبراً واپس

یورپ بھیج دیا جاتا۔ ۱۸۶۴ء میں مسٹر ولیم ڈیوٹی کو جو اخبار "انڈین ورلڈ" کا ایڈیٹر تھا ایک اشتعال انگیز آرٹیکل لکھنے کی پاداش میں واپس یورپ چلے جانا پڑا۔ اسی زمانہ میں کلکتہ سے کئی ہندوستانی اخبارات بھی جاری ہوئے۔ ان اخبارات کو سیاسیات میں حصہ لینے کی تو کبھی جرأت نہ ہوئی لیکن توہم پرستی اور اور سماجی خرابیوں کی بیخ کنی کے لیے انہوں نے کافی کوشش کی۔ رام موہن رائے اور برج موہنا ایڈیٹران کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان دونوں حضرات نے مجلسی اصلاح کے کام میں کافی حصہ لیا لیکن آہستہ آہستہ جوں جوں وقت گذرتا گیا رائے عامہ میں ترقی ہوتی گئی اور ہندوستانی اخبارات کا نہ صرف لب و لہجہ ہی بدلنے لگا بلکہ اُن کی تعداد میں اضافہ بھی ہونے لگا اور بالآخر وہ زمانہ آیا جب ملک کے کونہ کونہ سے اخبارات جاری ہو گئے۔ مغربیت نے ہندوستان کی جو خدمات سرانجام دی ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کی بدولت ہندوستان میں اخبارات جاری ہو گئے اور اُن کے ذریعے ملک میں سیاسی و تمدنی ہر قسم کی بیداری عمل میں آئی۔ تمام مشرقی ممالک میں پہلے صحافت نہیں ہوا کرتی تھی اور چونکہ عوام نے کبھی اس طرف توجہ نہ دی تھی اس لیے فرمانرواؤں کو صحیفہ نگاری کے متعلق قوانین بنانے کی کبھی ضرورت ہی نہ پڑی۔ لیکن مغرب سے رابطۂ اتحاد بڑھ جانے سے تمام مشرق میں صحافت کا چرچا ہو گیا۔ مشرق میں شائد اس لیے بھی پہلے صحافت موجود نہ تھی کیونکہ لوگوں کو طباعت وغیرہ کے کام کا علم نہ تھا لیکن یورپ کے ساتھ تعلقات بڑھ جانے کے بعد تمام مشرقی ممالک میں اور خاص کر ہندوستان میں طباعت و اشاعت کا کام شروع ہو گیا جس سے اخبارات اور تمام ادبیات کا چرچا ہوا۔ ہندوستان اپنے موجودہ سیاسی ارتقا کے لیے مغربیت کا مرہونِ منت ہے اور مغربیت کے پھیلانے میں اخبارات نے کافی سے زیادہ حصہ لیا۔

ناخواندہ فرزندانِ وطن جو ایک غلام ملک کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے جنگِ عظیم میں

شامل ہونے کے لیے بھیجے گئے تھے اُنھوں نے جب آزاد ملکوں اور آزاد قوموں کو دیکھا تو انہیں آزادی اور آزادی سے مترتب ہونے والی برکات کے مقابلہ میں اپنی ذلت اور غلامی کا احساس ہوا اور جب وہ واپس ہندوستان آئے تو اُن کے غیر تربیت یافتہ دماغوں میں غیر منتشکل طور پر خواہش آزادی اور قومی عزت اور وقار کے جذبات جو موازنہ و مقابلہ مشاہدہ و تجربہ کی بنا پر پیدا ہو گئے تھے موجود تھے۔ اُنھوں نے دیارِ مغرب میں جو کچھ دیکھا تھا اسے یہاں اپنے بھائی بندوں میں بیٹھ کر بیان کیا جس سے مغربی سیاسی خیالات کی ایک حد تک نشر و اشاعت ہوئی۔ اور جب ہندوستان نے اختتامِ جنگ پر اپنی خدمات کے صلہ میں عطائے حقوق کا مطالبہ کیا تو یہ خیالات جن کی درآمد یورپ سے ہوئی تھی اس تقاضائے ملی میں ممد ثابت ہوئے۔ تحریکِ عدم تعاون میں ہندوستان کی دیہاتی آبادی قصباتی آبادی کے ساتھ شامل تھی۔ اور اس کے کامیاب ہونے کی وجہ بھی دیہاتیوں کی شمولیت تھی۔ اور اُن کی اس شمولیت کا باعث محاذِ جنگ سے واپس آتے ہوئے کثیر التعداد دیہاتی فوجی تھے جنھوں نے غریب کاشتکاروں اور مزارعوں کو آزاد ملکوں کی کہانیاں سنائی تھیں۔

اگر ہم ان تمام اثرات اور حالات کو جو ہندوستان میں انگریزوں کی موجودگی سے پیدا ہوئے نہایت اختصار سے بیان کرنا چاہیں تو اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ حکومتِ برطانیہ کی وساطت سے ہی مغربیت ہندوستان میں پھیلی ہے۔ سیاسیات میں مغربیت سے مراد چار چیزیں ہیں۔ (اوّل) لوگوں کا نفی خودی کی بجائے جو مشرق کا بالعموم روحانی نصب العین رہا ہے شہامتِ نفس کو مطمحِ نظر بنانا (دوم) شہامت نفس کی خاطر ارتقائے تشخص (سوم) ارتقائے تشخص کی وجہ سے جمہوریت پسندی اور ملت پرستی (چہارم) جمہوریت اور ملّیت سے مترتب ہونے والے نتائج یعنی فرد کی آزادہ روی اور اس کے ساتھ ہی اس کا احترامِ قانون۔ ان معانی میں مغربی تہذیب نے چانکیہ کے نظریہ در بارہ مطلق العنانیت شاہان کی نیز اسلامی علماء کے خوشامدانہ قول کی کہ بادشاہ ظلِ الٰہی ہوتا ہے تنسیخ

کی اس سے ملوکیت پرستی کم ہوئی اور عوام بھی اپنے آپ کو سیاسیات میں حصّہ لینے کے اہل تصور کرنے لگے۔ بالآخر یہی بات رائے عامہ کی ترقی کی ذمہ دار بنی۔ رائے عامہ میں ترقی ہو جانے کی طفیل ہندوستان اب جس مرحلہ پر پہنچ چکا ہے اس کی بلندی کا کمپنی کے عہد کی عام پست حالی سے مقابلہ و موازنہ خالی از دلچسپی نہیں۔ کتب تواریخ سے اس کا پتہ چل سکتا ہے۔

ہندوستان میں مسلموں کے آنے کے بعد اور مغربیت کی درآمد سے پیشتر ہند میں جمہوری خیالات کی نشر و اشاعت سکھوں نے بھی کی ہے۔ گرو گوبند سنگھ صاحب نے پانچ پیاروں سے امرت چھک کر یہ واضح کر دیا کہ سنگت کی رائے اور سنگت کے نمائندوں کی مرضی کے سامنے لیڈر کا سر تسلیم خم کرنا بھی ایک اصولی بات ہے۔ پنچایتوں کا نظام بھی ہندوستان میں جمہوریت کے خیال کی موجودگی کا پتہ دیتا ہے۔ جمہوری خیال کی موجودگی کا ایک اور آثار سکھوں کی گرمتا سنگت ہے۔ ان باتوں کے سوا مغربیت کی درآمد سے پہلے ہندوستان جمہوریت کے اصولوں سے عملی طور پر بھی اور ذہنی طور پر بھی لاعلم تھا۔ اس کی موجودہ جمہوریت پسندی حکومت برطانیہ اور مغربیت کے اثرات کا ہی نتیجہ ہے۔

تمام اختیارات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے (اول) اساسی (دوم) سیاسی۔ اساسی اختیارات طرز حکومت یا نظام حکومت کے تقرر و تبدل کے بارہ میں ہوتے ہیں اور ان کا تعلق حکومت کے ان بنیادی اصولوں اور دستوروں سے ہوتا ہے جن کے مطابق کہ وہ قائم کی گئی ہوتی ہے۔ یہ اختیارات ملک کے بادشاہ کو حاصل ہوتے ہیں اور اگر ملک میں آزاد جمہوری حکومت قائم ہو تو ان کا استعمال صرف جمہور کی طرف سے عمل میں آتا ہے۔

سیاسی اختیارات میں قانون سازی، شعبہ انتظامیہ، پریس، پلیٹ فارم اور رائے دہی وغیرہ کے متعلقہ اختیارات شامل ہوتے ہیں۔

جدید ہندوستان کی سیاسیات کا جہاں تک تعلق ہے سیاسی اختیارات کو بتدریج ہندوستانیوں کے ہاتھ میں منتقل کیے جانے کے اصول کو تسلیم کیا جا چکا ہے اور اسی اصول کے مطابق ۱۹۱۹ء کی نیز اس سے پیشتر کی اصلاحات کو نافذ کیا گیا تھا۔ اور آئندہ جو بھی نئی سیاسی اصلاحات ہوں گی وہ اسی اصول کے مطابق نافذ ہوں گی۔

ہندوستان کے سیاست دانوں کا وہ طبقہ جو ڈومنی اَن سٹیٹس کا مطالبہ کرتا ہے صرف سیاسی اختیارات کی تفویض چاہتا ہے۔ لیکن وہ انتہا پسند جو مکمل آزادی کے حامی ہیں نہ صرف سیاسی اختیارات بلکہ ان تمام اساسی اختیارات کے حاصل کرنے کے بھی خواہاں ہیں جو اس وقت صرف ملک معظم اور اُن کی پارلیمنٹ کو حاصل ہیں۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ کے اعلانِ آزادی سے انگلستان اپنی قدامت پرستی کے نقائص سے بخوبی متنبہ ہو چکا تھا اور اسی لیے ہندوستان کو سیاسی اختیارات کی تفویض کے بارہ میں اس نے زیادہ حیل و حجت سے کام نہیں لیا اور بالاقساط انہیں ہندوستانیوں کے سپرد کرنا شروع کر دیا ہے۔ کل سیاسی اختیارات یعنی ڈومنی اَن سٹیٹس کی تحصیل حکومت برطانیہ کے زیرِ تربیت جذبۂ ملیت کے مکمل اور مستحکم ہونے پر منحصر ہے۔

اکثر انگریزوں پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندوستانیوں کو جو پہلے ہی سے جماعتوں میں منقسم تھے آپس میں اور زیادہ تقسیم کر دیا ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں کچھ حقیقت ہو۔ لیکن ہمیں اس بات کو ہرگز ہرگز نہیں بھولنا چاہیئے کہ انگریزوں کے آنے سے پہلے اور اسلامی عہدِ حکومت کے دوران میں بھی ہندو اور مسلم ہندوستان میں اس طرح نہیں رہا کرتے تھے جس طرح کہ ہم قوم لوگ کسی ملک میں رہا کرتے ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی یہاں رہائش ایسی نہ تھی جیسے کہ ایک ہی باپ کی اولاد کی رہائش کسی ایک ہی مکان میں ہوا کرتی ہے۔ وہ محض ہمسایوں کی طرح رہا کرتے تھے۔ اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں برادری

کے تعلقات قائم تھے لیکن ان تعلقات کی نوعیت وہ نہ تھی جو بھائی بھائیوں کے باہمی تعلقات کی ہوا کرتی ہے۔ بیاہ شادی کے موقعوں پر ہندو مسلم ایک دوسرے کے ہاں آیا جایا کرتے تھے اور آپس میں بھاجی کا بھی رواج تھا لیکن جب مسلمانوں کے ہاں کوئی ایسی تقریب ہوتی تو وہ کچا اجناس خوردنی بطور رسد وغیرہ اپنے ہندو دوستوں کے گھروں میں بھیج دیتے اور ہندو بعض اوقات کچی بھاجی دیتے اور بعض اوقات کھانا وغیرہ بھی بھیج دیتے کیونکہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے ہاتھ کی پکائی ہوئی چیزیں کھا لینے سے انکار نہیں تھا۔ اگر یہ تعلقات ایسے ہوتے جیسے کہ اس وقت ہندوؤں اور سکھوں کے آپس میں ہیں اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے ساتھ ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھانے سے احتراز نہ ہوتا اور چھوت چھات بھی مفقود ہوتی تو اب تک کب کے ہندو مسلم ایک ہو گئے ہوتے + ان کو ایک ملت بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے ایسے تعلقات قائم کیے جائیں کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کے ساتھ ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھانے وغیرہ میں اعتراض نہ رہے اور مسلمانوں میں بھی ایسی فراخدلی پیدا کی جائے کہ وہ ہندوؤں سے بالکل مل جل جائیں تاکہ دونوں جماعتوں کے زبان تہذیب اور لباس وغیرہ کے باہمی اختلافات مٹ سکیں + کچھ عرصہ پہلے مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کے اس سلوک کے جواب میں کہ وہ ان سے چھوت کرتے ہیں ان سے چھوت کرنا شروع کر دیا تھا اور ان میں سے اکثر ہندوؤں کے ہاتھ سے لے کر یا اُن کی بنائی ہوئی کوئی چیز نہیں کھاتے تھے۔ عوام تو اس اصول پر سختی سے پابند ہو گئے تھے اور اب بھی کسی حد تک اس کے پابند ہیں لیکن تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے اس قسم کا بہت کم پرہیز ہے +

موجودہ ہندو مسلم اختلافات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے اور اس کا الزام جیسا کہ بیان کیا گیا ہے انگریزوں کے سر تھوپا جاتا ہے کہ وہ "حکمتِ جستن زتدبیرِ نفاق" کے اصول پر عمل کر رہے ہیں جس کی وجہ سے فرقہ وارانہ قبیح نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ہندو مسلم اختلافات اگر پہلے ظاہر نہ تھے تو اس کی بھی وجہ تھی اور وہ یہ کہ انگریزوں کے آنے کے بعد سب سے پہلے مغربی خیالات اور مغربیت کے اثر سے

ہندوؤں میں بیدار ذہنیت پیدا ہوئی اور اس کی وجہ کسی حد تک یہ بھی تھی کہ حکومت برطانیہ کے قائم ہونے سے ان پر ملوکی استبدادیت کا وہ دباؤ نہ رہا جو مطلق العنان مسلمان بادشاہوں کے عہدِ حکومت میں تھا۔ اِس بیدار ذہنیت کے طفیل ان میں قدرے خوشحالی آگئی اور پھر آہستہ آہستہ اُن کی خوشحالی میں اضافہ ہوتا گیا حتےٰ کہ مسلمانوں کو بھی جو بالکل قعرِ مذلت میں پڑے ہوئے تھے یہ احساس پیدا ہوا کہ ہندو ترقی کر گئے ہیں اور انہیں بھی کچھ کرنا چاہیے۔ اگرچہ ہندوؤں کی ترقی ایسی زیادہ نہ تھی لیکن مسلمانوں کو اس کا اپنی پست حالی سے مقابلہ اور موازنہ کرنے سے یہی بہت نمایاں نظر آئی۔ اِس سے ان میں بھی احساس بیداری پیدا ہو گیا۔ اِس کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں ترقی کے لیے ایک قسم کی دوڑ شروع ہو گئی ترقی کے لیے جو طریقہ ہندو اختیار کرتے ویسے ہی کسی اور طریقہ پر مسلمان بھی کاربند ہو جاتے۔ جس قسم کی تحریکیں ہندوؤں میں شروع ہوتیں ویسی ہی تحریکیں جیسا کہ پیشتر ذکر کیا گیا ہے مسلمانوں میں بھی شروع ہو جاتیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہی ہوتا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذاتی مفاد متصادم ہو جاتے۔ اور ان کے تصادم سے موجودہ صورتِ حالات پیدا ہوتی۔ یہ درست ہے کہ ۱۹۱۹ء سے پہلے یعنی نئی اصلاحات کے نفاذ سے پہلے فرقہ وارانہ ذہنیت ایسی شدید صورت میں کبھی رونما نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اس کی وجہ تھی اور وہ یہ کہ اس سے پہلے مسلمانوں کی طرف سے اپنے حقوق کے بارہ میں کبھی مطالبہ ہی نہیں ہوا کرتا تھا۔ اور وہ اپنے بُرے بھلے سے محض ناواقف تھے۔ اختلاف تو اسی وقت رونما ہو سکتا ہے جبکہ فریقین میں اپنے اپنے حقوق کے تحفظ کا سوال پیدا ہو چکا ہو۔ اگر اس قسم کا سوال ہی پیدا نہ ہو تو اختلاف کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟ ۱۹۲۲ء میں مسلمانوں کی طرف سے عطائے حقوق کے بارہ میں محسوس و مرئی صورت میں عملاً مطالبہ پیش کیا گیا جس پر یہ سب باتیں ظاہر ہو گئیں۔ جب یہ دونوں جماعتیں اقتصادی لحاظ سے ایک ہی سطح پر آجائیں گی تو اُس وقت یہ تمام اختلافات جس طرح رونما ہوئے ہیں اسی طرح مٹ بھی جائیں گے۔ لیکن سیاسیین کو اس خطرہ کا خیال رکھنا

چاہیئے جو دونوں جماعتوں کے باہمی توازن کے قائم ہوجانے پر ممکن ہے کہ ایک عام جمود کی صورت میں ظاہر ہو۔ اس وقت تک ہم نے جتنی بھی ترقی کی ہے اس کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ہندو مغربی خیالات سے متاثر ہوئے اور پھر مغربی ممالک کی ترقی اور خوشحالی کو دیکھ کر خود بھی ویسی ترقی کرنے اور ویسے خوشحال ہونے کے خواہشمند ہو گئے۔ اس سے اُن میں ایک سیاسی جماعت پیدا ہوئی جس نے عطائے حقوق کے بارہ میں اظہارِ اضطراب شروع کیا۔ اس نے سیاسی میدانِ عمل میں اپنی کوشش وکاوش، ایثار اور قربانی سے کچھ اہم نتائج بھی پیدا کیے۔ اس جماعت کے مطالبات اور برابری کے دعاوی اینگلو انڈین آبادی کو شاق گذرے اور اُس نے اوّل الذکر سے بدسلوکی کی۔ ان کی یہ بدسلوکی ۱۸۸۲ء میں البرٹ بل کی بنا پر اور زیادہ بڑھ گئی۔ اور بالآخر ہندوستانی سیاسی اضطراب کے لیے بذاتِ خود ایک محرک ثابت ہوئی۔ یہ سلسلہ کچھ عرصہ جاری رہ کر پھر بند ہو گیا۔ حتیٰ کہ ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم شروع ہوئی اور چار سالہ تباہی اور بربادی کے بعد ۱۹۱۸ء میں ہندوستان کو بھی ایک جھٹکا دے گئی جس سے ہندوستانیوں کی آنکھ کھلی اور انہوں نے ازسرِ نو عطائے حقوق کے پُرزور مطالبات کرنے شروع کیے۔ اس وقت تک مسلمانوں میں بھی کسی حد تک تعلیم کی اشاعت ہو چکی تھی اور ہندوؤں کی خوشحالی اور خوش بختی کو دیکھ کر ان کا رشک بھی انتہائی درجہ کو پہنچ چکا تھا۔ اور وہ بھی ان کی تقلید میں شاہراہِ ترقی پر گامزن ہونے کے لیے تیار تھے۔ ۱۹۱۹ء میں اصلاحات جاری ہوئیں اور جب مسلمانوں کو بھی کچھ حقوق ملے تو انہوں نے معلوم کیا کہ آئینی طور پر اگرچہ اُن کو حقوق ملے ہیں لیکن عملی طور پر کچھ نہیں ملا۔ اس سے ہندو مسلم کشمکش شروع ہوئی۔ ہندوؤں کے نزدیک ترقی کا معیار مغربی ممالک کی سی ترقی تھا لیکن مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے ترقی کا معیار وہ ترقی ہے جو ہندوؤں نے اب تک کی ہے۔ اس وقت دونوں جماعتیں بیدار ہو چکی ہیں اور ان میں آپس میں تقسیمِ حقوق کا جھگڑا یعنی دونوں جماعتوں کے ایک سطح پر آنے کا عمل جاری ہے

اس عمل کی تکمیل کے بعد جب دونوں جماعتیں ہر لحاظ سے برابر ہو جائیں گی تو ممکن ہے کہ مزید ترقی کے لیے کوئی محرک نہ رہے۔ اس وقت دونوں جماعتوں کو ترقی کی تحریک کسی حد تک اُن کی باہمی مسابقت اور رشک کی بنا پر ہو رہی ہے۔ اس سے ہندوؤں کی نظروں کے سامنے سے بھی مغرب کی سی ترقی کرنے کا نصب العین اوجھل ہو رہا ہے۔ اگر جماعتی توازن قائم ہو گیا جیسا کہ آئندہ دس بیس سالوں کے اندر اندر امید ہے کہ قائم ہو جائے گا تو موجودہ تمام سرگرمیوں اور آویزشوں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ عین ممکن ہے کہ اس مرحلہ کے بعد ہندوستانی جیسا کہ قدرتی بات ہے کچھ مدت سستانا چاہیں اور پھر سے ان پر ایک جمود کی سی حالت طاری ہو جائے۔ لہٰذا اس امر کی ضرورت ہے کہ مغربی ممالک کی ترقی کے معیار کو کسی طریقے سے ہندوستان کی نظروں کے سامنے بدستور قائم رکھا جائے تاکہ وہ معیارِ ترقی ہندوؤں اور مسلمانوں کی آئندہ ملی ترقی کیلئے مشترکہ محرک بنا رہے۔ رشک، حسد، مسابقت، جلن ہر جذباتی ذریعہ کا استعمال اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے جائز ہے۔

موجودہ سیاسی و اقتصادی امیال کا اگر خیال رکھ کر دیکھا جائے تو عین ممکن ہے کہ کسی مستقبل قریب میں جب کہ صنعتی ترقی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہو اشتراکیت کا خیال بالعموم پیدا ہو جائے لیکن ہماری اشتراکیت پسندی میں بھی مذہبی تعصب کی جھلک ضرور ہو گی۔ ہندو بلحاظِ سرمایہ مسلمانوں سے بہتر و برتر ہیں اب جب کہ بے روزگاری کی عام شکایت شدید طور پر پیدا ہو چکی ہے اور ملازمتیں بلحاظِ تعداد اتنی کافی نہیں ہیں کہ اعلیٰ تعلیم یافتگان کے لیے کافی ہوں۔ یہ لوگ صنعت و دستکاری کے پیشوں کی طرف رجوع کرنے لگے ہیں۔ صنعت و حرفت کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ سرمایہ ہندو جماعت کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ آئندہ کے صنعتی و تجارتی سرمایہ دار یا کارخانہ دار یہی لوگ ہوں گے اور محنت مسلمان اور دیگر پس ماندہ جماعتوں کی ہو گی۔ قدرتاً کچھ عرصہ کے بعد محنت و سرمایہ کی کشمکش جاری ہو جائے گی۔ اس کشمکش کے بڑھ جانے کے بعد سیاسی انقلاب ایک حقیقتِ ثابتہ ہو گا۔ سیاسی

انقلاب سے حالات بد سے بدتر بھی ہو سکتے ہیں اور بدترین سے خوشترین بھی۔ لیکن اول الذکر نتیجہ ہی زیادہ اغلب ہوا کرتا ہے۔ اس انقلاب سے وابستہ خطرات سے بچاؤ کی ابھی سے تدبیر کرنا لازمی ہے اور یہ تدبیر ماسوائے اس کے کیا ہو سکتی ہے کہ ہندو اور مسلم جماعتوں کو سیاسی و اقتصادی طور پر بہت جلد ایک دوسرے کے برابر کر دیا جائے۔ اس بارہ میں جو کوشش کی جائے گی موجودہ ہندو نسلوں کی نظروں میں اگرچہ قابلِ مذمت ہوگی لیکن آئندہ کے ہندوستان کی بہتری کا راز اسی میں پنہاں ہے۔

ہندو مسلم اتحاد کے پیشِ نظر ایک اہم ضرورت جس کی طرف دونوں جماعتوں نے کشیدگی کی بنا پر کبھی توجہ نہیں کی ان کے باہمی ازدواجی تعلقات ہیں۔ عام طور پر مسلمانوں میں یہ خیال موجود ہے کہ بروئے شریعت مسلمان صرف اہلِ کتاب اقوام کی عورتوں کے ساتھ شادیاں کر سکتے ہیں یعنی عیسائی اور یہودی عورتوں کے ساتھ اُن کی شادیاں جائز ہیں۔ اور دیگر مذاہب کی پیرو عورتوں کے ساتھ مثلاً ہندو یا آتش پرست عورتوں کے ساتھ اُن کی شادیاں نہیں ہو سکتیں۔ اکبر نے ہندو عورتوں کے ساتھ شادیاں کیں اور شہزادہ سلیم اُن کی جے پور والی ہندو بیوی کے بطن سے تھے۔ اُن کی یہ بیوی راجہ بہاری مل والئے جے پور کی دختر تھیں۔ ظاہراً اکبر کی ایک ہندو عورت سے شادی خلاف شریعت ہے اور ادب مانع ہے کہ سلیم کے متعلق جو بعد میں اکبر کے جانشین ہوئے کیا کہا جائے۔ یہ امر فیصلہ طلب ہے کہ تخت و تاج کی وراثت کا حق اُن کو بروئے شرع کہاں تک پہنچتا تھا۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ وہ اکبر کے بعد تخت نشین ہوئے اور ایک مدت حکومت بھی کرتے رہے اور پھر اُن کے بعد اُن کی اولاد بھی تخت و تاج کی وارث بنی۔ نہ صرف یہ کہ اُن کی اپنی بیوی ہندو تھی۔ بلکہ شاہ جہان اور اورنگ زیب کی بیویاں بھی ہندو تھیں۔ یہ ممکن نہیں کہ اس زمانہ میں اس مسئلہ کے متعلق علماء نے کوئی فتوےٰ نہ دیا ہو۔ لیکن تاریخ اپنی موجودہ صورت میں اس امر پر روشنی نہیں ڈالتی کہ آیا ان ہندو عورتوں نے جو حرمِ شاہی میں داخل ہوئیں اسلام قبول کیا تھا یا نہیں۔ اگر مسلمان

ہوگئیں تھیں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر وہ بدستور ہندو ہی رہی تھیں تو یہ سوال غور طلب ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ آیا اس وقت یہ سوال اُٹھایا گیا تھا اور اگر اُٹھایا گیا تھا تو علمائے کرام نے اس پر کیا فتاوے صادر کیے تھے۔ تاریخ اس بارہ میں خموش ہے۔ موجودہ وقت میں مسلمانوں کی طرف سے اظہارِ مسرت کیا جاتا ہے کہ مغلوں نے ہندوؤں سے ڈولیاں لیں۔ ان کا یہ اظہارِ مسرت فرقہ وارانہ ذہنیت کی بنا پر ہوتا ہے۔ لیکن اُن کو ازروئے شرعِ اسلامی ان شادیوں کے جائز ہونے کے بارہ میں کبھی شکوک پیدا نہیں ہوئے۔

اِس کے علاوہ جب کبھی کوئی ہندو کسی مسلم عورت سے شادی کرتا ہے اور وہ مسلم عورت شادی کے بعد بھی مسلم رہتی ہے اور اس کے بطن سے اولاد ہوتی ہے تو اس اولاد کے جائز قرار دیے جانے کے متعلق شکوک کا اظہار ہونے لگتا ہے اور کوئی مسلم اس ہندو کی ایسی نرینہ اولاد کو اپنی لڑکی یا لڑکیاں دینے کے لیے یا اس کی لڑکیوں کے ناتے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ اُن کا باپ ہندو ہے۔ حالانکہ مغل بادشاہوں کے بارہ میں وہ فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے ہندوؤں کی لڑکیاں لیں۔ اور اس فخر کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ مغل بادشاہ مسلمان تھے۔ مسلمانوں کے لیے اس کے متعلق کہ ان کا فخر کہاں تک جائز ہے کوئی فیصلہ کرنا بروئے انصاف لازمی ہے۔

اِس کے علاوہ عام شرعِ اسلامی پر عمل کرنے کا معاملہ ہے۔ پنجاب میں رواجِ عام کو شرع کے احکامِ وراثت پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اسی طرح گجرات اور بمبئی کے کوچی میمنوں اور کھوجوں پر شرع کا اطلاق ہونے کی بجائے ہندو لا عائد ہوتا ہے اور مسلمان اس بات کو گوارا کر رہے ہیں۔ ایسی حالت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی ازدواجی تعلقات کے متعلق کیوں اس قدر تنگ دلی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہندو اور مسلمان یکساں طور پر اس مسئلہ کی

طرف توجہ دیتے ہوئے فراخ دلی سے کام لیں۔ جب تک اس معاملہ کی طرف توجہ نہیں دی جائیگی ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک ہونا مشکل ہے۔ ازدواجی تعلقات کی بنا پر ہندو مسلم اتحاد کے نصب العین کے حاصل کرنے میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔

نتیجہ

سابقہ ابواب میں ہندوستان کے حالات کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ کسی شرح کا محتاج نہیں۔ ہندو اور مسلم دو بڑی جماعتیں ہیں۔ ان میں زبان؛ تہذیب و تمدن، مذہب، گذشتہ تاریخی واقعات و حوادث اور نسل کی بنا پر اختلاف اور تضاد موجود ہے اور یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ غیر ملکی حکومت کی ماتحتی نے کوئی ایسا مشترکہ منتہا یا نصب العین ان کے سامنے رکھ دیا ہے جس کے متعلق وہ متفق اور متحد ہیں۔ بے شک سوراج کا مطمح نظر مشترکہ طور پر اُن کے سامنے ہے لیکن اُن میں سے ہر ایک جماعت صرف اپنے لیے سوراج کی متمنی یا سوراج حاصل کر کے اپنی برتری کی متمنی ہے۔ نیز اُن میں سے ہر ایک میں یہ خواہش بدرجۂ اتم موجود ہے کہ وہ اپنی ہستی کو علیحدہ اور دوسری سے الگ برقرار رکھے۔ ادغام کے خوف سے دونوں جماعتیں نہ تو ملکی کانفرنسوں میں اور نہ ہی انگلستان کی گول میز کانفرنسوں میں کوئی دلخواہ اور مفید مطلب سمجھوتہ کر سکی ہیں۔ لیکن ہم ان تمام باتوں کے باوجود ملتِ ہندیہ کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے۔ غیر ممالک کی نظروں میں ہندوستان کا باشندہ خواہ مسلم ہو یا ہندو ہندی ہے۔ ملّتِ ہندیہ کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب تمام باشندوں کا کسی غیر ملک کے باشندوں سے خواہ وہ مسلم ہوں یا عیسائی یا کوئی اور مقابلہ کیا جائے۔ اس ناقابلِ تشریح باہمی ملیت کا احساس خود مسلمانوں اور ہندوؤں کو بھی ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر اگرچہ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں

انگلستان یا دیگر کسی مغربی ملک کی سی ملت نہ تو قائم ہے اور نہ ہی مستقل قریب میں قائم کی جا سکتی ہے یعنی ہندوستان میں ایسی ملت کا قیام جو افراد کے اختلاط، ارتباط اور باہمی اعتماد سے قائم ہوتی ہے فی زمانہ مشکل ہے۔ یہاں کی ملت افراد کے بلا واسطہ طور پر رشتۂ اتحاد و اتفاق میں منسلک ہونے سے معرضِ وجود میں نہیں آسکتی۔ دونوں جماعتوں کے افراد اپنے بنیادی اختلافات کی بنا پر باہمدگر ہمرنگ و ہم آہنگ ہو کر مغربی قسم کی ملت کی تکوین و تدوین نہیں کر سکتے۔ لیکن جماعتی تعاون و اتحاد کی بنا پر ایک ملت جیسا کہ اب بھی موجود ہے اور مستحکم کی جا سکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دونوں جماعتیں علیحدہ علیحدہ استحکام حاصل کریں حتےٰ کہ اُن میں سے ہر ایک بذاتِ خود محکم مکمل، مستوی اور متشکل ہو جائے۔ اور پھر دونوں اپنی اپنی جماعتی حیثیت سے ایک دوسری کی آواز پر لبیک کہتی ہوئی بڑھیں اور باہم متعہد اور منعقد ہو جائیں۔ یہ فیڈرل قسم کی ملیت ہوگی۔ ہندو جماعت اس امر کو کہ سرحد پار کے تمام ممالک مسلم ہیں شک کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اس سے ایک نتیجہ اخذ ہوتا ہے اور وہ یہ کہ وہ مسلم جماعت کو جو زیادہ تر شمال مغربی سرحدوں پہ آباد ہے اپنے سے علیحدہ اور غیر ملکی مسلموں سے متحد سمجھتی ہے۔ اور یہ بھی امر واقعہ ہے۔ کہ ہندی مسلم غیر ہندی مسلموں سے بہت مختلف واقع ہوئے ہیں۔ ایک طرف تمدنی اثرات سے وہ ہندوؤں سے مانوس ہیں اور دوسری طرف ہم مذہب ہونے کی وجہ سے انہیں غیر ہندی مسلموں سے ہمدردی ہے یعنی کہ اگر ہندو چاہیں کہ وہ اُن میں کھپ جائیں تو یہ بھی مشکل ہے اور اگر غیر ہندی مسلم چاہیں کہ وہ اُن سے کسی قسم کا سیاسی اتحاد کریں تو یہ بھی امر دشوار ہے۔ نسل، زبان، ملک، آب و ہوا کی بنا پر وہ ہندوؤں سے زیادہ قریب ہیں۔ اور یہ قربت اُن کے غیر ہندی مسلموں سے سیاسی اتحاد کے نقیض ہے۔ وہ بذاتِ خود اپنی ہستی آزادانہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ ہندوؤں کے ساتھ وہ اس طرح شامل نہیں ہو سکتے کہ ہر پہلو سے ہندو ہی معلوم ہونے لگیں۔ البتہ ملیت کے نقطۂ نظر سے صرف ہندوؤں سے ہی ناتا جوڑ سکتے ہیں اور وہ بھی فیڈرل قسم کا، جس سے اُن کی ہستی بھی برقرار رہ سکے اور ملت بھی قائم ہو جائے

ہندوؤں کا یہ خوف کہ ہندی مسلم غیر ہندی مسلموں سے نہ مل جائیں اگرچہ ذاتی تحفظ کی بنا پر ہے لیکن اِس سے ایک اور پہلو بھی نکلتا ہے اور وہ یہ کہ ہندو نہیں چاہتے کہ ہندی مسلم ہندی ہو کر غیر ملکی باشندوں سے خواہ وہ مسلم ہی کیوں نہ ہوں رشتہ گانٹھیں۔ گویا کہ اُن کا مسلمانوں پر زیادہ حق ہے۔ مگر بایں ہمہ ہندو دھرم اور ہندو سماج اُن کو اپنے میں شریک کرنے سے معذور ہیں۔ لہذا ہندوؤں کے نزدیک مسلم ایک مختلف جماعت ہے جو اگرچہ ہندو نہیں لیکن ایسی غیر ملکی بھی نہیں جیسے کہ پٹھان، ترک یا ایرانی۔ اِس سے بھی یہی نتیجہ مترتب ہوتا ہے کہ دونوں جماعتیں بحیثیت فریقِ مختلفہ ایک سیاسی معاہدہ کی رو سے ایک ہو سکتی ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہندو یہ نہیں چاہتے کہ اُن کی ہستی مسلمانوں میں کھو جائے اور مسلمان بھی نہیں چاہتے کہ ہندو دھرم میں جذب ہو کر اُن کی ہستی مٹ جائے اُن کی یہ خواہش ایک معمولی واقعہ سے واضح ہو سکتی ہے جو مجھے ایک دفعہ کلکتہ میں پیش آیا میں ایک مسلم وکیل کے ہاں ٹھیرا ہوا تھا۔ بنگالی ہندو اور بنگالی مسلم ظاہریت کی بنا پر ایک دوسرے سے بہت ملتے جلتے ہیں اور اس صوبہ میں ایک نو وارد کے لیے ہندو سے مسلم کو تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے وکیل صاحب کا ایجنٹ آیا میں سمجھا کہ آنے والا ہندو ہے اور چونکہ ان دنوں کلکتہ میں ہندو مسلم فسادات جاری تھے مجھے مسلم حلقہ میں ایک ہندو کو آتے دیکھ کر حیرانی سی ہوئی۔ میں نے طریقہ سے اُس ایجنٹ سے پوچھا کہ آیا وہ ہندو ہے۔ وہ صاحب کچھ چونک اُٹھے اور کہنے لگے ایک مسلمان ہو کر مسلمان کو نہیں پہچان سکتے۔ میں نے کہا بھلا میں کس طرح پہچانتا جیسے یہاں کے ہندو سر اور پاؤں سے ننگے، ململ کا کرتہ پہنے رہتے ہیں ویسے تم بھی سر اور پاؤں سے ننگے ہو اور باتیں بھی بنگالی ہی کرتے تھے۔ صورت وشکل بھی عام بنگالیوں کی، خواہ وہ مسلم ہوں یا ہندو ایک سی ہے۔ میں کس طرح پہچانتا۔ اُس نے اپنے تہ بند کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ دھوتی نہیں تہ بند ہے اور اسی لیئے ہم نے دھوتی کی بجائے تہ بند کا استعمال زیادہ شروع کر دیا ہے تاکہ ہم میں اور

ہندوؤں میں تمیز ہو سکے ۔ یہ ترہند سُرخ رنگ کا چار خانہ کپڑا تھا ۔ اِس سے ظاہر ہے کہ بنگال جیسے صوبہ میں بھی جہاں ہندو اور مسلم بلحاظ زبان، خدوخال اور لباس ایک دوسرے کے بہت قریب ہو چکے ہیں یہ حالت ہے کہ ایک مسلم فرد نہیں چاہتا کہ اُسے ہندوؤں کے ساتھ شامل کر کے ہندو مسلم کی تمیز اُڑا دی جائے ۔ اگرچہ کسی غیر ملک میں مثلاً انگلستان میں ہندو افراد اور مسلم افراد اپنی اپنی جماعتوں کو نظر انداز کر کے ہندی ہو سکتے ہیں ۔ لیکن ہندوستان کی فضا میں وہ جماعتی طور پر ہندو اور مسلم ہی رہیں گے ۔ ہندو پہلے ہندو ہو گا اور پھر ہندوستانی ۔ اور اسی طرح مسلم پہلے مسلم ہو گا اور پھر ہندوستانی ۔ لہٰذا قرینِ مصلحت یہی امر ہے کہ دونوں جماعتوں کو ایک دوسری سے الگ استحکام اور استوا حاصل کرنے دیا جائے اور پھر باشندوں میں انفرادی طور پر جذبۂ ملیت پیدا کرنے کی بجائے جماعتی معاہدہ سے ملت کی نشو ونما کی جائے ۔

لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ ملیت بذاتِ خود ایک نصب العین ہے ۔ محکوم ممالک کے لیے ملیت کی نصب العین پر اس لیے زور دیا جاتا ہے تاکہ اس جذبہ کے تحت ابنائے وطن کو متحد و متفق کر کے حاکم قوم کے مقابلہ کے لیے کھڑا کیا جائے اور آزادی حاصل کی جائے ۔ لیکن آزاد ممالک ملیت پر اس لیے زور دیا کرتے ہیں تاکہ اپنے باشندوں کے احساسِ برتری کو قائم رکھ کر دیگر کمزور ممالک کو کچلا جا سکے یا اگر وہ زیرِ فرمان ہوں تو ان پر اپنی حکومت کو برقرار رکھا جا سکے ۔ اِن ہر دو صورتوں میں جذبۂ ملیت بذاتہٖ ایک نصب العین ہوتا ہے ۔ ہندوستان کے حالات کے پیش نظر ملیت کسی اور ارفع نصب العین مثلاً آزادی کے لیے ایک ذریعہ ہے اور بذاتِ خود ایک نصب العین نہیں ۔ ہندوستان کے لیے ہندو مسلم کی مشترکہ ملیت سلطنتِ برطانیہ میں رہ کر اقتصادی و سیاسی آزادی کے حصول کا ایک ذریعہ ہے لیکن ایسا ذریعہ جو کافی عرصہ تک بذاتِ خود ایک نصب العین بنا رہے گا ۔ اس نصب العین

کے مکمل حصول پر ممکن ہے کہ سیاسی منتہائے کمال کے بارہ میں دونوں جماعتوں میں اختلافِ رائے پیدا ہو اور وہ اپنا اپنا رُخ مختلف سمتوں کی طرف بدل لیں۔ موجودہ وقت میں ہمارا نصب العین ملت ہے۔ کیونکہ اسی نصب العین سے دونوں جماعتوں کے مشترکہ مفاد وابستہ ہیں۔ ہاں اس سیاسی نصب العین کے حصول کے بعد جو منتہائے کمال ہوگا۔ اس کے بارہ میں نہیں کہا سکتا کہ آیا وہ ان دونوں جماعتوں کے نزدیک کہاں تک یکساں ہوگا۔ نہیں معلوم کہ اُس وقت کے مسلمان شمال مغربی ملکوں کے ہم مذہب لوگوں کی طرف جھکیں گے یا ہم وطن و ہم سیرت ہندوؤں سے وابستہ رہیں گے۔ مختلف انسانی گروہوں کی فطرت کے بھی دو عنصر ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو نسل، آب و ہوا۔ حالاتِ ماضی و حال کی یکسانی کی وجہ سے قدرتی طور پر تربیت پاتا ہے۔ یعنی اصلی فطرت اور دوسرے وہ جو مصنوعی طور پر خاص حالات و اثرات کی بنا پر بن جاتا ہے مثلاً تہذیب مذہب۔ تمدن۔ رسم و رواج وغیرہ کے اثرات سے یعنی فطرتِ ثانوی۔ جہاں تک اصلی فطرت کا تعلق ہے مسلمان ہندوؤں کے قریب تر ہیں۔ اور جہاں تک فطرتِ ثانوی کا تعلق ہے جو بطورِ عادت سیرت میں شامل کی جاتی ہے وہ شمال مغربی علاقوں کے غیر ہندی مسلموں سے قرابت دار ہیں۔ اس امر کا فیصلہ کرنا آئندہ حالات پر منحصر ہے کہ مسلمان ہندوؤں سے وابستہ رہیں گے یا سرحد پار کے مسلمانوں سے رشتہ اتحاد گانٹھیں گے یا بطورِ خود ایک علیحدہ ملت بننے کی کوشش کریں گے۔ اگر ایسے حالات پیدا کر دیے جائیں کہ اصلی فطرت ثانوی فطرت پر غلبہ پالے اور ساتھ ہی دونوں جماعتوں کو اقتصادی مفاد بھی مشترکہ ہو کر انہیں ایک دوسرے کا دست نگر کر دیں تو سیاسی منتہائے کمال کے بارہ میں بھی وہ متفق ہو سکیں گی اور اس کے حصول کے لیے ان میں اشتراکِ عمل پیدا ہو سکے گا۔ لیکن اس قسم کے مفید حالات کا پیدا یا نہ پیدا ہونا مستقبل کے حالات پر منحصر ہے۔

باب هفتم

چند مباحث

چند مباحث

ادبی تعلیم اور صنعتی تربیت

جذبۂ ملی سے متاثر ہو کر اکثر محکوم اقوام اپنا بہت سا وقت بہت سا روپیہ اور بہت سی محنت حاکم اقوام کے خلاف سرگرمیوں اور سازشوں پر فضول صرف کر دیا کرتی ہیں لیکن حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ اگر اس تمام محنت وقت اور زر کو ملک کی اندرونی اصلاح کے کام پر صرف کیا جائے تو بہت جلد ایسے مفید نتائج بر آمد ہو سکتے ہیں جو ملی ترقی بہبود اور خوشحالی کے لیے مہمیز کا کام دیتے ہیں۔ ہندوستان کی بلاواسطہ ملی ترقی کی تمام راہیں مسدود ہیں۔ ملک کی سیاسی و اقتصادی پس ماندگی اس کے لیے ذمہ دار ہے اگر ملک کے بہی خواہ اپنی تمام سرگرمیوں کو ملک کی اندرونی مجلسی اصلاح اور دیگر ترقی کے کاموں کے لیے وقف کر دیں تو بہت جلد رائے عامہ میں ایک ایسی عظیم الشان تبدیلی پیدا ہو سکتی ہے جس سے ملیت کے نصب العین کی تحصیل نہایت آسان ہو جائے گی۔ اس وقت تک جس قدر ترقی ہوئی ہے وہ کسی لائحہ عمل کے مطابق سمجھ سوچ کر کام کرنے سے نہیں ہوئی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ حالات کے جبر سے ہم خاص رستوں پر چلنے کے لیے مجبور تھے۔ ملک میں انگریزوں کے تسلط سے مغربیت پھیلی اس سے متاثر ہو کر ہم نے پہلے تو مغربی دستوروں اور طریقوں کی نقل کرنا سیکھا۔ بعد میں جوں جوں وقت گذرتا گیا یہی نقل اصل کی صورت اختیار کرتی گئی۔ مغرب کی پیروی کرنے سے جاپان نے جو ترقی کی اس میں وہ ہندوستان کی مغربیت پسندی میں یہی فرق ہے کہ جاپان میں جو کچھ ہوا وہ شعوری طور پر ایک

خاص پروگرام کے مطابق عمل کرنے سے ہوا۔ لیکن ہندوستان میں جو کچھ بھی ہوا تقلیدًا ہوا یا حالات کی مجبوری سے کیا گیا۔ لہذا وقت بھی زیادہ صرف ہوا اور اس نصب العین کا حصول بھی ابھی مشکل اور منزلوں دور ہے۔ ہندوستان کی عام ترقی کی ذمہ دار غیر کاشتکار اور غیر فوجی جماعتیں ہیں۔ زندگی کی جدوجہد نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنی روزی کمانے کا کوئی ذریعہ تلاش کریں۔ انگریز ایسی تاجر قوم کے عہد کے آغاز میں یہ ذریعہ روزگار ماسوائے اس کے کیا ہو سکتا تھا کہ یورپ کی ان تجارتی فرموں کی ایجنٹ بن جائیں جو اپنی تیار کردہ صنعتی اشیا کی ہندوستان میں درآمد کرتی تھیں یا انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دفتروں کی ماتحت ملازمتوں میں شامل ہو جائیں۔ تلاشِ روزگار کی اسی ضرورت کی بنا پر انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ نیز مغربی فرموں اور کارخانوں سے تعلقات پیدا کر کے تھوک فروشی یا خوردہ فروشی کی معمولی دکانیں بھی کھول لیں۔ لہذا مغربیت کا اثر ہندوؤں کی ایسی ذاتوں پر ہوا مثلاً کھتری۔ روڑے۔ کالستھ۔ اگروال وغیرہ اور مسلمانوں کی ایسی ذاتوں پر مثلاً شیخ ککے زئی کھوجے وغیرہ۔ آہستہ آہستہ جوں جوں ہندوستان میں غیر ملکی اشیا کی مانگ بڑھتی گئی ان لوگوں کی خوشحالی میں بھی اضافہ ہوتا گیا حتٰی کہ انہوں نے اعلٰے تعلیم کی طرف توجہ کی۔ سوسائٹی کا درمیانہ درجہ جو بلحاظِ تعلیم و تربیت باقیوں کے مقابلہ میں بہت آگے ہو گیا ہے زیادہ تر انہیں لوگوں پر مشتمل تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی یا ان کی خوشحالی کو دیکھ کر باقی ذاتوں نے بھی جو کاشتکار اور فوجی تھیں تعلیم کی طرف توجہ کی لیکن تعلیم حاصل کرنے سے ان کی غرض ملازمت سرکار کے علاوہ اور کچھ نہ تھی۔ ملازمتِ سرکار میں کاشتکار اور فوجی جماعتوں کے شمول سے غیر کاشتکار اور غیر فوجی جماعتوں کا کسی قدر اخراج ہوا اور یہ بات ان کی توجہ کو تجارت کی طرف اور زیادہ لگانے میں ممد ثابت ہوئی۔ اس سے ان کی خوشحالی اور دولت میں پہلے کی نسبت چارگنا اضافہ ہو گیا۔ موجودہ زمانہ میں ملازمتِ سرکار میں سے کاشتکار اور فوجی جماعتوں کے ہاتھوں نہایت تیزی سے ان

جماعتوں کا اخراج عمل میں آ رہا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ حالات اول الذکر کو بھی یو پی فرموں کی ایجنسیاں حاصل کرنے اور خوردہ فروشی کی دکانیں نکالنے پر مجبور کر رہے ہیں اور عین ممکن ہے کہ بہت جلد یہ جماعتیں غیر کاشتکار اور غیر فوجی جماعتوں سے تجارتی کاروبار میں بھی حصہ طلب کرنا شروع کر دیں۔ جب اس صورتِ حالات کی تکمیل ہو جائے گی تو اس وقت غیر فوجی اور غیر کاشتکار جماعتوں کی توجہ صرف صنعت و حرفت ہی کی طرف لگ جائیگی اور صنعت و حرفت کی ترقی کا آغاز اس وقت سے ہوگا جب کہ ملازمتوں اور کاروبار سے غیر کاشتکار اور غیر فوجی جماعتوں کا پورا پورا اخراج ہو جائے گا اور جب اُن کو اپنی روزی کمانے کے لیے اس طرف توجہ دینے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آئے گا + موجودہ حالات اُن کو صنعت کی طرف توجہ دینے پر مجبور کر رہے ہیں۔ ملک کا زندگی بسر کرنے کا عام معیار نسبتاً بلند ہو چکا ہے لیکن اس کو قائم رکھنے کے لیے اس کی فی کس آمدنی کافی نہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ وقت میں قلتِ سرمایہ اور اجناس کی قیمتوں کا گر جانا بھی فوجی اور زراعت پیشہ اقوام کو تجارت اور ملازمت کی طرف بیش از پیش توجہ دلا رہا ہے۔ چونکہ یہ جماعتیں پس ماندہ ہیں اور ان میں اتنی جدت نہیں کہ کسی نئی چیز کی طرف رجوع کر سکیں اس لیے ان کی توجہ کو صرف غیر فوجی اور غیر کاشتکاروں کی مقابلتاً خوشحالی اور اس کے ذرائع اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں۔ اس وقت فوجی اور کاشتکار جماعتیں ملازمت کی غرض سے تعلیم پر یا بعض حالتوں میں دوکانداری پر زور دے رہی ہیں۔ ان کا ان پیشوں کی طرف توجہ دینا غیر کاشتکاروں اور غیر فوجیوں کو اپنی روزی کی تلاش کے لیے کسی اور ذرائع کی جستجو کرنے پر مجبور کرنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا ان جماعتوں کا صنعت و حرفت کی طرف متوجہ ہونا لازمی ہے۔ موجودہ وقت میں اُن میں کم از کم یہ احساس پیدا ہو چکا ہے کہ انہیں صنعت و حرفت کو ذریعۂ معاش بنانا چاہیے۔ اس احساس کو عملی صورت دینے کے لیے دانستہ طور پر کسی

تحرک کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے ۔ غیر کاشتکار جماعتوں کا میلانِ طبع عملاً دستکاری کی ترقی کی طرف رہا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد ترقی کی علمبردار ان جماعتوں کی پیروی میں فوجی اور کاشتکار جماعتیں بھی اس طرف توجہ دینا شروع کر دیں گی ۔ موجودہ حالت یہ ہے کہ اگرچہ دیہاتیوں کی تعلیم کی طرف مقابلتاً زیادہ توجہ دی جانے لگی ہے لیکن تعلیم سے اُن کی غرض و غایت محض ملازمتیں حاصل کرنا ہے ۔ زمینداروں کے لڑکے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد شہروں کی سہولتوں کو چھوڑ کر واپس دیہات میں جانا پسند نہیں کرتے اور شہروں میں رہنے کی خاطر معمولی ملازمتیں حاصل کر کے اپنا وقت کاٹتے ہیں ۔ ترقی تعلیم کی رفتار کو اس قدر زیادہ تیز کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو جائے اور ہر قسم کی ملازمت سرکاری یا غیر سرکاری کی ضرورت کے پورا ہو جانے کے بعد بھی اُن کی اتنی زیادہ تعداد باقی بچ رہے کہ ان کا قصبات میں رہنا محال ہو جائے اور وہ مجبوراً خود بخود واپس دیہات میں چلے جائیں ۔ اس مراجعت سے نہایت خوشگوار اثرات پیدا ہوں گے ۔ جب تعلیم یافتہ لوگ دیہات میں جا کر بود و ماند شروع کریں گے تو دیہاتی آبادی کے تعقل و تفکر کی عام سطح بھی بہت بلند ہو جائے گی اور اس سے بہت سی برائیوں کا قلع قمع ہو جائے گا ۔ مثلاً دیہاتیوں میں حاکم پرستی کی بجائے احترام قانون کا جذبہ پیدا ہو گا اور اس سے ہمارے شعبۂ انتظامیہ کا اخلاقی معیار بہتر ہو جائے گا ۔ نیز دیہات میں تعلیم یافتہ طبقہ کے ایسے انتشار سے زراعت کو ترقی ہو گی اور کئی ایک نقصان دہ رسوم بھی مٹ جائیں گی ۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کی حوصلہ افزائی اور اعانت سے گھریلو دستکاریاں بھی ہر دلعزیز ہو جائیں گی اور اس طرح دیہاتیوں کو مصروفیت نیز اپنی آمدنی بڑھانے کا ایک اور ذریعہ دستیاب ہو جائے گا ۔ دیہاتی غربت سے نجات پائیں گے اور وہ خوشحال ہو کر ملکی ترقی کے کام میں قصباتی آبادی کا ہاتھ بٹانے لگیں گے ۔ جس سے ملت کا استحکام عمل میں آئے گا ۔

ممکن ہے کہ کہا جائے کہ اگر تعلیم یافتہ آبادی کی تعداد میں یک لخت بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تو بے روزگاری بڑھ جائے گی اور اس سے سخت اضطراب اور بدامنی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو گا۔ اس اعتراض کا پیش کرنا ملت کے لیے کسی قسم کا ایثار کرنے سے انکار کرنا ہے۔ آج سے قریباً تین صدی پہلے کے ہندوستانیوں نے اپنے حال کی خاطر ہندوستان کے مستقبل کو قربان کر دیا اور اس گناہ کی پاداش میں اُن کی اولاد کو بہت تلخ تجربات کرنے پڑے اور جب تک اس گناہ کا دانستہ طور پر کفارہ نہیں دیا جائے گا ہندوستانی اپنی بہتری اور بہبودی کی توقع نہیں کر سکتے۔ کفارہ کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہم اپنی آئندہ نسلوں کی خاطر اور ہندوستان کے مستقبل کے لیے اس وقت اپنے حال کی قربانی پیش کریں اور اس سے جو مصیبتیں وارد ہوں انہیں برضا و رغبت جھیلیں۔

اس سلسلہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ موجودہ طریقۂ تعلیم میں مفید اور مطابق ضرورت تبدیلی کی جائے موجودہ طریقۂ تعلیم کے مطابق صرف ادبی پہلو پر زور دیا جاتا ہے جس سے طلبا جسمانی محنت و مشقت کے عادی نہیں رہتے اور وہ اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو عار سمجھنے لگتے ہیں ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے سکولوں اور کالجوں میں صنعت و حرفت کی بھی تعلیم دی جائے تاکہ طلبا جسمانی محنت کے عادی ہوں اور سکول یا کالج چھوڑنے کے بعد اُن کا مطمحِ نظر صرف ملازمت ہی نہ ہو بلکہ اس کے علاوہ روزی کمانے کا کوئی اور بھی ہنر اُن کے پاس ہو۔

علمِ تعلیم کا مقصد جسمِ انسانی کے تین اعضا یعنی دست، دل اور دماغ کی تربیت ہوتا ہے۔ صنعتی تعلیم کا مقصد کسی فن کے بارہ میں مہارتِ تامہ حاصل کرنا ہے اور یہ دست یعنی انسانی ہاتھ سے متعلق ہے۔ دل کی تربیت سے غرض ایک بلند سیرت اور محکم شخصیت پیدا

کرنا ہوتا ہے۔ دماغ کی تربیت سے مراد یہ ہوتی ہے کہ شخصی فطانت و ذہانت کو صیقل کیا جائے ہندوستان میں مروجہ طریقۂ تعلیم کا مقصد نہ تو دل کی درستی اور نہ ہی دماغ کی تربیت ہے۔ یہاں تعلیم کی غرض مغرب کی اندھا دھند تقلید ہے۔ چونکہ کوئی خاص مقصد سامنے رکھ کر تعلیم نہیں دی جاتی اس لیے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ادبی عشرت کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ناولوں قصے کہانیوں شاعری تمثیلوں ایسے اصنافِ ادب کا بطورِ شغل اور وقتی کٹی مطالعہ کرنے لگتے ہیں۔ جدت، تخلیق اور ذوقِ عمل کا عنصر اُن کی سیرت میں سے ہمیشہ اور ہمیشہ کے لیے کالعدم ہو جاتا ہے۔ دنیا کے تمام ممالک میں کسی خاص مقصد کو مدِنظر رکھ کر تعلیم دی جاتی ہے۔ گذشتہ زمانہ میں بھی ایسا ہی تھا۔ مثلاً سپارٹا میں تعلیم کا مقصد اچھے جنگجو پیدا کرنا۔ ایتھنز میں قابل سیاسیئین۔ روم میں بہترین ناظم اور عامل وغیرہ۔ اسی طرح قرونِ وسطیٰ میں عیسائیت کی تعلیم کا مقصد نیک اور بلند فطرت راہب پیدا کرنا تھا۔ موجودہ زمانہ میں انگلستان کی آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیاں اعلیٰ شخصیت اور بہتر دل و دماغ رکھنے والے افراد پیدا کرتی ہیں۔ جرمن یونیورسٹیاں بہترین ملت پرست اور محبانِ وطن پیدا کرتی ہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔ لیکن ہماری یونیورسٹیاں کس قسم کے اشخاص پیدا کرنے پر تلی ہوئی ہیں؟ تابع فرمان شخصیت سے معرا بہترین قسم کے کلرک اور محرر۔ یا مطالعۂ ناول کے ایسے دائم المریض جو چار پائیوں پر پڑے اوروں کے علمی شاہکاروں کی داد دے سکیں۔ لیکن خود حیات کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کے نااہل ہوں۔

اگر ہندوستان واقعی ملیت کا خواہاں اور جمہوریت کا دلدادہ ہے تو اس کی یونیورسٹی تعلیم کا کوئی نہ کوئی بلند نصب العین ہونا چاہیے۔ جمہوریت پسند اور ملت پرست تمام ملکوں میں تعلیم کی غرض و غایت ایسے اعلیٰ شہری پیدا کرنا ہوتا ہے جن کی ذاتِ والاصفات سے ملت اور جمہور کو ہر ممکن فائدہ پہنچ سکے۔ اگر ہندوستان حقیقی طور پر دنیا کے باقی ممالک کی ہمسری چاہتا

ہے تو لازمی آن والے باغیرت اور فہمیدہ شہری پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہیے ۔ یونیورسٹیاں اس کام کو سرانجام دے سکتی ہیں ۔ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ہر قسم کی تعلیم کے نصابوں میں خواہ اُن کا واسطہ دل سے ہو یا دماغ سے یا ہاتھوں سے کم از کم ان پانچ مضامین یعنی اخلاق ۔ اقتصاد، قانون، سیاست اور ملکی تاریخ کے مبادی کو ضرور شامل کرنا چاہیے ۔ کیونکہ ایک بہتر اور مفید ملت شہری کے لیے ان پانچ مضمونوں کے متعلق کم و بیش واقفیت رکھنا ضروری ہے ۔ علم اخلاق کی تعلیم سیرت کی تربیت کے لیے ضروری ہے اور علمِ اخلاق سے انسان کو نیکی کے بنیادی اصولوں اور ان کی غرض و غایت کا علم ہوتا ہے اور وہ اُن کی ضرورت کو محسوس کرنے لگتا ہے ۔ اقتصاد اس لیے ضروری ہے کہ ملی مفاد کے مدِنظر ہر شہری کے لیے عام ملکی اور قومی مالی حالت اور کاروباری سلسلہ کے متعلق کچھ نہ کچھ علم رکھنا مفید ہے ۔ قانون اور سیاست کا علم اس لیے ضروری ہے تاکہ ملت کے ہر فرد کو معلوم ہو کہ وہ کس قانون کے تابع ہے اور اس کا دستورِ اساسی کیا ہے جس کے زیرِ ہدایت اور جس کی حمایت میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے ۔ تاریخ کا علم اس لیے ضروری ہے تاکہ اسے اپنے وقت کے سیاسی مسائل کی تہ تک پہنچنے کے لیے گذشتہ ملکی واقعات کے علم سے مدد ملے اور ملت کے مختلف عناصر کے لیے ان غلطیوں کے اعادہ کا امکان نہ رہے جن کے ارتکاب سے سابقین پر اور ملک پر کوئی مصیبت وارد ہوئی ہو ۔ نیز اس لیے کہ قومی ابطال کے کارہائے نمایاں کے مشترکہ فخر کی بنا پر ملت کی ضمنی جماعتیں ایک دوسری سے پیوست رہیں ۔ ان مضامین کے مبادی کو ایک ہی درسی کتاب میں شامل کر کے اگر نصابِ تعلیم میں شامل کر دیا جائے تو عام طلباء پر اس کا اچھا اثر پڑے گا ۔ یونیورسٹیوں کو اپنے پرانے مقصد کو ترک کر کے اس نئے مقصد کو اپنا نصب العین بنانا چاہیے ۔

اگر ہماری یونیورسٹیاں قوم کو ذوقِ عمل رکھنے والے دماغ اور دردآشنا دل مہیا کر دیں

تو ہندوستان بھر میں زندگی کی ایک بلند و بسیط لہر دوڑائی جا سکتی ہے۔ اس وقت عام ناخواندہ آبادی سے تعلیم یافتہ طبقہ کا تناسب ۳ فیصدی ہے۔ اگر آبادی کے اس ۳ فیصدی حصّہ کو ہی صحیح تعلیم دی گئی ہوتی تو یہ اَور ملکوں کے ایسے ۲۵ فی صدی یا اس سے بھی زیادہ طبقہ کے برابر ثابت ہوتا۔ کیونکہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ مشرق میں اکثر تن تنہا اشخاص نے اپنے اپنے مشنوں کو مکمل اور اپنی اپنی تحریکوں کو کامیاب بنایا ہے۔ ہم نے ابھی تک اُس اثر قبول کرنے کی صلاحیت کا اندازہ نہیں کیا جو ہمارے ناخواندہ اور پس ماندہ طبقوں میں موجود ہے۔ اگر ہم میں اچھے شہری پیدا ہو جائیں اور پھر ان میں سے بات کو کر دکھلانے والے ایسے لیڈر نکل آئیں جو اصلاح کے کام کو شروع کریں تو تمام ملک اُن کی آواز پر لبیک کہنے کو تیار ہو گا۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہماری درسگاہیں ایسے باآواز ہونہار پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔ ہندوستان کی بہبودی کے لیے ۳ فی صدی خواندہ آبادی کچھ کم نہ تھی۔ لیکن افسوس ان کی تعلیم و تربیت غلط طریقہ اور غلط مقصد کے پیش نظر ہوئی جس سے بہت سا قومی وقت، روپیہ اور محنت اکارت گئی۔ یونیورسٹیاں اور معلمین اس گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں۔ اُن کے لیے اس کی تلافی کرنا لازمی ہے۔ اگر وہ نامساعد حالات کا عذرِ لنگ پیش کریں تو ان کا ایسا کرنا اپنے پر ذوقِ عمل سے بے بہرہ ہونے کا الزام ثابت کرنا ہے +

اس عمر میں جب کہ انسان کا طالب علمی کا زمانہ ہوتا ہے دل ہر قسم کے اثرات کو قبول کرنے کی بدرجۂ اتم اہلیت رکھتا ہے اور پروفیسر کے منہ سے نکلے ہوئے چند الفاظ نیز اُس کے اپنے کریکٹر کی ذاتی مثال شاگردوں کی سیرت کو ہمیشہ کے لیے بدل دینے کا اعجاز رکھتی ہے۔ جرمن اور انگلش۔ نیز دیگر یورپی ملتوں کی تکوین و تدوین کا عمل سکول اور کالج ہی میں شروع ہو جاتا ہے ہمارے کالجوں کے پروفیسروں کی ذاتی مثال کی تقلید قومی تخریب کا باعث ہے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر کو اپنے اس اہم ترین فرض کی اہمیت کا احساس نہیں کہ ملت کی تشکیل کا کام اُن کے سپرد

ہے۔ ہمارے کالجوں کے پروفیسران کی طبائع کے رجحان سوشل سٹار بن کر تعلی و تفاخر کے فطری تقاضات کی تسکین ڈھونڈنے کی طرف زیادہ مائل ہیں۔ اس کی بجائے انہیں طلبار کی حقیقی تعلیم و تربیت کی طرف دھیان دینا چاہیے تاکہ ملکی ترقی اور ملی کامیابی کا سہرا اُن کے سر ہو۔ انہیں چاہیے کہ ایسے طریقے اختیار کریں کہ ان کی کوشش کاوش محنت اور اثر سے ٹھوس اور خیر انگیز نتائج پیدا ہوں۔ تحکم اور نام و نمود چاہنے کے مقابلہ میں ذوقِ تخلیق اور اصلاح کی خواہش بہت بلند اور قابلِ تحسین جذبات ہیں

مزید برآں مختلف جماعتوں کے اپنے اپنے ادبی کالجوں کے مزید اجراؤ قیام کی اب حوصلہ شکنی کی جانی چاہیئے۔ ان کالجوں کی موجودگی سے فرقہ واری کی روح بڑھتی اور پھیلتی ہے۔ لیکن اتنے فرقہ دار سکولوں اور کالجوں کو جو اب تک قائم ہو چکے ہیں یک لخت بند کر دینا بھی درست اور آسان کام نہیں۔ البتہ ان میں فرقہ وارانہ خیالات کی نشو و نما کو روکنے کے لیے کوئی اس قسم کی کارروائی کرنا خالی از مصلحت نہیں ہوگا مثلاً مسلمانوں کے کالجوں اور سکولوں میں خود حکومت کی طرف سے یا پبلک کی طرف سے غیر مسلم طلبا کے لیے کافی تعداد میں وظائف رکھے جائیں۔ اور یہ وظائف غیر مسلم مثلاً ہندو اور سکھ ایسے طلبا کو دیے جائیں جو اپنی ذاتی قابلیت اور مستحسن سیرت کی بنا پر ہم وطن مسلم جماعت کے ہم درس اور ہم مکتب طلبا سے اپنا احترام کرا سکیں۔ اِسی طرح ہندوؤں اور سکھوں کے سکولوں اور کالجوں میں مسلم طلبا کے لیے وظائف رکھے جائیں۔ اِس کا اثر یہ ہوگا کہ زمانہ طالب علمی ہی میں مختلف جماعتوں کے طلبا ایک دوسرے سے مانوس ہو جائیں گے اور اُن میں وسعت نظری اور فراخدلی پیدا ہو جائے گی۔ کسی قوم کے کالج یا سکول میں کسی غیر قوم کے طلبا کی موجودگی اس قوم کے طلبا کی نظروں میں اپنی قوم کے لیے احترام پیدا کرنے میں ممد ہو گی۔ آئندہ جو پرائیویٹ سکول یا کالج کھولے جائیں وہ عام پبلک کے لیے ہونے چاہئیں نہ کہ کسی خاص جماعت کے لیے +

موجودہ طریقۂ تعلیم کا یہ ایک بڑا بھاری نقص ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی طبائع کچھ ایسی نازک بن جاتی ہیں کہ وہ غیر تربیت یافتہ اور ناخواندہ ابنائے وطن کی صحبت میں بیٹھنے یا ان سے ملنے جلنے سے گریز کرنے لگتے ہیں۔ ان میں یہ اہلیت ہی نہیں رہتی کہ اپنے ادراک و فکر کی بلندیوں سے نیچے اتر کر عوام کے ناخواندہ طبقوں سے اُن کی سمجھ اور دانست کے مطابق اس طرح ملیں اور گفتگو کریں کہ جس سے اُن کو اپنی نااہلیت اور پس ماندگی کا تکلیف دہ طریقہ سے احساس نہ ہونے پائے اور وہ بغیر جھجھک اور رکاوٹ کے اُن کی صحبت سے فیض حاصل کر سکیں تعلیم اگرچہ کتب اور مدارس کے بغیر نہیں ہو سکتی لیکن تعلیم یافتگان اپنے فہم و ذکا سے جو نتائج اخذ کر سکتے ہیں اُن سے تو عوام کو زبانی مطلع کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسی صورت میں جبکہ خود تعلیم یافتہ لوگ عوام سے ملنے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں اُن کی ذات سے اس معمولی قومی خدمت کی توقع بھی کیونکر ہو سکتی ہے۔ طریقۂ تعلیم ایسا ہونا چاہیے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص ناخواندہ برادرانِ وطن کے لیے چشمۂ ہدایت بن جائے اور ہر کس و ناکس اُس کی ذات سے فیض حاصل کر سکے۔ لیکن موجودہ طریقۂ تعلیم سے ایسی طبائع پیدا ہوتی ہیں جو عوام سے علیحدگی اختیار کرنا پسند کرتی ہیں۔ اِس کے علاوہ طلباء میں تصنع اور دکھاوا زیادہ بڑھ رہا ہے۔ یہ بات کیریکٹر اور شخصیت کے بنانے میں مانع ہے۔ طریقۂ تعلیم کے اس نقص کو دور کرنا ازحد لازمی ہے۔ تعلیم کی مزید نشر و اشاعت کے ساتھ طلباء میں ذوقِ عمل پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ان کی طبیعتیں تن پرستی کی طرف سے ہٹ کر سخت کوشی محنت کشی اور اجتہاد کی طرف مائل ہوں۔ عمل کے بغیر ادبی تعلیم محض ایک عشرت ہے۔ اقبال کے حسب ذیل اشعار سے اس نکتہ کی وضاحت ہوتی ہے :-

"من آن علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را"

دیگر

بہر نرخے کہ ایں کالا بگیری سود مند افتد
بزورِ بازوئے حیدر بدہ ادراک رازی را"

اس کے علاوہ جہاں تک ادبی و صنعتی تعلیم و تربیت کا تعلق ہے مغرب سے فیضان حاصل کرنے کے سلسلے کو منقطع نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ مغرب سے رابطۂ اتحاد رکھنے سے جمہوری و ملی خیالات کی نشو و نما ہوتی رہتی ہے۔ تمام مشرق میں زمانہ ماضی کے مطلق العنان ملوک کے اثرات سے جمہوریت اور حریت پسندی مٹ چکی تھی۔ گزشتہ دو تین صدیوں میں عوام میں جمہوریت اور حریت پسندی کے خیالات کی از سرِ نو نشو و نما ہوئی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مغرب سے ہمارے تعلقات قائم رہیں تاکہ آزادی و دیگر ایسے خیالات کی سرایت بدستور ہوتی رہے۔ مشرق میں اسلام نے جمہوریت کی عملی طور پر تعلیم دی لیکن ملوکیت نے اسلامی جمہوریت کی روح کو غارت کیا۔ لہٰذا اس اندیشہ کو دور کرنے کے لیے کہ آئندہ کسی جاہ طلب خود غرض کو ملوکیت کو فروغ دینے کی دوبارہ خواہش نہ پیدا ہو سکے یہ ضروری ہے کہ عوام کی ذہنیت کو مغربی ممالک سے میل جول رکھ کر جمہوری اور ملی خیالات سے اچھی طرح مملو کر دیا جائے۔

دستکاری اور صنعت کا جہاں تک تعلق ہے ہندوستانی سرمایہ داروں کو چاہیے کہ کارخانے جاری کرنے کے لیے اگر انہیں ماہرین کی خدمات کی ضرورت ہو جیسا کہ شروع میں ضرورت ہوا کرتی ہے تو امریکہ اور یورپ کی طرف رجوع کرنے سے بیشتر وہ کسی ایشیائی ملک سے مثلاً جاپان سے ضروری قابلیت رکھنے والے ماہرین حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اگر ایسا کیا جائے گا تو اس سے کفایت شعاری ہو گی۔ جاپانی یا ایشیائی ماہرین کو زیادہ مشاہرات نہیں دینے پڑیں گے نیز چونکہ وہ ایشیائی ہوں گے اس لیے ان کی طبیعتوں میں رعونت اور تحکم کے عناصر

پیدا ہونے کا جیسا کہ امریکی یا یورپی ماہرین کے بارہ میں تجربہ ہوا ہے خطرہ نہیں ہوگا۔ نیز سرمایہ داروں کو جو صنعتی کارخانے کھولنا چاہیں ایسے ماہرین سے اس قسم کے معاہدے کر لینے چاہئیں کہ جن کی رو سے وہ ہندوستانیوں کو کم از کم وقت میں مکمل اصطلاحی کام سکھانے کے بعد خود اپنے وطنوں کو واپس چلے جائیں۔ ہمیں صنعت و حرفت کے بارہ میں جاپان کی تقلید کرنے کی ضرورت ہے۔ جاپانی حکومت نے جب دستکاری وغیرہ کے کارخانے کھولے اور اُسے غیر ملکی ماہرین کی خدمات کی ضرورت پڑی تو اس نے بھی ان سے ایسے معاہدے کیے کہ جن کی رو سے ان ماہرین کے لیے لازمی تھا کہ وہ جاپانیوں کو کم از کم وقت میں کام سکھا کر اپنے ملکوں کو واپس چلے جاتے۔

صنعت و حرفت کی ترقی کے بارہ میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنا زندگی بسر کرنے کا معیار زیادہ بلند نہیں کرنا چاہیے۔ یعنی اچھی خوراک اور ضروری پوشاک کے علاوہ باقی عشرت کی غیر ضروری اشیا کے استعمال کا اپنے آپ کو عادی نہیں بنانا چاہیے تاکہ اگر آغاز میں شرحاتِ مزد زیادہ نہ بھی ہوں تو بھی گذارہ ہو سکے اور مزدوری کا کم ہونا صنعت و حرفت کی ترقی کے لیے مفید ہوتا ہے۔ جاپان کی صنعتی ترقی کا راز اسی بات میں ہے کہ وہاں مزد کی شرحات کم ہیں اور زندگی بسر کرنے کا معیار فضول خرچی پر مبنی نہیں۔ جاپان کو شرحات مزد کی کمی کی وجہ سے اشیاء کے تیار کرنے میں جو فائدہ پہنچتا ہے اس کی بنا پر وہ دنیا بھر کے تاجر ملکوں کا نہ صرف مقابلہ ہی کر رہا ہے بلکہ ان کو شکست بھی دے رہا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ ورک مین کمپین سیشن ایکٹ کی توضیع اور لیبر کمشن (۱۹۲۹ء) کا تقرر اور اس کی سفارشات۔ نیز رائل کمشن لیبر کا تقرر اور اُس کی سفارشات وغیرہ ایسی باتیں ہندوستانی مفاد کے پیش نظر عمل میں نہیں لائی گئی تھیں بلکہ مانچسٹر اور دیگر سرمایہ داری کے مراکز کی دور اندیشی کا ثبوت اور اپنے مفاد کے تحفظ کی تدبیریں تھیں۔ بہ الفاظِ دیگر مطلب یہ تھا کہ اگر کسی وقت ہندوستانی سرمایہ دار ملکی صنعت

اور دستکاری کو فروغ دینے کی طرف رجوع کریں تو شرحاتِ مزد کی کمی کی بنا پر ان کی حوصلہ افزائی ناممکن ہو۔ فرض محال اگر یہ بات درست بھی ہو تو اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ہندوستان بہت غریب ہے اس قدر غریب کہ یہاں کے غریب باشندے فی کس سولہ یا سترہ روپیہ ماہوار پر بیرون ملک بھی جانے کے لیے تیار ہو جایا کرتے ہیں ۔ صنعت کی ترقی کے لیے مزدور کو اپنی جگہ قربانی کرنی پڑے گی اور سرمایہ دار کو اپنی جگہ ہر ممکن ایثار سے کام لینا ہوگا ۔

ہماری ترقی فوری اور شعوری نہیں بلکہ تدریجی اور غیر شعوری ہے۔ خود اقتصادی حالات باشندوں کو اپنی حالت کے بدل ڈالنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ آبادی کے ذی شعور عنصر کا فرض ہے کہ وہ ان اقتصادی حالات کی شدت کو جہاں تک یہ بات ان کے بس میں ہو بڑھا دیں تاکہ وہ نتائج جو کل مرتب ہونے ہیں آج ہی ظاہر ہو جائیں اور معرض التوا ہی میں نہ پڑتے چلے جائیں ۔ ہندوستانی کم از کم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ ہر سال پاس ہونے والے طلبا کی فیصدی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش کریں تاکہ اگر تعلیم یافتہ طبقہ کا دیہات میں دس سال کے بعد انتشار عمل میں آتا ہے تو وہ پانچ سال پہلے ہی عمل میں آجائے ۔ اگر ہم آئندہ پانچ سال کے عرصہ میں ان اعلیٰ تعلیم یافتہ طلبا کو جو دیہات میں پیدا ہوتے ہیں اور وہاں ہی پرورش پاتے ہیں لیکن بعد میں قصبات میں جم کر بیٹھ جاتے ہیں واپس دیہات میں جانے پر مجبور کر دیں تو اس معمولی سی بات کے اثرات بہت گہرے اور دور رس ہوں گے ۔ اس نکتہ کو میں مثال سے واضح کرتا ہوں ۔ اس وقت لاہور میں کئی ایسے نوجوان ملیں گے جو ایک مدت سے تحصیل علم سے فارغ ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک لاہور میں ہی رہائش رکھتے ہیں ۔ ایسے نوجوان اپنی دیہاتی خصوصیات کی بنا پر شہر والوں سے ممیز ہوتے ہیں ۔ ان کی طبیعتیں عارضی اثرات کو جلد قبول نہیں کرتیں ان کی سیرت بھی زیادہ محکم اور استوار ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ شہر کے باشندوں کی صحبت سے بھی گریز کرتے

ہیں لیکن چونکہ شہر کی سہولتوں کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتے اِس لیے شہر کے اردگرد کی نوآبادیوں میں جو شہر کے مقابلہ میں قدرے فراخ جگہوں میں اور دیہات سے مشابہ ہوتی ہیں اقامت گزیں ہوتے ہیں۔ اپنا گذارہ زیادہ تر پرائیویٹ یا سرکاری معمولی ملازمت سے کرتے ہیں اور اکثر گھر سے بھی خرچ منگواتے ہیں۔ اس قسم کے تعلیم یافتہ دیہاتی دیگر قصبات میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کی تعداد میں اگر اس قدر زیادہ اضافہ ہو جائے کہ ان کو شہروں میں معمولی ملازمتیں یا دیگر ایسے روزگار بھی نہ مل سکیں تو اُن کو مجبورًا دیہات میں واپس جاکر زراعت کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جس سے ہماری دیہاتی فضا صحت، سیاست اور اقتصاد کے لحاظ سے بہت جلد درست ہو جائے گی اگر اس قسم کے نوجوانوں کو زمانۂ تعلیم میں کوئی دستکاری بھی سکھا دی جائے تو اس سے ان میں ایک تو قوتِ کار پیدا ہو جائے گی اور دوسرے ان کو آمدنی کا ایک اور ذریعہ بھی ہاتھ لگ جائے گا۔ نیز اس دستکاری کو وہ دیہاتیوں کو بھی سکھا سکیں گے۔ ہمارے موجودہ طریقۂ تعلیم سے طلبا کی طبیعتوں میں تساہل اور آرام طلبی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے ہاتھ سے کام کرنے سے جی چرانے لگتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ کام کرنے کو بھی عار سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمارا موجودہ طریقۂ تعلیم بہت معیوب ہے اور اس عیب کو دور کرنے کا علاج یہی ہے کہ سکول میں ہر بچے کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرا دی جائے کہ کام سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور عبادت نہیں۔ کام ہی زندگی کا مقصد ہے کام سے بہتر کوئی اور شغل نہیں اور اگر کام نہ ہو تو زندگی اجیرن ہو جائے وغیرہ وغیرہ ہر ایک طالب علم کے لیے خواہ اُس کے والدین کتنے ہی امیر کیوں نہ ہوں ادبی تعلیم کے علاوہ کسی نہ کسی دستکاری کا سیکھنا لازمی قرار دیا جانا چاہیئے اور اس کا بھی یقین کرا دیا جانا چاہیے کہ اپنی محنت سے اپنا پیٹ پالنا زیادہ قابل فخر اور قابل عزت بات ہے اور جائیداد جو ورثتاً ہم میں سے اکثر کو ملا کرتی ہے دراصل سوسائٹی کی ملکیت ہوتی ہے اور اسے ہمارے پاس اس لیے رہنے

دیاجاتا ہے کہ ہم اس کو کسی ایسے مصرف میں لائیں جس سے سوسائٹی کے تمام افراد کو فائدہ پہنچے۔
ہمیں اس وقت ہندوستان کے نصب العین کو بدلنے کی ضرورت ہے موجودہ وقت میں اور اس سے پیشتر بھی ہندوستانیوں کا نصب العین یہ رہا ہے کہ پہلے کچھ عرصہ خوب کمالیا جائے اور پھر اُسے بیٹھ کر اچھی طرح اُڑایا جائے۔ نیز ہر ایک شخص کا کام کرنے سے مقصد ہی یہ ہوا کرتا ہے کہ روپیہ اکٹھا کیا جائے تاکہ بوقت ضرورت کام آئے یا اس کے ذریعہ اپنی امارت کا اظہار کیا جائے۔ اِس نصب العین کو بدلنے اور محنت کا حقیقی معنوں میں احترام پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ صاحب اولاد اشخاص کو کبھی یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اولاد کے جوان ہو جانے کے بعد کام چھوڑ دینگے اولاد کمائے گی اور وہ محلہ یا گاؤں کے مکھیا بن کر بیٹھ جائیں گے۔ ہر ایک شخص میں اتنی خود داری ہونی چاہیے کہ جب تک اس میں سکت رہے وہ اپنے ہاتھ سے اپنی روزی کمائے اور اپنے بار کو کبھی کسی دوسرے شخص پر نہ ڈالے خواہ وہ بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ سہل انگاری اور آرام طلبی کے موجودہ نصب العین کی بجائے اس قسم کا کوئی نصب العین صرف تعلیم کے ذریعہ ہی سے لوگوں کے سامنے پیش کیا جاسکتا ہے۔ اگر ادبی تعلیم کے پہلو بہ پہلو صنعتی تعلیم بھی دی جائے تو یہ بات ممکن ہو سکتی ہے کہ سب لوگ "حرکت میں برکت" کے قائل ہو جائیں اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے نفرت کرنے لگیں۔ اس سے "ہر کس برائے خویشتن" کی حالت ضرور پیدا ہو گی لیکن ساتھ ہی افراد ایک دوسرے کے بوجھ سے جیسا کہ اس وقت ہندوستان میں علائق قبیلہ اور سانجھے کھاتے کے رواج کی موجودگی سے ہو رہا ہے نجات حاصل کرلیں گے اور ہر شخص اپنے لیے خود ذمہ وار ہو جائے گا۔ اس سے اُن میں ہر نئی بات کے بارہ میں اقدام کرنے کی جرات پیدا ہو گی جو ملکی ترقی کے لیے ازحد مفید ہے۔ ہر ایک شخص کو خود کام کرکے اپنا پیٹ پالنے کے لیے ذمہ وار بنانے سے انفرادیت بڑھے گی۔ کنبہ یا خاندان کی اہمیت کی کمی

اور کنبے کی طرف سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں سے فرد کی آزادی اس کو اپنے سیاہ و سفید کا مالک بنا دے گی۔ اگرچہ والدین اور بہن بھائیوں سے مل کر جو ایک کنبہ بنتا ہے اس کی ایک حد تک ضرور تنسیخ ہو جائے گی۔ بعض اوقات انسان اپنے آپ کو خطرے میں محض اس لیے نہیں ڈالتا کہ اس کے کنبہ کے باقی افراد کو اس کے تلف ہو جانے یا اسے کسی قسم کا جسمانی نقصان پہنچنے سے مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں گی۔ اگرچہ یہ ایک قسم کا ایثار ہے لیکن مانع جرأت۔ اگر کنبے کے افراد کا آپس میں اس قسم کا تعلق قائم نہ رہے تو فرد چونکہ اس پر اقربا کی طرف سے ذمہ داریاں عائد نہیں ہونگی نڈر ہو جائے گا اور کسی اعلےٰ اور ارفع مفاد کی خاطر اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے سے دریغ نہیں کرے گا۔ اسے جان جوکھوں میں ڈال کر برتری حاصل کرنے کی خواہش کو کنبہ کی خاطر قربان کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ عوام کی بہتری کے لیے اس کی ذاتی سرگرمیاں محض چند نفوس کی خاطر رُکی نہیں رہیں گی سیر و سیاحت تحقیق و تدقیق، ایجاد و دریافت کا جو جذبہ اس وقت یورپ اور امریکہ کے لوگوں میں پایا جاتا ہے اس کی وجہ کنبے کے علائق کی کمی اور فرد کی محکم شخصیت ہے۔ اس طرح اگر ہم اپنے افراد کو اس قسم کی جذباتی پابندیوں سے آزاد کر دیں تو وہ اپنی کوششوں اور سرگرمیوں کو خواہ وہ تجارت کے متعلق ہوں یا صنعت و سیاست کے متعلق نہایت آزادی سے جاری رکھ سکیں گے۔

تعلیم یافتہ طبقہ کو چاہیے کہ وہ جذبۂ ملی کی انگیخت پر حکومت کے خلاف تخریبی کارروائیوں اور سرگرمیوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے تعلیم صنعت اور مجلسی اصلاح کے دیگر کاموں میں شریک کار بنے تاکہ عوام میں حکومت خود اختیاری کے بار کو اٹھانے کی اہلیت پیدا ہو۔ موجودہ وقت ابتلا و آزمائش کا وقت ہے یہ دو طرح سے ضائع ہو سکتا ہے۔ اوّل ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے اور کچھ نہ کرنے سے۔ دوم ایسی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے

سے جن سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہو سکتا ہو۔ ہمیں اپنی اندرونی اصلاح کی اور یکے بعد دیگرے اپنی خامیوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ خامیاں جس قدر زیادہ ہماری سرشت میں کم ہوں گی اُسی قدر زیادہ ہماری غلامانہ ذہنیت کے اثرات نئی پود میں جو کہ نئی ہندوستانی نسل بننے والی ہے کم سرایت کریں گے۔ جو بچے اصلاح یافتہ آزاد خیال بزرگوں کی صحبت میں اور اُن کے زیر تربیت پرورش پاتے ہیں جوان ہو کر ان بزرگوں کی خوبیوں سے اور بھی زیادہ مرصع ہوتے ہیں۔ اس لیے موجودہ وقت کے نوجوان طبقہ کو اپنی سیرت اور ذہنیت کی اصلاح کی فکر کرنا چاہیے کیونکہ وہ اپنے کیریکٹر کی بلندی کے متعلق خواہ کتنا ہی دعوے کیوں نہ کریں۔ اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ اُنھوں نے اپنی زندگی کا ایک کافی حصّہ اپنے سے بڑی عمر کے ایسے لوگوں کی صحبت میں گذارہ ہے جن کے سیاسی خیالات بہت بوسیدہ اور پست جن کی ذہنیت سخت غلامانہ اور بدترین طور پر مسخ ہوئی ہوئی تھی۔ یہ مبالغہ نہیں کہ حقیقی معنوں میں ہندوستانیوں کی سیاسی فلاح و بہبود کا دور اس وقت سے شروع ہوگا جب کہ اُن کی وہ نسلیں جن کی پیدائش تقریباً ۱۹۰۰ء سے پیشتر کے سالوں میں ہوئی تھی یعنی ایسے وقت میں ہوئی تھی جب کہ غلامی شدت سے تھی بالکل ناپید یا کم از کم پیرانہ سالی کی وجہ سے ناکارہ ہو کر نہیں رہ جائیں گی۔ بہ الفاظ دیگر ہماری سیاسی تربیت اور غلامانہ ذہنیت کے بدلنے کے لیے ابھی اور بیس پچیس سال کا عرصہ درکار ہے۔ اس عرصہ کے دوران میں امید ہے کہ اتنی تبدیلی ہو جائے گی کہ سب ہندوستانی کیا دیہاتی اور کیا قصباتی جمہوریت اور ملیت کے مقاصد کو بخوبی سمجھنے لگیں گے نیز حکومت خود اختیاری کے بھی اہل ہو جائیں گے۔ عوام میں اس اہلیت کو بڑھانے کے لیے اور یہ تمام اثرات پیدا کرنے کے لیے جن کا ذکر مختصراً کیا گیا ہے نوجوان طبقہ کافی خدمات سرانجام دے سکتا ہے اور اس کا طریقہ صرف ایک

ہی ہے یعنی ترقی تعلیم کی رفتار کو تیز تر کیا جائے اور طریقۂ تعلیم ایسا ہو کہ اُس سے طلبا کی طبیعت میں جدت، احساس اور علمی سرگرمی پیدا ہو ۔

اس جگہ یہ بھی بیان کر دینا لازمی ہے کہ ہر ممکن احتیاط سے کام لیتے ہوئے کوشش یہ ہونی چاہیے کہ سنہ ۱۹۰۱ء کے حالات دوبارہ نہ پیدا ہونے پائیں۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں لارڈ کرزن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ترقی تعلیم کو روکا جائے ۔ چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے بمقام شملہ ایک کانفرنس منعقد کی جس میں صرف انگریز حضرات شامل تھے اس کانفرنس میں ہندوستانیوں کی تعلیم کے مسئلہ پر غور کیا گیا ۔ اس کے بعد سنہ ۱۹۰۲ء میں انڈین یونیورسٹیز کمشن کا اجلاس ہوا اور اس میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم کی تحصیل کو گراں خرچ بنانے اور یونیورسٹیوں پر سرکاری ضبط کے بڑھائے جانے وغیرہ ایسے امور پر غور کیا گیا ۔ اور بالآخر اس کا نتیجہ یونیورسٹی ایکٹ مصدرہ سنہ ۱۹۰۲ء کی صورت میں ظاہر ہوا ۔ اس ایکٹ کا مقصد تعلیم حاصل کرنے کے بارہ میں ہندوستانیوں کی حوصلہ شکنی کرنا تھا ۔ لیکن لارڈ منٹو نے جو کرزن کے جانشین ہوئے اس حکمتِ عملی کو بدل ڈالا اور میکالے ایسے فراخدل اور بلند حوصلہ انگریزوں کے مطمح نظر کو پھر اپنا نصب العین بنا لیا جس کی وجہ سے لارڈ کرزن کی حکمتِ عملی کا مقصد پورا نہ ہو سکا ۔ ہندوستان کی ترقی کا راز ترقیِ تعلیم میں پنہاں ہے ۔ "بہترین میٹریکولیٹ اور گریجوایٹ" پیدا کرنے کے عذر سے اُن کی تعداد میں کمی کرنے کی حکمتِ عملی ایک دفعہ ناکام ہو چکی ہے ۔ آئندہ کسی مرحلہ پر اسے کامیاب بنانے کی کوشش کرنا ہندوستانی مفاد کے خلاف ہوگا اور یہ بات قیام ملت کے لیے بھی مضر ہوگی ۔ ہندوستانیوں کو محتاط رہتے ہوئے اپنے مفاد کی خود حفاظت کرنی چاہیے ۔

انگریزی طریقۂ تعلیم

انگریزی طریقۂ تعلیم سے مغربی علوم مثلاً طبیعیات انگریزی ادبیات، سیاسیات اجتماعیات طب وغیرہ ملک کے طول و عرض میں پھیل گئے اور جدید ہندوستان کی تشکیل انہی کی بدولت عمل میں آئی۔ اٹھارھویں صدی کے دوران میں ہندوستان ہنگامہ خیزیوں کی جولاں گاہ بنا رہا اور عام امن و امان کے فقدان سے تجارت کے بازار بے رونق ہو گئے تھے اور ترقی کی رفتار رُک گئی تھی۔ لوگوں کی مالی حالت بہت خراب تھی اور غربت سے پیدا ہونے والے ناگفتہ بہ حالات سے عام معیارِ اخلاق بھی گر چکا تھا۔ ذات پات کی شدید قیود سوسائٹی کا شیرازہ بکھیر رہی تھیں۔ گذشتہ صدہا سال کی مطلق العنان حکومتوں نے آزادی کی روح کو تحلیل کر دیا تھا۔ ہر طرف مردنی چھائی ہوئی تھی۔ ان خستہ حالات کی وجہ سے لوگوں کی طبائع یاس پسند ہو کر دنیا اور دنیاداری کے دھندوں سے اچاٹ ہو چکی تھیں اور ہندوستان ایک پیکرِ بے جان تھا۔ اس کے برعکس مغرب میں زندگی زوروں پر تھی۔ وہی نسخہ جات حیات بخش جن کے استعمال نے مسلموں کے جوہرِ ادراک کی جولانیوں کے لیے تاشقند سے لے کر سپین تک کی زمین کو میدانِ عمل بنایا ہوا تھا ان کے ہاتھوں سے نکل کر مغرب کے قبضہ میں جا چکے تھے اور مغربی ان پر عمل پیرا ہو کر دنیا بھر پر اپنا تسلط جما رہے تھے۔ ہندوستان میں رمقِ حیات برائے نام تھی۔ لیکن مغربی علوم نے ایک طاقت بخش دوا کی طرح اس بیمار پر اثر کیا۔ حیات لوٹ آئی۔ عزتِ نفس اور برتری حاصل کرنے کی خواہش سینوں میں پھر اُبھری اور پہلے کی نسبت کئی گنا زیادہ۔ لیکن تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں جس کے ذریعہ مغربیت کا درس دیا گیا ایک نقص تھا۔ لیکن ایسا نقص جس کو دور کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ مغربی علوم کی تعلیم زبانِ انگریزی کے ذریعہ دی گئی۔ اس سے نیک دل اور اعلیٰ خیال انگریزوں کا مقصد جیسے میکالے

کی زبان سے بیان کیا گیا ہے یہ تھا:۔

"فی الحال ہمیں اپنی تمام کوششیں اس امر پر مرتکز کر دینی چاہئیں کہ ایک ایسی جماعت تیار ہو جائے جو ہمارے اور اُن لکھو کھہا لوگوں کے درمیان ترجمانی کے فرائض انجام دے جن پر ہم حکومت کرتے ہیں۔ یہ جماعت اُن افراد پر مشتمل ہو جو بلحاظ رنگ و خون ہندوستانی ہوں لیکن بہ اعتبار مذاق، رائے، اخلاق اور ادراک پورے پورے انگریز ہوں۔ ہم اس جماعت کو یہ خدمت سپرد کر سکتے ہیں کہ وہ ملک کی دیسی زبانوں کو شستہ بنائے اور سائنس کی مغربی مصطلحات سے انہیں بتدریج مالامال کرے تاکہ ان زبانوں میں بھی آہستہ آہستہ عامۃ الناس پر علوم و معارف کا انکشاف کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے"۔

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ انگریزی کو ذریعۂ اظہارِ خیال بنانے سے مقصد کیا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ شروع میں انگریزی کی تعلیم دی جائے اور تمام علوم انگریزی میں پڑھائے جائیں۔ تاآنکہ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد ایک ایسا ہونہار نوجوان طبقہ پیدا ہو جائے جو اپنی وطنی زبانوں کے ارتقا کے سلسلہ میں کوشش کرے۔ غیر ملکی زبان میں تعلیم دینے کا نقص اُس وقت بھی سب کے پیش نظر تھا اور سب جانتے تھے کہ طلبا کو دوگنی محنت کرنی پڑے گی اول غیر ملکی زبان سیکھنے کے لیے اور دوم اس زبان کے وسیلہ سے بیان کردہ خیالات کو سمجھنے کے لئے چونکہ سر دست مغربی علوم کی کسی دیسی زبان کے ذریعہ تعلیم ناممکن تھی اس لیے انگریزی کو ذریعہ اظہارِ خیال مقرر کیا گیا اور امید کی گئی کہ کچھ عرصہ کے بعد تعلیم یافتہ ہندوستانی خود اس طرف دھیان دے کر اپنی ملکی زبانوں کے ارتقا کی کوشش کریں گے تاکہ آئندہ کے لئے دوگنی محنت اور وقت صرف نہ کرنا پڑے۔ لیکن انگریزی طریقہ تعلیم کا اثر ہندوستانیوں پر ایسا پڑا کہ جدت بالکل جاتی رہی۔ ہاں البتہ رٹ لینے کی کافی مہارت ہو گئی۔ نہ صرف یہ بلکہ ہندوستانی طلبا کے دماغوں

میں سمجھنے کی بجائے رٹنے کی ایک غیر معمولی قابلیت پیدا ہو گئی۔ اور چونکہ طریقۂ تعلیم ایسا تھا کہ زیادہ تر ادبی پہلو پر ہی زور دیا جاتا تھا اس لیے طالب علم کی شخصیت کو محکم بنانے کا اور اُس کی توجہ واقعیت کی طرف منعطف کر کے اس میں ذوقِ عمل پیدا کرنے کا بہت کم خیال رکھا گیا۔ ہندوستانی طبیعیات اور تاریخ ایسے علوم کی عدم موجودگی اور فلسفہ کی عام بہتات کی بنا پر واقعیت کو نظرانداز کرنے کے پہلے ہی سے عادی تھے۔ اس عادت کو انگریزی طریقۂ تعلیم سے اور تقویت ملی۔ مختلف مذاہب کی موجودگی کی بنا پر کوئی ایسی مذہبی کتب نصابِ تعلیم میں شامل نہیں کی جا سکتی تھیں جن سے کچھ اخلاقی تربیت ہوتی اور طلبا کے کیریکٹر مستحکم ہوتے۔ اس پر طرہ یہ کہ کسی کو اتنا خیال بھی نہ آیا کہ فلسفہ پہ مبنی عام اخلاقیات کو ہی نصاب میں شامل کر دیا جائے تاکہ جہاں تک اجتماعیات کا تعلق ہے اخلاق کی ضرورت اور نظریہ سے تو طلبا واقف ہو جائیں اور اس علم کی بنا پر اپنی عادات چلن اور رویہ کو اس طرح صیقل کریں کہ عام سوسائٹی کو فائدہ پہنچے + طریقۂ تعلیم کے اس نقص کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کو قائم کرتے وقت لنڈن یونیورسٹی کے معیاروں کی تقلید کی گئی تھی۔ اس وقت لنڈن یونیورسٹی کو قائم ہوئے اتنا عرصہ نہ گذرا تھا کہ اس کے طریقوں اور اصولوں کو صحیح مان کر ان کے مطابق عمل شروع کر دیا جاتا۔ اکسفورڈ اور کیمبرج کی دیرینہ اور سالخوردہ یونیورسٹیوں کے دستوروں کی تقلید کرنے میں کوتاہی کی گئی۔ اگرچہ لنڈن یونیورسٹی اس وقت ارتقا کی مختلف منازل سے گذر کر نہایت اعلیٰ درجہ پر پہنچ چکی ہے لیکن جب ہندوستان کی تعلیمی ضرورت کے پیش نظر اُسکی یہاں نقل کی گئی ہے وہ اس وقت اپنے موجودہ درجہ کو نہ پہنچی تھی۔ اس میں علمی پہلو کو چھوڑ کر ادبی پہلو پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ اکسفورڈ اور کیمبرج کی طرح طلبا کے کیریکٹر بنانے اُن میں جدت پیدا کرنے اور انہیں بلند نگاہی کا سبق دینے کی کم کوشش کی جاتی تھی۔ لنڈن یونیورسٹی کے

نمونہ پر یہاں اس کی بیہودہ سی نقلیں قائم کر دی گئیں لیکن لنڈن یونیورسٹی تو ترقی کرتی رہی اور ہندوستانی یونیورسٹیاں ٹس سے مس نہ ہوئیں اور بالآخر لکیر کی فقیر ہو کر رہ گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلبا کی طبیعتوں میں سے جدتِ تحقیق و تدقیق اور تنقید کا مادہ جاتا رہا اور انہیں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی عادت ہی نہ رہی چنانچہ انہوں نے بیچارے میکالے کی ان امیدوں پر کہ وہ اپنی دیسی زبانوں کے ارتقا کی کوشش کریں گے پانی پھیر دیا اور اس بارہ میں کوئی ایسی کامیاب کوشش نہ کی جس سے کہ آئندہ نسلیں اپنی مادری زبانوں میں کسبِ علوم کر سکتیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ نے، استادوں نے اور پروفیسروں نے اس بارہ میں کیا خدمات سرانجام دی ہیں اور عام بیداری پیدا کرنے کے اس فرض کو جو روشن دماغ طبقہ پر عام ملک اور قوم کی طرف سے عائد ہوا کرتا ہے کہاں تک پورا کیا ہے؟ اِس بارہ میں عام دیسی اخبارات کی خدمات۔ بنگال میں ٹیگور کی مساعیٔ جمیلہ اور حیدر آباد دکن میں حضور نظام کی حوصلہ افزائی سے پیدا ہونے والے چند نتائج کو چھوڑ کر باقی صوبوں کے تعلیم یافتوں نے کوئی خاص تعمیری کام سرانجام نہیں دیا ہے۔ ہندوستان میں تعلیم پھیلانے کا مقصد اچھے انگریز پیدا کرنا نہ تھا بلکہ اچھے ہندوستانی پیدا کرنا تھا جو مغربی دساتیر اور اسالیب کو ہندوستانی قالبوں میں ڈھالتے اور ملکی ترقی کی فکر میں منہمک ہوتے۔ طریقۂ تعلیم کے اس بنیادی نقص کی وجہ سے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ عوام سے قریب تر ہونے کی بجائے بعید تر ہو گیا۔ انہوں نے ادبی تعلیم کو ایک عشرت سمجھا اور مغربی ناولوں کے مطالعہ اور شعرا کے کلام کے مجموعوں کی ورق گردانی کو وقت ٹالنے کا ایک شغل بنا لیا۔ اگر ان لوگوں کو کسی نے راہِ راست پر لگایا ہوتا تو اب تک کم از کم تین یا چار دیسی زبانیں اس قابل ہو گئی ہوتیں کہ آج اُن کے ذریعہ سے ہر قسم کے علوم کی تحصیل ممکن ہوتی۔

موجودہ وقت میں عام دنیا کے حالات کے پیش نظر ہم جانتے ہیں کہ انگریزی کو ترک نہیں کر سکتے اور نیز یہ بھی سمجھتے ہیں کہ آئندہ کے ہندوستان کی شائد یہی مشترکہ زبان ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مقامی زبانوں کو ترقی نہ دی جائے۔ ہندوستان کی کم از کم چار مقامی زبانیں ہوں گی۔ انگریزی ہندوستان بھر کی مشترکہ زبان ہوگی۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ پنجاب یوپی، راجپوتانہ صوبجاتِ متوسط کا کچھ حصہ۔ حیدرآباد دکن۔ بہار کا مغربی حصہ سکولوں اور کالجوں میں اُردو استعمال کرے گا۔ بنگال میں بنگالی ہوگی جس کی ٹیگور اور ایسے دیگر اشخاص کے طفیل کافی ترقی ہو چکی ہے۔ مدراس میں تلاگو تامل میں سے کسی ایک کی ترقی ہوگی۔ گجرات کاٹھیاواڑ اور بمبئی کے بعض علاقے ممکن ہے گجراتی کے ارتقا کی کوشش کریں۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ ان مقامی زبانوں کے ساتھ انگریزی کی تعلیم لازمی یا اختیاری کر دی جائے۔

اس وقت ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کی زندگی میں دوعملی سی پیدا ہو گئی ہے اگر بعض موضوع مثلاً سیاسیات، فلسفہ، قانون وغیرہ کے متعلق اظہارِ خیال کرنا ہو تو انگریزی بولنے کے سوا چارہ نہیں۔ خانگی معاملات کے متعلق گفتگو کرنی ہو تو مقامی زبان کے سوا گذارہ نہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور مصیبت یہ ہے اور وہ یہ کہ بعض اوقات سوچتے تو انگریزی میں ہیں اور بولتے یا لکھتے اپنی مقامی زبان میں ہیں۔ بعض دفعہ اس کے برعکس بھی عمل ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مدرکہ ذہنی سوچ بچار کی بجائے الفاظ کی تلاش اور مترجمی پر زیادہ خرچ ہوتی ہے۔ اگر دیسی زبانوں کی ترقی کی جائے اور تعلیم و تدریس ان کے ذریعہ ہو تو ہمارے نوجوانوں میں بلیغ النظری عمیق الفکری اور وسعت نگاہی پیدا ہو جائے۔ اور ہم مغربیت کے نقال کہلانے سے بھی بچ جائیں۔ اس وقت ہم نہ تو ہندوستانی رہے ہیں اور نہ ہی انگریز بن سکے ہیں۔ انگریز نیز دیگر مہذب اقوام بھی ہمیں انگریزوں کا ایک مضحکہ خیز کارٹون

تصور کرتی ہیں۔

سکاٹ لینڈ انگلستان اور امریکہ کے جب مشن یہاں قائم ہوئے تو تبلیغ کا کام شروع کرنے سے پیشتر انہوں نے بھی دیسی زبانوں میں بائیبل کے ترجمے کرانا از حد ضروری سمجھا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ بائیبل کی تعلیم دیسی زبانوں کے ذریعہ جلدی اور آسانی سے دی جا سکتی تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ حکومت برطانیہ کو مطعون قرار دیا جائے کہ اس نے انگریزی کے رواج سے دیسی زبانوں کے گلے پر چھری رکھی۔ بائیبل ایک کتاب تھی چھوٹی سی۔ اور اس کا ترجمہ آسانی سے ہو سکتا تھا۔ لیکن اتنے وسیع مغربی علوم کو اس قدر جلد دیسی زبانوں میں منتقل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حکومت نے اس امید پر کہ چند اشخاص مغربی علوم سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد باقی ابنائے وطن کی دستگیری کریں گے اور انہیں غیر ملکی زبان سیکھنے کی زحمت سے بچا لیں گے اور مغربی علوم کے خزینے مقامی زبانوں کی کلید سے کھول کر ان کے سامنے رکھ دیں گے۔ انگریزی زبان ہی میں ہندوستانیوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔ لیکن ہم نے کوتاہی کی اور قریباً صدی ڈیڑھ صدی کا عرصہ نیم خوابی اور نیم بیداری کی حالت میں گذار دیا اور جب آنکھ کھلی تو اس بارہ میں نیم دلانہ کوشش شروع کی اور وہ بھی اس طرح کہ اگر ایک قدم آگے بڑھتے ہیں تو دو قدم پیچھے ہٹتے ہیں۔ بنگال والوں نے کچھ ہمت کی ہے اور بنگالی میں بہت کچھ مغربی علوم کو منتقل کر [illegible] حیدرآباد کی وجہ سے ہو گئے ہیں یو۔پی والوں کو ابھی تک ذہنی صنم خانوں اور ان کے تصورات سے فرصت نہیں ملتی اور پنجاب لکھنؤ کی پیروی میں فنافی الشعر ہو جانے کے درپے ہے۔ ہر کس و ناکس کی شعر بازی کی علت سیاسی زندگی میں ہیجان پیدا ہونے کے مانع ہے۔

سیاست والوں کو یہ فکر ہے کہ اگر انگریزی کا دامن چھوٹا تو کانگرس کی جس میں مختلف صوبوں

کے اور مختلف زبانیں بولنے والے لوگ شامل ہوتے ہیں مشترکہ زبان جاتی رہے گی اور اتحاد و اتفاق قائم نہیں رہ سکے گا۔ اس اندیشہ کی بنا پر وہ دیسی زبانوں کے ارتقا کی طرف نہ تو خود توجہ دیتے ہیں اور نہ ہی اوروں کو توجہ دلاتے ہیں۔ ان سے بھلا کوئی پوچھے کہ کس نے کہا ہے کہ تم انگریزی کو چھوڑ دو۔ انگریزی سے چپکے رہو۔ مانا ہماری بہتری اسی میں ہے۔ آپس میں تعلقات اور باقی مہذب دنیا سے بھی تعلق قائم رکھنے کے لیے ہم اسے خیرباد نہیں کہہ سکتے۔ لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ دیسی زبانوں کی حوصلہ شکنی کی جائے۔ اور عوام کو اُن کی مادری زبانوں میں تعلیم دے کر انہیں کئی قسم کی سہولتوں اور آسانیوں سے بے بہرہ رہنے دیا جائے؟

کیا مجلس اقوام جس میں دنیا بھر کے نمائندے شامل ہوتے ہیں اور جو اپنی اپنی قومی زبانیں استعمال کرتے ہیں اپنا گزارہ نہیں کر رہی۔ زباں دان موجود ہوتے ہیں۔ ادھر ایک تقریر ہوئی اور ادھر اُنہوں نے مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے کر دیے۔ مجلس اقوام نے مختلف ممالک کے نمائندوں سے کبھی اس قسم کی استدعا نہیں کی کہ وہ کوئی اسپرانٹو یا کوئی پولک سیکھیں۔ ہم تو یہ بھی نہیں کہتے کہ مختلف مرکزی مجالس ہند میں اپنی اپنی زبانوں کو استعمال کیا جائے۔ مختلف صوبوں کی مشترکہ زبان انگریزی ہی رہے لیکن صوبائی زبانوں کی ترقی ہونی چاہیئے تاکہ تمام دماغی طاقتوں کی پوری پوری نشو و نما ہو اور ان سب طاقتوں کو محض رٹ لینے کی قابلیت پیدا کرنے کے لیے نظر انداز نہ کیا جائے۔ ایک ایسے دماغ کی جس پر حروف الفاظ اور فقرے محض ایک نظر ڈالنے سے منقش ہو جائیں ایک بیاض یا کیمرے سے زیادہ حیثیت نہیں ہو سکتی۔ ہمیں ایسی انسانی بیاضوں اور کیمروں کی ضرورت نہیں۔ ہمیں محکم شخصیتوں کی ضرورت ہے جو اثرات قبول کرنے کی بجائے خود ایسے اثرات پیدا کریں جس سے ٹھوس نتائج اور بین حقیقتیں معرض وجود میں آئیں۔ ایک ایسا عالم جس کے

علم کا نتیجہ کچھ نہ ہو اور جس میں ذوقِ عمل قطعاً مفقود ہو ایک اُس معمولی لغات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا جس میں تمام الفاظ موجود ہوتے ہیں لیکن جو ان الفاظ کو ترتیب دے کر خیالات کے حامل فقروں میں منتقل کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔ طلبا میں زندگی اور تخلیقی ذوقِ عمل پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

خلائق دوستی

اس وقت ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان خلائق دوستی کے حامی ہو رہے ہیں۔ ان میں اس قسم کے امیال و رجحانات کی موجودگی تعقل و تفکر سے اخذ کردہ نتائج کی بنا پر نہیں۔ بلکہ قیامِ ملت کی کامیابی کے بارہ میں استقلال کی کمی اور ہمت کی پستی کی وجہ سے ہے۔ قیامِ ملت کی اغراض کے پیش نظر جو فرائض ان پر عائد ہوتے ہیں ان سے بچنے کی خاطر ان کی خلائق دوستی محض ایک بہانہ ہے۔ اس قسم کے رجحانات کا استیصال ہونا چاہیئے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ چونکہ خلائق دوستی خوشگوار بین الملل تعلقات پر منحصر ہے اس لیے بین الملل تعلقات کے قائم کرنے سے پہلے ملل کا وجود لازمی ہے۔

مشرق اگر خلائق دوستی کا حامی ہو تو مغرب اس کے اس جذبہ کو سراہتا ہے اور اس بارہ میں اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے لیکن عملاً خود محب الخلق بننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے اور وہ یہ کہ اگر مشرق خلائق دوست ہو تو مغرب کو اس کے ان حقوق کی واپسی کا اندیشہ نہیں رہتا جن کو وہ اس وقت غصب کیے بیٹھا ہے۔ مشرقی اگر خلائق دوست بنیں تو یہ اُن کی غلطی ہے۔ ایک خوشحال شخص کی اور بدحال شخص کی خلائق دوستی میں وہی فرق ہے جو ایک امیر کی اور ایک غریب کی تواضع کرنے کی خو میں پایا جاتا ہے۔ حسب ذیل شعر سے اس کی

تصریح ہوتی ہے:۔

تواضع زگردن فرازاں نکوست
گدا گر تواضع کند خوئے اوست

اگر مشرق خلائق دوست ہونے کا دعوئے کرے تو اُسے زیب نہیں دیتا۔ خلائق دوست صرف دو قسم کے انسان ہو سکتے ہیں۔ اول وہ جو حد درجہ خوشحال ہوں اور خوشحالی کی بنا پر فطرتِ انسانی کے بہیمی پہلو کی کمی اُن میں خود غرضی کے عنصر کو نہ رہنے دے۔ دوسرے وہ مظلوم اور ستم رسیدہ انسان جو ظلم و ستم برداشت کرنے کے عادی ہو گئے ہوں اور اپنی زبوں حالت پر شاکر و صابر ہو کر تمام سنسار کو مایا بتانے لگیں اور تسلی خاطر کے لیے یہ عقیدہ گھڑ لیں کہ پچھلے جنم کے کھشٹ بھگت رہے ہیں اور بہتری اسی میں ہے کہ آئندہ جنم میں سکھ پانے کے لیے سب کے ساتھ دیا کی جائے۔

قومی استقلال اور ہمت کی مکمل شکست اور ہزیمت کے بعد اس حد درجہ کے انحطاط کی حالت آیا کرتی ہے۔ ٹیگور کی خلائق دوستی اس قسم کے ہزیمت خوردہ استقلال کی وجہ سے ہے ہمارے نوجوانوں کو اس قسم کے خیالات کے مہلک اثرات سے بچنا چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ خلائق دوستی کے دعاوی ہمیں صرف اُس وقت زیب دے سکتے ہیں جب ہم اپنے ملی استحکام کے بعد عملاً اس قابل ہو جائیں کہ اور ملتوں کی اعانت وامداد کر سکیں بحالت موجودہ ہمارا خلائق دوستی کا دعوئے بجنسہ فقیر کی اس صدا کے مانند ہے جو اکثر گلی کوچوں میں سنائی دیتی ہے "جو دے اُس کا بھی بھلا اور جو نہ دے اُس کا بھی بھلا"۔

ملازمتیں

ہندوستان کو حکومتِ خود اختیاری کے بارہ میں اپنی اہلیت اور قابلیت کو ہر پہلو سے ثابت کرنے کی ایماندارانہ کوشش کرنی چاہیے۔ جو کوئی بھی ہو اور جہاں کہیں بھی ہو اسے یہ خیال ہونا چاہیئے کہ اس کی کوتاہی غلطی یا فرض ناشناسی سے عام ہندوستانی کیریکٹر بدنام نہ ہونے پائے۔ اس بارہ میں تاجر، صناع، زمیندار، مزارع، مزدور اور ملازم گویا ہر ایک شخص کا فرض ہے کہ وہ ملک کی بدنامی کا باعث نہ بنے اور عام ہندوستانیوں کے آپس میں اور غیروں سے ایسے تعلقات ہوں کہ ان کا باقی ممالک کے لوگوں کے دلوں پر اچھا اثر پڑے تاکہ ہندوستانیوں کی قابلیت اور کیریکٹر کی شہرت درست ہو جائے اور وہ اُن کی عزت کرنے لگیں۔ حکومت خود اختیاری کی اہلیت ثابت کرنے کے لیے سب سے پہلے ہندوستانی ملازمینِ سرکار کو اپنی استعداد اور قابلیت کا ثبوت پیش کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ حکومت کا سب سے پہلے مختلف محکموں کی ملازمتوں سے تعلق ہے اسلئے اُنکی حسن کارکردگی کی بنا پر ایک موثر پیرایہ میں دنیا پر ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی زمامِ حکومت سنبھالنے کے قابل ہیں۔ ہر ہندوستانی ملازم خواہ اعلیٰ عہدہ پر متمکن ہو خواہ ادنےٰ پر فائز درجہ قابلیت، محنت، ایمانداری اور ہوشیاری سے اپنے فرائض کو سر انجام دینا قومی خدمت تصور کرے۔ تاکہ غیر ہندوستانی ملازمینِ سرکار سے جب اُن کے کام کا مقابلہ کیا جائے تو اُن کی کسی قسم کی کوتاہی نالائقی یا غفلت کی بنا پر یہ عام نتیجہ اخذ نہ کیا جا سکے کہ تمام ہندوستانی حسن کارکردگی کی صفات سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ ایک عام خیال ہے کہ چونکہ ہندوستانیوں میں انتظامیہ قابلیت بہت کم ہوتی ہے اس لیے مختلف محکموں میں نظم ونسق قائم رکھنے کے لیے انگریز افسران کی موجودگی از حد ضروری ہے۔ یہ بیان کسی حد تک درست ہے۔ ماتحت ہندوستانی ملازمین کی زبانی اکثر یہ شکایت

سننے میں آتی ہے کہ اعلیٰ ہندوستانی افسر حسن کارکردگی کی داد دینے اور محنتی ماتحتوں کی حوصلہ افزائی کرنے میں یا اُن سے کوئی ایسا جائز مربیانہ سلوک روا رکھنے میں جس سے اُن کی حوصلہ افزائی ہو سکے بخیلی اور تنگدلی کا اظہار کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ بھی رنجش ہوتی ہے کہ وہ قابل اور محنتی ماتحتوں کو ناجائز طور پر دبا کر اُن کی حوصلہ شکنی کرتے رہتے ہیں تاکہ انہیں اپنی لیاقت اور حسن کارکردگی کو ثابت کرنے کا موقع نہ مل سکے اور اس طرح مقابلہ اور موازنہ سے اُن کی اپنی نااہلیت اور کم لیاقتی طشت از بام نہ ہونے پائے۔ اس شکایت کی بنا پر اکثر ہندوستانی ماتحت ملازمین انگریز افسران کے ماتحت کام کرنے کا موقع ڈھونڈھتے رہتے ہیں یا ایسا موقع ملنے کے متمنی رہتے ہیں۔ کیونکہ انگریز افسران کے متعلق یہ ایک عام خیال ہے کہ وہ اپنے لائق ماتحت افسران کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اور حسن کارکردگی کے صلہ میں جب کبھی موقع ملے ماتحت کو ترقی دینے سے دریغ نہیں کرتے۔ ممکن ہے کہ یہ خیال کسی حد تک درست ہو۔ لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ہندوستانی ماتحت ملازمین جس محنت اور ہوشیاری سے کام انگریز افسران کی ماتحتی میں کرتے ہیں دیسی افسروں کی ماتحتی میں سرانجام نہیں دیتے۔ اس کی وجہ غلامانہ ذہنیت کے سوا کچھ نہیں۔ انگریز افسر کی ماتحتی میں ملازمین کے محنت اور ہوشیاری سے کام کرنے کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ ان میں اپنے فرض کی ادائیگی کا احساس بدرجۂ اتم موجود ہوتا ہے بلکہ وہ محض ڈر کی بنا پر ایسا کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ دیسی افسر کی ماتحتی میں اس قسم کا کوئی ڈر محسوس نہیں کرتے اس لیے مقابلتاً کم تن دہی اور عرق ریزی سے کام لیتے ہیں۔ حالانکہ اصلی نقطۂ نگاہ یہ ہونا چاہیئے کہ فرض کو ضرور سرانجام دینا ہے۔ افسر خواہ دیسی ہو خواہ انگریز۔ نیز ایسے ہندوستانی ملازمین کو اس قسم کے خیالات کا اظہار کرکے اور انگریز افسروں کو دیسی افسروں کے مقابلہ میں ترجیح دے کر ہندوستانیوں کی عام نااہلیت کا ثبوت پیش کرنے سے پرہیز کرنا چاہیئے

اُن کو کم ازکم اس بات کا تو خیال کر لینا چاہیے کہ اگر انگریز اپنے ماتحت ملازمین کی اس قسم کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دیسی افسران کے مقابلہ میں اُن کا اثر زیادہ اور اُن کے اختیارات وسیع ہوتے ہیں۔ اس لیے ترقی دینا یا کسی اور طرح سے حوصلہ افزائی کرنا اُن کے بس میں ہوتا ہے اور یہ بات دیسی افسروں کو نصیب نہیں ہوتی۔ اگر دیسی افسران کے اختیارات بھی ویسے ہی وسیع ہوں تو وہ بھی اپنے ماتحتوں کی حوصلہ افزائی کرنے کے بارہ میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں۔ ہندوستانیوں کی ادبی و انتظامیہ قابلیت کی عام شہرت کی خاطر دیسی افسران اور دیسی ملازمین کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنے متعلق اس قسم کے خیالات کے اظہار کا کم موقع دیا کریں۔ یعنی دیسی افسران اپنے ماتحت ملازمین سے حُسنِ سلوک سے کام لیں اور ماتحت اُن کے حسنِ سلوک نرمی اور حوصلہ افزائی سے ناجائز جراٴت پاکر محکموں کے انتظام میں خلل آنے کے ذمہ دار نہ بنیں۔ ماتحتوں کو اپنے اس فرض کا احساس ہونا چاہیے کہ مختلف محکموں کے کام کو بطریقِ احسن سرانجام دینے کیلیے انہیں اپنے افسران سے خواہ وہ دیسی ہوں یا انگریز پورے پورے اشتراکِ عمل سے کام لینا ہے۔

انتظامی افسران اور خاص کر دیسی افسران کی ذہنیت سے اگر تحکم پسندی کا عنصر معدوم ہو جائے اور وہ پبلک سرونٹ کے اصلی معانی کو سمجھ کر حقیقتاً پبلک کی خدمات سرانجام دینے والے بن جائیں تو بہت کم عرصہ میں عوام کے اخلاق کا معیار بلند ہو سکتا ہے اور اُن کی بگڑی ہوئی ذہنیت بھی بدلی جا سکتی ہے۔ مشرقی ممالک کی عام ذہنیت میں ایک بڑا اور عجیب نقص یہ ہے کہ یہاں ہر شخص حکومت کرنے کا خواہاں نظر آتا ہے۔ سب کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ لوگ اُن سے دبیں اور مرعوب ہوں۔ یہ ایک عام اور عجیب بات ہے۔ ہر فرد واحد حکومت کرنے کا خواہاں ہے حالانکہ وہ خود اور اُس کی قوم دونوں محکوم ہیں۔ اگر ہمارے سرکاری ملازمین

اپنے دلوں میں سے حکومت کرنے کی اس خواہش کو جو غلام ذہنیت سے پیدا ہونے والے چھچھورے پن کا نتیجہ ہے نکال دیں اور اپنی ذات کا احترام کرانے کی بجائے ملک کے آئین و قوانین کا احترام کرانے کی کوشش کریں اور خود بھی ان کا احترام کریں تو اس سے ایک تو عوام اپنے آپ کو پابندِ قانون سمجھنے کے عادی ہو جائیں گے اور دوسرے اُن کی نظروں میں افسران کی حقیقی عزت اور قدر و منزلت بھی پیدا ہو جائے گی۔ موجودہ زمانہ میں ملک کا فہمیدہ اور تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ تر ملازمینِ سرکار پر مشتمل ہے۔ ہر ملک کے فہمیدہ اور سمجھدار طبقہ کا اخلاقی فرض ہوتا ہے کہ وہ عامۃ الناس کے کم سمجھ اور غیر تعلیم یافتہ عام طبقوں کی راہبری کی خدمات سرانجام دیتے ہوئے اُن کے لیے مشعلِ ہدایت بنے۔ اگر ملازمینِ سرکار نظم و ضبط کے قواعد کی پوری پوری پیروی اور پابندی کرنا شروع کر دیں اور اُن کا نفاذ بالکل غیر جانبدارانہ طور پر کرتے ہوئے اپنے کو محض آلہ کار سمجھیں تو بہت سی ایسی خرابیوں کا جو عوام میں پائی جاتی ہیں جلد استیصال ہو سکتا ہے۔

ہماری ماتحت ملازمتوں میں رشوت ستانی ایسے بڑے نقص کی وجہ یہ نہیں کہ ملازمین بدطینت اور فطرتاً بدکردار واقع ہوئے ہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ وہ بے چارے رشوت ستاں ہونے پر مجبور ہیں۔ اُن کی تنخواہوں کی شرحات ایک ایسے وقت میں مقرر کی گئی تھیں جب کہ ملک کا عام زندگی بسر کرنے کا معیار بہت پست تھا اور روپیہ کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ مغربیت کے طفیل ملک ترقی کرتا گیا۔ معیارِ زندگی بلند ہوتا گیا۔ روپیہ کی افزونی کی وجہ سے روپیہ کی قیمت کم ہوتی گئی اور اس سے اسی قدر اشیا خریدنا محال ہو گیا جس قدر کہ تیس یا چالیس سال پہلے ممکن تھا لیکن ماتحت ملازمین کے مواجبات کی شرحات میں فرق نہ آیا اور اُن سے متعلقہ قواعد قوانین قدرت کی مانند اٹل اور ناقابلِ ترمیم ہی رہے نتیجہ یہ ہوا کہ ان ملازمتوں میں رشوت ستانی کی گرم بازاری

ہو گئی جس کی بنا پر آج ہندوستان پر یہ الزام لگایا جانے لگا ہے کہ یہاں بد دیانتداری اور رشوت ستانی بہت زیادہ ہے۔ یہاں ایک چھوٹے پیمانے پر حالت وہی ہے جو کسی راہ گم کردہ ایسے جہاز رانوں کی ہوا کرتی ہے جن کا خوراک کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہو۔ اور جو گرسنگی سے تنگ آ کر ایک دوسرے کو ہڑپ کر جانے پر آمادہ ہوں۔ جس طرح ایسے جہاز رانوں کے لیے بلند بانگ انسانی فرشتہ سیرتی کے دعاوی کے باوجود مردم خوری ممکن ہو سکتی ہے عین اسی طرح ہندوستانی ماتحت ملازمین سے اپنا گزارہ چلانے کے لیے جذباتِ ہموطنی اور احساس ملی کو نظر انداز کرتے ہوئے رشوت ستان بن جانے کی توقع بھی ہو سکتی ہے۔ محکموں کی ماتحت ملازمتوں میں سے رشوت ستانی نہ تو عملی تشدد سے اور نہ ہی زبانی تلطف سے دور ہو سکتی ہے۔ ایک بھوکا شخص جسے کوئی نہ تو کام دے نہ ہی ٹکڑا دے جب موقع پائے گا ضرور روٹی چرائے گا۔ ایک طرف قانون ایسے شخص کو قید کرنے کے لیے تیار ہو گا، دوسری طرف اُس کی غربت کا اور مجبوری کا احساس کرتے ہوئے انسانی ہمدردی کا جذبہ بہتوں کے دلوں میں رحم بھی پیدا کر دے گا لیکن ایسے بھوکے شخص کو نہ تو سزا سے (اگر اس کا مقصد اس کی اصلاح ہے) اور نہ ہی ہمدردی سے آئندہ ایسے حالات کے پیدا ہو جانے پر روٹی چرانے سے باز رکھا جا سکتا ہے + اس کی اصلاح اسی طرح ہو سکتی ہے کہ یا تو روٹی کی چوری کو جُرم نہ قرار دیا جائے یا اسے روٹی بہم پہنچائی جائے۔ اسی طرح ماتحت ملازمتوں میں سے رشوت ستانی کو دور کرنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ اوّل اسے جائز قرار دیدیا جائے۔ لیکن اسے کوئی شخص بھی ایک درست اصول تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہو گا + دوم مواجبات کی شرحات میں اضافہ کیا جائے خواہ اس اضافہ کے لیے نئے ٹیکس عائد کرنے پڑیں یا چند محکموں کو بند کرنا پڑے یا اعلیٰ افسران کی بڑی بڑی تنخواہوں میں تخفیف کرنی پڑے +

اسی سلسلہ میں ایک اور بات بیان کر دینا ضروری ہے کہ ہندوستانی بحری و بری افواج کے لیے جن چند ہندوستانی لڑکوں کو بھرتی کیا جاتا ہے وہ اکثر ایسے امیر گھرانوں کے ہوتے ہیں جنہیں کبھی ہاتھ سے کام کرنے کا موقع ہی نہیں ملا ہوتا اور جو جسمانی لحاظ سے سخت کمزور دبلے پتلے نحیف و نزار ہوتے ہیں۔ نہیں معلوم عمداً اس قسم کے لڑکے چھانٹ کر بھرتی کیے جاتے ہیں یا حقیقتاً جسمانی لحاظ سے اچھے امیدوار نہیں ملتے اور مجبوراً ان کو لینا پڑتا ہے۔ فوج اور نیوی کا کام جسمانی محنت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے ان میں سے اکثر کا تو غالباً حشر یہ ہوتا ہوگا کہ کام کی سختی کو برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے بہت جلد ڈسچارج لینے کی کوشش کرتے ہوں گے۔ اگر حقیقتاً ایسا ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پانچ دس سال کے بعد جب کبھی ان محکموں میں دیسیوں کی زیادہ بھرتی کا سوال اُٹھایا جائے گا اس قسم کے ڈسچارج لینے والے ہندوستانیوں کی بدولت کافی اعداد و شمار پیش کر کے کہا جا سکے گا کہ کوشش کی گئی لیکن ہندوستانی جسمانی طور پر ناقابل ثابت ہوئے ہیں ان محکموں کے لیے ادبی استعداد پر زور دینے کے ساتھ جسمانی صحت اور قد و قامت کا بھی خیال رکھا جانا چاہیئے۔ اور جب ایسے ہندوستانی امیدوار محکموں میں جائیں تو اُن کی رہائش و بود و ماند کا انتظام مغربی معیاروں کے مطابق کرنے کی بجائے ہندوستانی معیاروں کے مطابق کیا جانا چاہیے کیونکہ فوج کے متعلق کم از کم یہ شکایت اکثر سننے میں آئی ہے کہ میس کے اخراجات اس قدر زیادہ ہوتے ہیں کہ سوائے رؤسا کے لڑکوں کے وہاں کوئی اور گذارہ نہیں کر سکتا۔ یہاں تک بھی کہا جاتا ہے کہ لیفٹیننٹ کے عہدے کے انگریز افسران بھی اکثر مقروض ہی رہتے ہیں لیکن اُن کی مقروضیت ایسی مضر نہیں ہوتی۔ انگریز افسروں کے مقروض ہونے سے ایسے شدید نتائج مرتب نہیں ہو سکتے جیسے کہ کسی ہندوستانی افسر کے مقروض ہونے سے ہو سکتے ہیں۔ ایک اوسط طبقہ کا ہندوستانی افسر

اس طرح اپنے کنبہ کی طرف سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں سے آزاد نہیں ہوتا جس طرح کہ ایک انگریز افسر ہو سکتا ہے۔ انگریز افسر اگر مقروض ہو جائے تو اس کے قرضہ کی ادائیگی ممکن ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے ایسے علائق نہیں ہوتے جن کی بنا پر اسے کسی بھائی بہن یا والدین کی یا ان سب پر مشتمل ایک کنبہ کی کسی اعلیٰ پیمانے پر امداد کرنا فرض ہو۔ اوسط طبقہ کا ہندوستانی اگر اتفاق سے فوج یا نیوی میں بھرتی بھی ہو جائے تو اسے ان مغربی معیاروں کی وجہ سے سخت دقتوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ کامن میس جو مغربی معیار کے مطابق ہوتی ہے ہندوستانی افسران کی فوج یا نیوی میں شمولیت کے بارہ میں حوصلہ شکنی کرتی ہے اور رؤسا کے لڑکوں کی شمولیت سے عام طور پر ہندوستانیوں کو فوج و نیوی کے لئے قابل قرار دیے جانے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے اس کے متعلق ہندوستانی امیرزادوں کو جو افواج یا نیوی کے محکموں میں بھرتی ہوتے ہیں کم از کم اتنا ہی احساس ہونا چاہیے کہ وہ اپنی نا اہلیت یا ناقابلیت کی وجہ سے عام ہندوستانیوں پر اس قسم کے الزام کے تواردکے ذمہ دار نہ گردانے جانے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں اور اپنی قابلیت اور اہلیت کو ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔

اعلیٰ ملازمتوں پر متمکن ہندوستانیوں کے بارہ میں یہ کہنا کافی ہو گا کہ انہیں اپنے شریکِ کار انگریز افسران سے مخلصانہ طور پر اشتراکِ عمل کرنا چاہیے لیکن اس طرح کہ اس سے اُن کی قابلیت تدبر اور معاملہ فہمی کی صفات کا اظہار ہو نہ کہ خوشامد اور چاپلوسی کا۔ تاکہ انگریز افسران کے لیے یہ بات باعث اطمینان ہو کہ ہندوستانی حکومتِ خود اختیاری کے قابل ہو گئے ہیں اور حکومت خود اختیاری کا وہ پودا جسے انہوں نے اپنے ہاتھوں لگایا تھا اب پروان چڑھ رہا ہے۔ حکومت خود اختیاری کے مطمح نظر کے سامنے ایسے دیسی افسران کو انتہائی تدبر محنت اور خود ضبطی سے کام لینا چاہیے۔

وہ اعلیٰ اور ذمہ دار ملازمتیں جن پر عوام کے نمائندوں کو مقرر کیا جاتا ہے مثلاً مرکزی حکومت اور مقامی حکومتوں کی وزارتیں اس لیے معرض وجود میں لائی جاتی ہیں تاکہ عوام کے نمائندے حکومت کے اس نہایت ہی طاقتور عنصر کو جو سرکاری مستقل حکام پر مشتمل ہوتا ہے سینہ زوری اور بے ضابطگی سے باز رکھیں۔ طرز حکومت خواہ جمہوری ہو خواہ ملوکی عوام کے مفاد کو اگر کسی سے کوئی اندرونی خطرہ ہوتا ہے تو حکومت کے صاحب اختیار ان کارندوں کی بے ضابطگی بے راہروی اور تحکم سے اس قسم کی بے ضابطگی اور بے راہروی کو اس کے معرض وجود میں آنے کے واقع کو کم کرنے کے لیے حکومت میں عوام کے نمائندوں کو شامل کر لیا جاتا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ نوکر شاہی چونکہ اس کے عوام سے ایسے گہرے تعلقات نہیں ہوتے کہ اسے رائے عامہ کی ہر تبدیلی اور ہر ترقی کا پورا پورا علم ہوتا رہے ہمیشہ قدامت پسند اور عوام کی خواہشات سے ناواقف رہتی ہے اس سے ایسے شدید اور نقصان دہ حالات پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے جو بالآخر حکومت اور عوام میں تصادم یا عام انقلاب پر منتج ہوتے ہیں۔ اس قسم کے خطرات کی رکاوٹ کے لیے بھی حکومت میں عوام کے نمائندوں کی شمولیت ضروری ہوتی ہے۔ ان کو حکومت میں شامل کرنے کی تیسری وجہ یہ ہوتی ہے تاکہ نوکر شاہی کو ہر وقت یہ احساس ہوتا رہے کہ جن اختیارات کے استعمال کے وہ مجاز ہیں ان کی تفویض عوام کی طرف سے عمل میں آئی ہے اور ان کا استعمال بھی عوام کے مفاد کے لیے کیا جاتا ہے۔ لہٰذا عوام کے نمائندہ وزیروں سے نہ صرف یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ پبلک کے مفاد کا تحفظ کریں بلکہ یہ بھی ان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ محکموں اور ان کے افسران یعنی نوکر شاہی کو قابو میں رکھیں۔ اور اگر ان میں ناجائز تحکم کا مادہ موجود ہو تو اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی بے قاعدگی یا کسی اور ایسے فعل سے عوام کے مفاد کو نقصان نہ پہنچنے دیں۔ وزراء کو جو عوام کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ایسے

جلیل القدر عہدوں پر متمکن ہیں اپنے اس فرضِ منصبی کا احساس ہونا چاہیے۔ نیز انہیں اپنے میں بوروکریسی کی سی غیر جمہوری خصوصیتیں پیدا کرنے اور عوام سے علیحدہ ہو کر نوکر شاہی کے ساتھ شامل ہو جانے سے بھی احتراز کرنا چاہیے۔ وزراء کا اپنی رائے کی آزادی کو برقرار رکھ کر فرائض سرانجام دینا ملک اور قوم کی ترقی اور آئندہ نسلوں کی بہبود و بہتری کے لیے ازحد ضروری ہے۔ ہندوستان بھر میں شائد دو تین شخصوں کی ہی ایسی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جنہوں نے اس معیار کے مطابق حقیقی معنوں میں عوام کی نمائندگی اور افسرانِ سرکار سے اشتراکِ عمل کیا ہے خیر یہ بات ایسی مایوس کن نہیں کیونکہ جب نمائندہ حکومت کو قائم کیا جاتا ہے تو شروع میں اور خاص کر ایسے حالات میں جبکہ عوام کے نمائندہ وزراء کی تقرری میں نوکر شاہی کا بھی ہاتھ ہو اس قسم کی باتوں کا ہونا اکثر ممکن ہوتا ہے۔ ہمارے وزراء کو اپنے عہدوں کی اہمیت اور ہندوستان کے مستقبل کو مدِنظر رکھتے ہوئے ملک کی بیداری و بعثت کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے دیسی وزراء اگر محنت اور اخلاص سے کام لیں تو بہت سے مفید نتائج جلدی برآمد ہو سکیں گے۔

ہندی مفاد کے تحفظ کی پیش نظر اس امر کی بھی ازحد ضرورت ہے کہ ملازمتوں کے لیے بذریعہ نامزدگی بھرتی کرنے کے طریقہ کو بالکل بند کر دیا جائے۔ تمام آسامیاں بذریعہ امتحان مقابلہ پُر کی جایا کریں۔ لیکن کسی آسامی کے لیے تنخواہ مبلغ یک صد روپیہ سے زائد نہ ہو۔ شروع میں ہر ایسے شخص کو جو ملازمتِ سرکار میں شامل ہو مبلغ یک صد روپیہ بطور تنخواہ ملے اس کے بعد زیادہ اعلےٰ ملازمتوں اور بڑے گریڈوں کے لیے بھی امتحاناتِ مقابلہ ہوا کریں جو موجودہ وقت میں امتحانِ مقابلہ پاس کرنے کے بعد امیدواروں کو فوراً ایک بڑی تنخواہ مل جاتی ہے جس سے اُن کے زندگی بسر کرنے کے معیار میں نیز عادات و اطوار میں فوراً ایک انقلاب آجاتا ہے۔ ان لوگوں کی وجہ سے ہندوستان میں حکومت پسند اور طبعاً خلافِ جمہورت ایک

خاص جماعت پیدا ہو گئی ہے۔ نیز اس امر کی اس لیے بھی ضرورت ہے کہ ہندوستان میں عام طور پر سن شعور دیگر ممالک کے لوگوں کے مقابلہ میں ذرا دیر سے آتا ہے جس کی وجہ سے کئی ایسے اشخاص جو قدرتاً کسی خاص ملازمت کے لیے بدرجہ اتم اہلیت رکھتے ہیں دیر کے بعد احساس پیدا ہونے کی وجہ سے اس میں شامل ہونے سے رہ جاتے ہیں اور کئی اشخاص محض ادبی لیاقت کی بنا پر جو اکثر حقیقی اور طبعی نہیں ہوتی ان ملازمتوں کو حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر تمام اشخاص کو ملازمت سرکار میں شامل ہونے کے لیے امتحانِ مقابلہ میں بیٹھنا پڑے اور شروع میں تنخواہ بھی یک صد روپیہ سے متجاوز نہ ہو تو اس سے عموماً ہر مستحق شخص کو زندگی میں بہتر مواقع مل سکیں گے اور پھر بعد میں بھی وہ اپنی قابلیت اور استعداد کی بنا پر بہتر گریڈ اور بہتر ملازمت حاصل کر سکے گا۔ لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ اسے پنشن یاب ہونے کی عمر تک اس قسم کے زریں مواقع دیے جاتے رہیں۔ ہندوستانیوں کے طبعی رجحانات کا ارتقاء ۳۰ سال کی عمر تک اکثر ہو چکتا ہے۔ جن ممالک میں تعلیم عام ہے اور خواندہ طبقہ کی کثرت ہے وہاں عموماً اشخاص کی عقل بہت کم عمر میں ہی پختہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً انگلستان یا دیگر یورپی ممالک میں اگر ۲۰ سال کی عمر تک کے لڑکے کو ہر قسم کا شعور حاصل ہو جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انگلستان کی فضا بلحاظ تعلیم و تربیت بہت اعلیٰ اور مصفا ہے۔ ترقی تعلیم کے ساتھ ہندوستانی بھی بہت جلد اس عقلی معیار کی بلندی تک پہنچ جائیں گے جو موجودہ وقت میں مغربی ممالک میں رائج ہے۔ لیکن اس وقت چونکہ تعقل و تفکر کی صلاحیتیں ان میں قدرے دیر سے پیدا ہوتی ہیں اس لیے کئی بہتر اشخاص کو ملازمتوں میں شامل ہونے کا موقعہ نہیں ملتا۔ لہذا ملازمت سرکار میں شامل ہونے کے لیے موجودہ طریقوں اور قاعدوں کو تبدیل کرنے کی ازحد ضرورت ہے۔

آرٹ

فنونِ لطیفہ کے ذریعہ بھی کسی بات کے بارہ میں عقیدت اور متنفقہ خیالات کی اشاعت ہوتی ہے۔ اگرچہ اس ذریعہ سے جو مساعی کی جاتی ہیں وہ دیر کے بعد کامیاب ہوتی ہیں۔ لیکن اُن کی کامیابی دائمی ہمہ گیر اور مکمل اثرات پیدا کرتی ہے عیسائیت کی تبلیغ اور حضرت عیسےٰ علیہ السلام اور حضرت مریم کی ذات سے عام عیسائیوں کی عقیدت آرٹ کی مرہونِ منت ہے۔ مصوری سرود ادب اور سنگتراشی نے عیسائیت کو پھیلانے میں رہبانیت کا کافی ہاتھ بٹایا۔ آرٹ ایک ایسی چیز ہے کہ اس کے متعلق عوام کے مختلف طبقوں میں اختلافِ رائے نہیں ہو سکتا۔ معمولی حالات میں شیریں پھل کے ذائقہ کے متعلق سبھی متفق ہونگے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص تو اسے شیریں کہے اور دوسرا اسے کڑوا یا ترش بتائے حسن کاری بذاتہٖ سب کے لیے یکساں اپیل رکھتی ہے۔ مصوری۔ راگ مجسمہ سازی، شعر سب آرٹ یعنی حسن کی اقسام ہیں اور حسن کو بلا تمیز مذہب و ملت سب لوگ یکساں طور پر سراہتے ہیں۔ کسی قوم کو متحد و متفق کرنے اور اس کے افراد کی باہمی مغائرت کو دور کر کے انہیں ایک دوسرے کے قریب تر لانے کے لیے آرٹ کے ذریعہ اہم خدمات سرانجام دی جا سکتی ہیں۔ اگر خوبصورت مجسمہ سرِ بازار دھرا ہو تو سب اُس کی تعریف و توصیف کریں گے۔ اگر خوبصورت تصویر کہیں آویزاں ہو تو گذرنے والے ٹھہر جائیں گے اور یکساں طور پر اس سے حظ اُٹھانے کی کوشش کریں گے۔ اسی طرح راگ کی کشش بھی انہیں ایک جگہ کھینچ لائے گی اور شعر کی چاشنی بھی انہیں حسب نسب رنگ خدو خال قدوقامت اور مذہب کے اختلافات کے باوجود یکساں طور پر لطف اندوز کرے گی وا دِ حسن پر مبنی یگانگت اور ہم آہنگی انہیں ایک دوسرے کا ہم خیال اور ہمدرد بنا دے گی۔ آرٹ کی یہ برکات نہ صرف ایک قوم اور ملک تک ہی محدود ہیں بلکہ ان سے دنیا بھر کے لوگوں

میں یگانگت و یکرنگی کی رنگین لہریں دوڑائی جا سکتی ہیں اور یہ احساس عام طور پہ پیدا کیا جا سکتا ہے کہ تمام بنی نوعِ انسان کی اصل ایک ہے اور انجام ایک ہے۔ آرٹ کے سامنے لوگ اپنے اختلافات کو بھول جاتے ہیں۔ اُن کی ذہنیت بدل جاتی ہے۔ اُن کی فطرت بلند ہو جاتی ہے۔ وہ ایک ملنے کے لیے ایک ہو جاتے ہیں۔ ایسے سریع الاثر مشترکہ محرک کو مستقل اور پائدار بنیادوں پہ کھڑا کر کے سیاسیات میں بھی مفید نتائج پیدا کرنا ممکن ہے۔ اس سے مخالفین کو آپس میں ملایا جا سکتا ہے اور ان میں ایک دوسرے کو سمجھنے کی اہلیت پیدا کی جا سکتی ہے انتشار انگیز قوتوں کے عمل کو روک کر پراگندگی کی بجائے اتحاد و اتفاق پیدا کیا جا سکتا ہے۔ فطرت انسانی کی بہیمیت سے پیدا ہونے والی عارضی رکاوٹیں جو انسانوں کے باہمی ملاپ میں مانع ہیں آرٹ کے ذریعہ دور ہو سکتی ہیں۔

ہندوستانی فنونِ لطیفہ کے ارتقا سے مثلاً مصوری مجسمہ سازی موسیقی اور ادبیات کی ترقی سے بشرطیکہ موخرالذکر کے لیے ملک بھر کی کوئی مشترکہ زبان ہو جائے۔ ملتِ ہندیہ کے مشترکہ نصب العین کی ہر دلعزیزی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ فنونِ لطیفہ میں سب لوگ خواہ ان کے سیاسی و مذہبی خیالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں یکساں طور پہ دلچسپی لے سکتے ہیں۔ اس دلچسپی سے یکساں قومی ذہنیت پرورش پاتی ہے جو اتحاد و اتفاق کے لیے از حد مفید ہے۔

ہندوستان اور باتوں میں خواہ کتنا ہی مجموعۂ اضداد کیوں نہ ہو لیکن ایک بات میں اور وہ اپنے فنونِ لطیفہ کے بارہ میں ایک مکمل اجتماعیت کی حیثیت رکھتا ہے۔ تہذیب و تمدن۔ مذہب اور قوم کے لحاظ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات خواہ کتنے ہی شدید کیوں نہ ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ آرٹ نے انہیں ایک سنہری زنجیر میں جکڑ کر ایک کر رکھا ہے۔ اُس کے فنونِ لطیفہ اس کی مشترکہ دولت ہیں۔ راگ مجسمہ سازی اور مصوری ایسے فنونِ لطیفہ نیز دیگر کارآمد

فنون کے بارہ میں اس کی یکسانیت اور یکجہتی مکمل ہے ۔ مصوری خواہ راجپوت سکول سے متعلق ہو خواہ مغل سکول سے ایرانی ہو یا ہندی سب کو یکساں طور پر پسند اور مرغوب خاطر ہے ۔ بنگالی مصوروں کی حسن کاری پنجاب والوں کو بھاتی ہے اور پنجابی مصوروں کی حسن کاری بنگال والوں سے خراج تحسین حاصل کرتی ہے موجم دار چغتائی اللہ بخش ایسی شخصیتیں جہاں تک فرقہ وارانہ معانی کا تعلق ہے نہ ہندو ہیں نہ مسلمان ۔ وہ صرف حسن کار ہیں اور اُن کی حسن کاری کی داد دہی کے بارہ میں مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ جذبات کو قطعاً کوئی تعلق نہیں ہوتا ۔ اُن کے اثرات اور شاہکار قوم کی مشترکہ دولت ہیں اور دنیا کے سامنے ہندوستانی آرٹ اور یکجہتی کے نمائندہ ہیں ۔

اسی طرح راگ کے بارہ میں پہاڑی پنجابی بنگالی گجراتی سب طرزیں ہندوستان بھر میں ہر جگہ یکساں طور پر ہر دلعزیز ہیں اور میوزک کانفرنسوں میں بنگالی پنجابی گجراتی مدراسی بہاری ہندو مسلم برہمن اور شودر وغیرہ کی تمیز اُٹھ جاتی ہے اور وہ سب یکساں طور پر ان میں حصہ لیتے ہیں اور عوام کے لیے بھی ہندوستانی راگ ایک ہے ۔

مجسمہ سازی کا بھی یہی حال ہے اور ادب اگرچہ مشترکہ زبان کوئی نہیں لیکن اس کی حقیقت ایک ہے ۔ جن جذبات اور احساسات کا مختلف زبانوں کے ذریعہ سے اظہار کیا جاتا ہے وہ ایک ہیں اور وہ سب کو ایک ہی طرح اپیل کرتے ہیں ۔

ہندوستان کا عام ملی اتحاد و اتفاق آرٹ کی مزید حوصلہ افزائی سے ممکن ہو سکتا ہے اور مختلف جماعتوں کی باہمی منافرت اور مغائرت بھی اس کے ذریعہ سے مٹائی جا سکتی ہے ۔

ایک بڑی حد تک آرٹ کا دارو مدار آب و ہوا عام فضا اور جغرافیائی حالات پر ہوتا ہے ہندوستان کے پہاڑ دریا جھیلیں جنگل میدان وادئیں وحوش طیور اور موسم مثلاً سرما بہار برسات اور خزاں اپنے اثرات پیدا کرتے وقت ہندو مسلم کی تمیز روا نہیں رکھتے ۔ ان کا

سب لوگوں پر یکساں اثر ہوتا ہے اور وہ اُن کے دلوں میں یکساں خیالات اور جذبات پیدا کرتے ہیں جن کی بدولت اُن کی زندگی کی نوعیت اور اُن کی ذہنیت کی اصلیت ایک ہے۔ اس مشترکہ حقیقت کا اظہار ہندوستانی آرٹ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر آرٹ کی حوصلہ افزائی کی جائے تو اس سے لوگوں کے عام طبقوں پر اپنی یکسانیت کا انکشاف ہوگا جس سے اُن کی باہمی ہمدردی اعتماد و موانست اور موافقت بڑھ جائے گی اور وہ بالآخر اپنے تمام ظاہری و سطحی اختلافات کو بھول کر باہم شیر و شکر ہوجائیں گے۔ یہی ملیت ہے +

اصلاح دیہات

اِس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ دیہاتی آبادی کے ہر قسم کے مفاد کے متعلق مجرمانہ غفلت سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ اُن کی سیاسی اقتصادی تعلیمی اور صنعتی بہتری کی طرف نہ تو حکومت نے اور نہ ہی پبلک کے لیڈران نے کبھی توجہ کی ہے۔ تمام ملکی و مجلسی تحریکات کو قصبات تک محدود رہنے دیا جاتا رہا ہے اور کبھی دیہات میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ تمام آبادی کو ایک ہی رشتہ میں پرو کر اس میں ایک ایسا لگاؤ پیدا کیا جاتا جس سے آئندہ کے لیے افتراق و انشقاق کے امکانات قطعاً دور ہوجاتے۔ دیہات کا قصبات سے اور قصبات کا بڑے بڑے شہروں سے۔ کاشتکار کا زمیندار سے اور زمیندار کا بیوپاری سے اور عام دیہاتی آبادی کا قصباتی آبادی سے اس طرح تعلق قائم کیا جاتا کہ ایک کی ہستی دوسرے کے بغیر اور دوسرے کی تیسرے کے بغیر علی ہذاالقیاس ناممکن ہوجاتی اور تمام ملک ذرائع رسل و رسائل تعلقات تجارت اور صنعت و حرفت کی باہمی اور مشترکہ ضروریات سے ایک ہی شہر معلوم ہوتا دیہاتی قصبات میں دیہاتی معلوم نہ ہوتے اور قصباتی دیہات میں اپنی شہری خصوصیات کی بنا پر

اوپر سے نظر نہ آتے ۔ کسان کو ہر ملکی تجارت اور صنعت و حرفت اور تاجر یا صناع کو ہر زرعی مفاد سے لگاؤ ہوتا اور سب آبادی کیا کسان اور کیا تاجر یا صناع ملکی، سیاسی، اجتماعی، تمدنی و ملی تحریکات اور سرگرمیوں میں یکساں طور پر حصّہ لینے کی اہل ہوتی ۔ اگر تمام جماعتیں بلحاظِ عقل و دانش ایک خاص مناسب معیار پر آجائیں اور اُن میں باہمی طور پر مالی توازن بھی قائم ہو جائے تو ملت کو نہ کوئی اندرونی اور نہ ہی کوئی بیرونی خطرہ رہتا ہے ۔ گذشتہ زمانہ میں جو بھی حملے ہوئے اُن میں سے کسی ایک کی بھی ملک نے وحدانی حیثیت میں مدافعت نہیں کی تھی ۔ شہر لٹے تو دیہات نے پروا تک نہ کی اور علیحدہ رہے ۔ شہریوں نے دیہاتیوں کو سیاسیات سے علیحدہ رکھ کر اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی ماری ۔ حکمران بھی انہیں باجگذار رعیت تصور کر کے ان سے مالیہ ہی وصول کرتے رہے ۔ دیہاتیوں نے بھی اُن کو چوتھ لینے والے اور اس کے عوض غارت گری سے باز رہنے والے اجنبی تصور کیا اور ملکی سیاسیات سے علیحدہ ہو کر مالیہ ادا کرنے والی غریب رعایا ہی بنے رہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو بھی فاتح ہوا اور اس نے مالیہ کا مطالبہ کیا اُنہوں نے اسے پورا کر دیا اور پھر اپنے کھیتی باڑی کے کام میں مشغول ہو گئے ۔ سیاسیات اور امورِ سلطنت کے کام کا تعلق براہِ راست شہروں سے رہا ۔ جس کی بنا پر صرف انہی کی سیاسی تربیت ہوتی رہی ایک نوے فی صدی زراعتی ملک کا بیرونی حملوں سے تحفظ دس فی صدی کی قلیل شہری آبادی سے بھلا کیونکر ہو سکتا تھا ؟ اگرچہ افواج میں دیہاتی ہوتے لیکن وہ صرف تنخواہ کے ملازم ۔ انہیں یہ خیال ہی نہ ہوتا کہ وہ اپنے بال بچوں اور ننگ و ناموس کی حفاظت کی خاطر لڑنے کے لیے بھرتی ہوئے ہیں ۔ وہ صرف ایک جابر خود مختار وقتی حاکم کے ڈر سے یا بھوکے مرتے تنخواہ کے لالچ سے افواج میں بھرتی ہوتے ۔ اگر تمام ملک ایک ہو اور قومی جذبات سینوں میں موجزن ہوں تو کسی بیرونی حملہ آور کو بھلا کب جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ آنکھ اُٹھا کر بھی اِدھر دیکھے صحیح معنوں میں ۱۹۱۹ء کی

اصلاحات کے نفاذ کے بعد دیہاتیوں کو سیاسیات کے میدان میں لایا گیا اور اُن کو ملکی معاملات میں حصّہ دیا جانے لگا۔ لیکن تعلیم کی کمی کے مہلک اثرات جن کے لیے سیاسی لیڈر اور حکومت ذمہ دار ہے ظاہر ہیں۔ اور ان کی بنا پر ملکی ترقی کی رفتار بہت مدھم ہے۔ ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے کسی مہمیز کی ضرورت ہے اور یہ مہمیز سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ روشن دماغ طبقہ ایثار سے کام لے۔ لیکن چونکہ ہماری سیاسی ترقی کی گذشتہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ہم نے اب تک جتنی بھی ترقی کی ہے وہ غیر شعوری طور پر حالات کے جبر اور حکومتِ برطانیہ کی تحریک سے کی ہے۔ ورنہ کوئی پروگرام بنا کر اور زندہ قوموں کی طرح شعوری طور پر اس کے مطابق عمل کرنے سے نہیں کی۔ لہٰذا ہمارا روشن دماغ طبقہ جس سے ہم مہمیز کا کام لینا چاہتے ہیں اس ملکی ضرورت کی طرف کہ وہ دیہات میں منتشر ہو جائے کبھی خود بخود متوجہ نہیں ہو گا لیکن اس کی توجہ اس طرف منعطف کرانے کے لئے صاحبِ اختیار اشخاص اس کی تعداد میں فوری اضافہ کر کے ایسے حالات پیدا کر سکتے ہیں کہ وہ قصبات کو چھوڑ کر دیہات میں جا بسنے پر مجبور ہو جائے۔ اس بات کے لیے سیاسی لیڈروں اور حکومت کے دوستانہ اشتراکِ عمل کی ضرورت ہے سیاسی لیڈر اگر حکومت کی مخالفت میں محنت اور وقت ضائع کرنے کی بجائے دیہات میں بیداری پیدا کرنے کی طرف توجہ دیں تو وہ قبیح نتائج جو قصباتی آبادی کے انبعاث کی بنا پر حکومتِ خود اختیاری کی تفویض سے مترتب ہونے ہیں رک جائیں گے سیاسی لیڈروں کو چاہیے کہ اپنے پیروؤں کو تین حصوں میں تقسیم کریں پہلا حصّہ اُن کی تقلید میں اُن کے ساتھ کام کرتا رہے۔ دوسرا حصّہ ملازمتوں میں شامل ہو کر سرکاری ملازمین کے اخلاقی معیار کو بلند کرنے کی کوشش کرے اور اپنے رویہ اور فرائض کی مناسب اور قانونی منشا کے مطابق ادائیگی سے اوروں کے لیے اچھی مثال قائم کرے۔ تیسرا حصہ نہایت اعلےٰ تعلیم یافتہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہو

جن کے کیریکٹر نہایت بلند اور جن کی شخصیت بہت جاذب ہو۔ یہ سب لوگ سراپا ایثار ہوں۔ ان میں نہ تو خواہش برتری ہو اور نہ ہی حب دنیا۔ یہ ایسے نوجوان ہوں جو اپنی عمریں ملک اور قوم کی نذر کر دیں۔ سادہ اور غریبانہ زندگیاں بسر کریں۔ دیہاتیوں میں رہیں۔ معمولی پیشے اختیار کر کے اپنی روزی کمائیں۔ قول اور فعل کے ذریعہ دیہاتی آبادی کو سیاسی و تمدنی تربیت دیں اور اُن کے عقل و اخلاق کے معیار بلند کریں۔

ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر آئندہ دس سال کے اندر اندر دیہاتی آبادی کی سیاسی تربیت کو مکمل کرنے کی ازحد ضرورت ہے۔ حکومت برطانیہ اور رعیہ ہندوستانیوں کی ایک بڑی اکثریت ڈومینین سٹیٹس کے سیاسی نصب العین کے بارہ میں متفق ہے۔ آنے والی اصلاحات کی وقتی میعاد کے پورا ہو جانے کے بعد دوسرا پرزور مطالبہ جو ہندوستانیوں کی طرف سے کیا جائے گا وہ ڈومینین سٹیٹس کا ہوگا۔ لہذا اس ہونے والے مطالبہ کے پیش نظر سب سے پہلے جو ضروری بات ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنے کو اس قابل بنا لیں کہ یہ مطالبہ کر سکیں اگر حکومت برطانیہ سے ہمیں ستعمراتی درجہ حکومت مل گیا لیکن ہماری سیاسی تربیت ادھوری رہ گئی تو اپنی نااہلیت کے ہاتھوں شدید نقصانات برداشت کرنے پڑیں گے۔ لہذا دیہاتیوں کی سیاسی تربیت اور اُن کو بیدار کرنے کے کام کو ابھی سے ہاتھ میں لینے کی ضرورت ہے۔ تعلیم کے ذریعہ روشن دماغ طبقہ کی تعداد میں اضافہ کیا جانا چاہیے تاکہ کثرت کی بنا پر اُن میں سے ایسے لوگ نکل آئیں جو دیہاتی آبادی کے مفاد کی خاطر اپنی قربانی دینے کے لیے نہ صرف تیار ہوں بلکہ ایسا ایثار کرنے کے لیے مجبور ہوں۔

موجودہ وقت میں وہ لوگ جو دیہاتیوں کے نمائندہ اور اُن کے لیڈر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں محض اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر اس عام بیداری سے فائدہ اُٹھاتے ہیں جو قصبات

میں تو حقیقی طور پر جلوہ گر ہے لیکن جو دیہات میں اگرچہ موجود نہیں لیکن اس کے بارہ میں یقین دلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ موجود ہے۔ مخرب رابطہ اتحاد بڑھ جانے سے رائے عامہ میں یکلخت ترقی ہو گئی اور اس سے عام پبلک میں بیداری کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس بیداری سے چند اشخاص نے فائدہ اُٹھا لیا اور عامۃ الناس کے خود ساختہ لیڈر بن گئے۔ ان اشخاص کے اپنے تئیں دیہاتی آبادی کے لیڈر ظاہر کرنے کے متعلقہ دعاوی بالکل بے بنیاد اور غلط ہیں۔ یہی لوگ جو دیہاتیوں کے لیڈر ہونے کا دعوے کرتے ہیں دراصل ملک کی ترقی کی راہ میں روڑا اٹکاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی حیثیت بنانے کی خاطر حکومت کے افسران کو دھوکہ دیا۔ وہ لوگ جو دیہاتی آبادی سے واسطہ رکھتے ہیں خوب جانتے ہیں کہ کانگرس کی کوئی تحریک دیہات تک نہیں پہنچی اور نہ ہی پہنچ سکتی تھی کیونکہ دیہاتی اپنی پس ماندگی اور غربت کی وجہ سے کانگرس کی باتوں کو سمجھنے اور ان میں حصّہ لینے کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ لیکن یہ لوگ اپنی کارگزاریاں بنانے کے لیے بناوٹی دیہاتی خطرات کی موجودگی بیان کرتے رہے اور دکھاتے رہے کہ کئی چیزیں محض ان کی وجہ سے وقوع پذیر ہونے سے رکی ہوئی ہیں۔ لیکن آفرین ہے ان انگریزوں کی عقل و دانش پر جنہوں نے اپنے کو حقیقتِ حال سے آگاہ رکھا اور اصل صورتِ حالات کے مطابق کارروائی کی۔ ان ۹۰ فیصدی دیہاتی آبادی کے خود ساختہ لیڈران کی خود غرض ذہنیت کا اس ایک بات سے پتہ چل سکتا ہے جو عام طور پر لوگوں میں مشہور ہے۔ کانگرس کی تحریک زوروں پر تھی اور حکومت کو امن و امان قائم رکھنے کا سخت فکر تھا۔ ایک شہر میں چند کانگرسی رضاکار جن میں مستورات بھی شامل تھیں کھدر پرچار اور پکٹنگ کیا کرتے تھے۔ ڈپٹی کمشنر انگریز تھا پکٹنگ خلافِ قانون بات تھی اور اس کو روکنا اس کا فرضِ منصبی تھا وہ اس فکر میں تھا کہ کسی طرح بغیر تشدد کے پکٹنگ رک جائے۔ کسی طرح یہ غلط افواہ مشہور ہو گئی کہ وہ رضاکار مستورات کو بر سرِ عام بید لگوا کر پکٹنگ سے روکنے

کی کارروائی پر غور کر رہا ہے۔ اس بات کو ایک نام نہاد دیہاتی لیڈر نے سُن پایا اور خیال کیا کہ ڈپٹی کمشنر کے دل میں خیال تو موجود ہی ہے کہ مستورات کو بید لگوائے جائیں کیوں نہ اس کارروائی کو اپنی طرف سے پیش کر کے ڈپٹی کمشنر کی خوشنودی حاصل کی جائے اور اسے اپنی پر اور زیادہ مہربان کر لیا جائے چنانچہ آپ پہنچے اور ڈپٹی کمشنر کے سامنے اسی بات کو ایک جدید مشورہ کے طور پر پیش کر دیا۔ بدقسمتی سے جو افواہ انہوں نے سُنی تھی بالکل بے بنیاد تھی۔ ڈپٹی کمشنر کو کبھی اس کا خیال تک نہ آیا تھا۔ اس نے اس مشورہ کو سننے کے بعد نہایت افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ آپ خیر خواہی سرکار کے اظہار کے لیے مجھے یہ مشورہ تو دے رہے ہیں لیکن کیا ملک معظم کی حکومت کے وقار کا بھی آپ کو کچھ خیال ہے۔ انگریز اس قسم کی حرکت نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی حرکات کر کے ملت برطانیہ دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی"۔ اس بات کی صحت کے متعلق وثوق سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس سے دیہاتی آبادی کے نام نہاد لیڈروں کی ذہنیت کی قلعی کھل جاتی ہے ہم ایسے دور اندیش اور حقیقی معنوں میں حکومتِ برطانیہ کے خیر خواہ اور وقارِ برطانیہ کو قائم رکھنے والے نیک دل انگریزوں کے مشکور ہیں اور اپنے میں ایسے اشخاص کی موجودگی کے لیے شرمسار ہیں جو سرکار کی خیر خواہی کرتے ہیں تو کسی اصول کے پیش نظر نہیں بلکہ اپنی خود غرضی کی وجہ سے۔ انہی لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے

"دہقان و کشت و جوے و خیاباں فروختند

قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند"

دیہات میں تعلیم یافتہ طبقہ کے انتشار سے اس قسم کے نام نہاد لیڈران کا قلع قمع ہو جائیگا ہمارے ایسے لیڈروں کی حرص آلود ذہنیت اور ترقی یافتہ رائے عامہ کا فرق اس عام شکایت سے کافی ظاہر ہے جو اندنوں پنجاب بھر کی کمیٹیوں کے انتظامات کے خلاف آئے دن سننے میں آتی

رہتی ہے ۔ مغربیت کے اثرات بسرعت تمام ملک میں سرائت کر رہے ہیں اور نوجوان طبقہ شدت سے اُن کو قبول کر رہا ہے لیکن وہ سابقہ نسل جو عمر کے حصّہ کہولت میں ہے بدستور برسر اقتدار ہے ۔ اس کے خیالات دقیانوسی ہیں وہ نہ تو حفظانِ صحت کے اصولوں کی اہمیت کو سمجھتی ہے اور نہ نئی روشنی کے نئے رجحانات کو ۔ اس لیے وہ ٹس سے مس نہیں ہوتی ۔ لیکن نیا طبقہ جو اُن کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ اور روشن دماغ ہے نئی روشنی کی ان تمام ضروریات کو سمجھتا ہے اور اُن کی عدم موجودگی کی شکایت کرتا ہے ۔ وہ اس ترقی پر قانع نہیں جو گذشتہ دس پندرہ سالوں کے عرصہ میں کمیٹیوں کے کام اور انتظام میں ہوئی ہے ۔ اُن کے خیال میں یہ ترقی کچھ حقیقت نہیں رکھتی ۔ لیکن پرانے طبقہ کی نظروں میں ایک بہت بڑی کامیابی اور ایک انوکھی تبدیلی ہے ۔ اس وقت کی ضرورت یہ ہے کہ یہ پُرانے بزرگانِ قوم اب آرام فرمائیں اور قومی فرائض کی انجام دہی نوجوان طبقہ کے سپرد کریں ۔ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو ترقی کی رو کو روکنے کے لیے ذمہ دار گردانے جائیں گے ۔

دیہات کے متعلق ایک اور اہم بات یہ ہو سکتی ہے کہ بڑے بڑے زمیندار جن پر اکثر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ سخت، فضول خرچ ہیں اپنے روپیہ کی قدر پہچانیں اور اسے ضائع کرنے کی بجائے صنعت و حرفت اور ترقی زراعت ایسے کاموں پر صرف کریں ۔ اس سے خود ان کو بھی فائدہ پہنچے گا اور ملک کی بھی خدمت ہوگی ۔ یہی بڑے بڑے زمیندار جن میں سے اکثر معمولی نوشت و خواند سے بڑھ کر اور کوئی زیادہ اعلیٰ قابلیت نہیں رکھتے اگر اپنی خواہش برتری پر قابو پائیں اور مختلف مقامی ادارات کی ممبریاں خود حاصل کرنے کی بجائے مربی بن کر انہیں ایسے نوجوانوں کو دلانے کی کوشش کریں جو قابل ہونہار اور محنتی ہوں تو بہت کم عرصہ میں بہت اچھے تجربہ کار سیاست دان اور کہنہ مشق لیڈر پیدا کیے جا سکتے ہیں ۔ اگر صوبجاتی کونسلوں کے ممبر بننے

کے لیے امیدوار کا کم از کم ڈگری یافتہ ہونا لازمی قرار دیا جائے۔ تو اس سے ہمارے پرانے بزرگ مجبوراً نوجوانوں کو کام کرنے کا موقع دیں گے ۔ اگر اس طرح نوجوان شخص کونسل کے ممبر بنا دیے جائیں تو چالیس پینتالیس سال کی عمر کو پہنچ کر وہ ایسے تجربہ کار اور واقف کار سیاست دان بن جائیں گے کہ اُن سے ملک و ملت کو بہت فائدہ پہنچے گا اور وقت بھی بچ جائے گا کیونکہ وہ موقع جو اُن کو موجودہ عمر رسیدہ حضرات کی موجودگی کی وجہ سے ایک مدت کے بعد ملتا ہے بہت عرصہ پہلے مل جائے گا۔ اس سے ایک تو وقت بچے گا دوسرے ملی معاملات بھی سرگرمی اور ہوشیاری سے طے پائیں گے ۔

کانگرس تعلیم یافتہ طبقوں کی شروع سے رہنما اور نمائندہ رہی ہے ۔ لیکن اس کا یہ دعویٰ کہ وہ تمام باشندوں کی نمائندہ ہے کبھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ دیہاتیوں کی ۹۰ فی صدی آبادی کی نمائندگی کے فرائض اس نے کبھی سرانجام نہیں دیے۔ کبھی اُن کے مفاد کا خیال نہیں رکھا۔ اِس امر کی ضرورت ہے کہ ایک ایسی جماعت پیدا کی جائے جو دیہاتیوں کی حقیقی معنی میں اس طرح نمائندہ ہو جس طرح کانگرس گذشتہ پچاس سال سے قصباتی آبادی کی نمائندہ ہے۔ یہ جماعت دیہاتی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تنظیم سے معرض وجود میں لائی جا سکتی ہے۔ جس وقت بھی یہ جماعت پیدا ہو جائے گی ملک کی سیاسیات ایک نئی روش اختیار کریں گی اور حقیقی ملی ترقی اسی جماعت کی وساطت سے ہی ہو سکے گی + اگر کانگرس اس بارہ میں اقدام کر کے اس جماعت کے پیدا کرنے کی کوشش کرے تو اس سے دیہات اور قصبات ایک رشتہ میں منسلک ہو سکیں گے اور اگر یہ جماعت بذاتِ خود یا کسی اور ذریعہ سے معرض وجود میں آئی تو شروع میں کچھ عرصہ تک یعنی جب تک دیہاتی اور قصباتی مفاد کا توازن قائم نہیں ہو جائے گا اُن کا آپس میں تصادم ہوتا رہے گا اور اس سے ملک کی کلی اجتماعیت جلدی مکمل نہیں ہو سکیگی ۔ کانگرس کو حکومت کی مخالفت کا خیال

ترک کرکے مستقبل قریب کی طرف دھیان دینا چاہئے۔ مستقبل بعید میں پیدا ہونے والے حالات کے متعلق سوچ بچار کرنے کو فی الحال ملتوی کیا جا سکتا ہے۔ مستعمراتی درجہ کی حکومت خود اختیاری کی تفویض سے پہلے اپنے میں اہلیت پیدا کرنا ضروری ہے اور اہلیت اسی طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ دیہاتی آبادی کی سیاسی تربیت کا فوری اور خاطر خواہ انتظام کیا جائے۔

مہاتما گاندھی کی موجودہ وقت میں کانگرس سے علیحدگی اور سماجی اصلاح کی طرف توجہ وقتی ضرورت کے عین مطابق ہے۔ ملیت کے مفاد کے پیش نظر ذات پات کے تفرقات کو مٹانا اور قریباً ۵ کروڑ اچھوتوں کو سوسائٹی میں شامل کرنا نیز دوسری تباہ کن رسموں کی بیخ کنی از حد ضروری ہے۔ اس کام کا بیڑا اُٹھا کر مہاتما گاندھی نے اپنی دور اندیشی اور تدبر کا ثبوت دیا ہے۔ مستعمراتی درجہ کی حکومت خود اختیاری کی توقعات کے پورا ہونے کے لیے جتنا عرصہ درکار ہے وہ اس قدر تھوڑا ہے کہ اس میں سماجی اصلاح کے اتنے بڑے کام کو سرانجام دینا اس وقت تک ممکن نہیں ہو سکتا جب تک کہ مہاتما گاندھی کے علاوہ تمام کانگرس نیز دیگر مجلسی ادارات اس طرف نہیں جھک پڑتے۔ کانگرسی لیڈروں کا یہ خیال ہے اور عملی تجربہ سے بھی یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ سیاسی معاملات ان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے محرک ہوتے ہیں۔ لیکن سماجی اصلاح کا سوال پیدا ہونے سے وہ آپس میں پھٹ جاتے ہیں اور اس سے مختلف گروہوں میں اختلافِ رائے پیدا ہو جاتا ہے۔ اس اختلاف رائے کے پیدا ہو جانے کے خوف کی بنا پر وہ سماجی اصلاح کے کام کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں دیتے۔ ان کی یہ کمزوری بحیثیت لیڈر اُن کی منافقت کی دلیل ہے اور کانگرس ملک کی نمائندہ اور راہنما ہونے کے رتبہ سے گر جاتی ہے کانگرس اپنے سالانہ اجلاسوں میں سماجی اصلاح کے بارہ میں قرار دادیں تو ہمیشہ سے منظور کرتی چلی آئی ہے۔ لیکن بعض رکنوں کی مخالفت کے خوف سے ان قرار دادوں کو جامۂ عمل پہنانے کی اس

نے کسی موقع پر نیم دلی سے بھی کوشش نہیں کی۔ مہاتما گاندھی جی نے کانگریس سے علیحدہ ہو کر اور اصلاح کے کام کو شروع کر کے بحیثیت لیڈر خلوصِ نیت اور ایمانداری کا ثبوت دیا ہے ۔ منافقت کا عام اعتراض جو سماجی اصلاح کے کام سے دیدہ و دانستہ پہلو تہی کرنے کی بنا پر کانگریس پر عائد کیا جا سکتا ہے ان پر عائد نہیں ہو سکتا۔ سماجی اصلاح کے کام کو شروع کرنے کے لیے کانگریس سے علیحدہ ہونے کی ضرورت شائد انہیں اس خیال کی بنا پر محسوس ہوئی ہو کہ سماجی اصلاح کے پروگرام سے اراکینِ کانگریس میں اختلافِ رائے پیدا ہو جایا کرتا ہے اور اس کی بنا پر اس کی اہمیت کو توڑنا درست نہیں +

مغربیت نے قصباتی رقبات کی حالت بدلی بھی اور سدھری بھی۔ لیکن جہاں تک دیہات کا واسطہ ہے اس سے دیہاتی سوسائٹی کے پرانے مجلسی نظام کی تخریب ہوئی۔ پہلے نصابِ تعلیم میں عربی فارسی منطق فلسفہ کی کتب کے علاوہ طبی کتب بھی شامل ہوا کرتی تھیں اور ہر پڑھا لکھا آدمی علمِ طب سے کم و بیش واقف ہوا کرتا تھا۔ اسی طرح ویدک طریقۂ علاج کے سیکھنے کی طرف بھی لوگوں کا عام رجحان تھا۔ اگر ہر گاؤں میں نہیں تو کم از کم قریب قریب کے دو تین گاؤں میں کوئی نہ کوئی وید یا حکیم خاندان ہوتا جو نسلاً بعد نسلٍ دیہاتی آبادی کے علاج معالجہ کی خدمات سر انجام دیتا رہتا۔ مغربی طریقۂ علاج نے قصبات میں تو مکمل طور پر دیسی طریقۂ علاج کی جگہ لے لی اور اس سے مقابلتاً عوام کو فائدہ بھی کافی ہوا۔ لیکن جہاں تک دیہات کا تعلق تھا اس نے وہاں کے ایرانی و ویدک طریقۂ علاج کو تو اکھاڑ باہر پھینکا۔ اور خود بھی اُن کی جگہ نہ لی۔ دیسی طبیبوں اور ویدوں کی حوصلہ شکنی ہوئی اور اُنہوں نے طبابت کے آبائی پیشہ کو چھوڑ کر اَور اَور ذرائع معاش تلاش کر لیے اس سے دیہاتیوں کو اُس طبی امداد سے بھی مایوس ہونا پڑا جو پہلے فوراً بہم پہنچ جایا کرتی تھی۔ مغربی طریقۂ علاج اگرچہ مفید اور کار آمد ہے لیکن دیہات اس کی برکات

سے تمتع اندوز نہیں ہو سکتے۔ اس کے رائج ہو جانے سے دیہات کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ مغربی طریقہ علاج پر بہت خرچ آتا ہے اور دیہاتی آبادی اپنی تنگ دستی کی وجہ سے اس سے فائدہ اُٹھانے سے قاصر ہے۔ اگرچہ دیہاتی شفاخانے موجود ہیں لیکن دیہاتی ضرورت کے مقابلہ میں اُن کی تعداد بہت تھوڑی ہے اگر دس بارہ کوس کے فاصلہ پر ایک ایسا شفاخانہ ہو، بھی تو دیہاتیوں کے لیے اپنا کام چھوڑ کر وہاں سے ڈاکٹر کو بلا کر لانا بہت مشکل ہوتا ہے اور اگر جا کر ڈاکٹر کو لایا بھی جائے تو اس کی فیس خواہ کتنی بھی تھوڑی کیوں نہ ہو مثلاً دو روپیہ بہت کم شخص ادا کر سکتے ہیں۔

اس طرح مغربیت نے دیہاتیوں کے فوجداری و دیوانی باہمی تنازعات کے تصفیہ بذریعہ پنچایت کے طریقہ کو جڑ سے اکھاڑ دیا۔ مغربی طریقہ عدالت گستری ایسا تھا کہ اس کے اخراجات غریب دیہاتی آبادی کے لیے ادا کرنا محال تھا۔ ایک مقدمہ کے اخراجات مثلاً وکلا کی فیس اسٹامپ فیس نقول حاصل کرنے کی فیس وغیرہ وغیرہ مل ملا کر اتنے ہو جاتے ہیں کہ ان کے ادا کرنے کے بعد غریب کاشتکار کو اپنی خوشحالی سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ مغربیت نے پنچایتوں وغیرہ کے طریقہ کو توڑ کر ہمارے دیہات کو نقصان پہنچایا ہے اور اس نقصان کی کسی نعم البدل کے ذریعہ اب تک تلافی نہیں ہوئی۔

اس نقصان کی تلافی کرنے کے لیے جو دیہات کو مغربیت کے اثرات سے پہنچا اب تعمیری کام کرنے کی ضرورت ہے۔ محکمہ صحتِ عامہ اگرچہ اس کام کی طرف ایک قدم اُٹھانے کے مرادف ہے لیکن یہ ایک ایسا قدم ہے جو دلدل میں رکھا گیا ہو اور جسے آگے بڑھنے کے لیے دوبارہ اُٹھانا دوبھر ہو جائے۔ پہلے ضرورت اس امر کی ہے کہ دیہات کو غربت کے پنجۂ آہنی سے چھڑا کر بلند نگاہی کا سبق دیا جائے۔ تاکہ اُن کو خود بخود اپنی ابتر حالت کا احساس ہو اور وہ اصلاح

کے کام میں حکومت کے ساتھ اشتراک عمل کر سکیں ۔ دیہاتی آبادی اوّل تو بہت مفلوک الحال ہے اور دوسرے اس پر مقروضیت کا بار اس قدر زیادہ ہے کہ وہ سر نہیں اٹھا سکتی ۔ اِس مقروضیت کی وجہ بھی مغربیت کے اثرات ہیں ۔ حکومتِ برطانیہ نے ملک میں مکمل امن قائم کر دیا اور ساہوکار اور زمیندار کے وہ پہلے سے تعلقات نہ رہے ۔ یعنی زمیندار کو ساہوکار سے قرضہ لینے کی ضرورت تو بدستور قائم رہی لیکن صدودرجہ امن قائم ہو جانے سے ساہوکار کو اس حفاظت کی ضرورت نہ رہی جس کے لیے وہ زمیندار کا محتاج ہوتا ۔ لہذا اس نے قرضہ اور سود کے بارہ میں ہر ممکن حیلہ اور ہر قسم کی دیدہ دلیری سے کام لیا ۔ قانون اس کی حفاظت اور اس کے قرضہ کی ادائیگی کے لیے موجود تھا ۔ دیہاتی قرضہ کا بیشتر حصّہ ایسا ہے جسے کسی مفید کام میں بطور سرمایہ لگانے کے لیے نہیں اُٹھایا گیا تھا بلکہ فضول خرچیوں کے لیے لیا گیا تھا ۔ یکے بعد دیگرے کئی سالوں کے سود مرکب سے وہ بتدریج بڑھتا رہا حتیٰ کہ اس کے بوجھ سے زمیندار بالکل دب گئے اب ملکی مفاد کے پیش نظر اُن کی مقروضیت کو دور کرنا از حد ضروری ہے ۔ اور یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو ایسے قوانین وضع کیے جائیں جو قارضین کی امداد کے لیے مفید ہوں اور دوسری طرف دیہات میں مجلسی اصلاح کے کام کو شروع کیا جائے زمینداروں کو کفایت شعاری سکھائی جائے گھریلو دستکاریاں سکھائی جائیں تاکہ اُن کی آمدنی میں اضافہ ہونے سے اُن کی حالت بدل سکے مختصراً دیہاتیوں کے لیے طبی امداد کا انتظام کرنے اور انہیں مقدمات کے اخراجات سے نجات دلانے کی از حد ضرورت ہے ۔ اس طرف نمائندہ حکومت کو فوری توجہ دینی چاہیے ۔ اُن کی تعلیم تنظیم اور سیاسی تربیت کا کام تعلیم یافتہ طبقہ حکومت کے ساتھ اشتراک عمل کر کے بطریق احسن سرانجام دے سکتا ہے ۔

انگریزوں کے آنے سے پہلے دیہاتی تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہ تھا ۔ مسجدیں تھیں

یا عام پاندہ سکول تھے ۔ عام صنعتی تعلیم گھروں پر ہی ہو جاتی۔ کسان کا لڑکا کھیتی باڑی کا کام گھر پر ہی سیکھتا۔ سنار کا لڑکا بھی اپنے آبائی پیشہ کو دکان پر سیکھتا۔ بڑھئی اپنے لڑکے کو بڑھئی کا کام سکھا دیتا اور لوہار اپنے کام کی اپنے لڑکے کو تربیت دیتا۔ ادبی تعلیم کی اتنی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیکن جمہوری اور نمائندہ قسم کی حکومت کے قائم ہونے سے پرانی وضع کے نظام بھی بدلنے پڑے اور دیہاتیوں کی تعلیم و تربیت کی طرف بھی توجہ دی جانے لگی۔ لیکن یہ توجہ نامکمل بھی تھی اور ناقص بھی۔ پرائمری مدرسے جو دیہاتی رقبوں میں قائم ہوئے اگرچہ اُن کا مقصد لوگوں کو خواندہ بنا کر فہم عامہ کی سطح کو بلند کرنا تھا لیکن طریقہ تعلیم جو اختیار کیا گیا ناموزوں اور نامناسب تھا۔ پرائمری مدرسہ کا مقصد یا تو بچے کو یونیورسٹی تعلیم کے لیے تیار کرنا ہو گیا یا ادنےٰ قسم کی ملازمتوں مثلاً پٹوار محرری وغیرہ کے لیے نوشت و خواند کے قابل بنانا۔ جتنے لڑکے مدرسہ میں داخل ہو کر خواندگی کے معیار تک پہنچتے ان میں سے ۶۰ فی صدی کے قریب تو مدرسہ چھوڑنے کے چار یا پانچ سال بعد پھر ناخواندہ ہو جاتے۔ باقی میں سے صرف چند ایک ملازمتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے۔ اس طرح بہت ہی تھوڑے ملازمت کی مدد کے بغیر تاحین حیات خواندگی کے معیار کو قائم رکھ سکتے تھے۔ ۶۰ فی صدی کے اس قدر جلد ناخواندہ ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ کار و بارِ زندگی میں وہ تعلیم جو انہوں نے سکول میں حاصل کی ہوتی کسی کام نہ آتی اور ایسی حالت میں جب کہ نوشت و خواند کا کبھی موقع ہی نہ ملتا ضروری تھا کہ وہ سب کچھ بھول بھلا کر پھر کورے کے کورے رہ جاتے۔

ضرورت اس امر کی تھی کہ دیہاتی بچوں کو ایک طرف تو خواندہ بنانے کی کوشش کی جاتی اور دوسری طرف اُن کی مالی حالت کو درست کرنے کے لیے کسی گھریلو دستکاری کی تعلیم دی جاتی۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ پرائمری مدرسوں میں صنعتی تعلیم ہونی چاہیئے تھی۔ صنعتی تعلیم سے

مراد سنار، لوہار، بڑھئی، موچی اور کسان کے پیشے سکھانا ہے۔ دیہاتی ضروریات کے پورا کرنے کے لیے ان پیشوں کی تو ان مختلف ذاتوں کے بچوں کو گھروں ہی میں تربیت دی جاتی ہے گھریلو دستکاریاں جن کے سکھانے کی ضرورت ہے ان اشیا کے تیار کرنے کے متعلق ہونی چاہئیں جن کی مانگ نئے تہذیب و تمدن اور نئی روشنی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً لکڑی کا آرائشی سامان، بوٹ موزے۔ دستانے۔ نبیانیں۔ پنیں۔ ہولڈر۔ پنسلیں۔ پیتل اور چاندی کا آرائشی سامان یعنی ایسی اشیا جو چھوٹی قسم کی مشینوں کے ذریعہ سے تیار ہوتی ہیں اور جو عام طور پہ استعمال میں آتی ہیں۔ نیز اس قسم کی اشیا کے تیار کرنے کی مشینیں ان گھریلو دستکاریوں کی تعلیم عام لوگوں کو بلا تمیز ذات و مذہب دی جانی چاہیے۔ تاکہ دیہاتی آبادی ان کے ذریعہ اپنی آمدنی کو بڑھا سکے۔ جنگِ عظیم کے بعد عام دیہاتی آبادی کی مالی حالت بہت اچھی تھی۔ اگر اس وقت اس بارہ میں کوشش کی جاتی تو نہایت آسانی سے کامیابی حاصل ہو سکتی تھی کیونکہ لوگوں کے پاس اتنا سرمایہ تھا کہ وہ اسے ایسی چھوٹی چھوٹی دستکاریوں کے لیے صرف کر سکتے تھے۔ افسوس اس وقت اس کا کسی کو خیال نہ آیا اور دیہاتی آبادی نے اپنے روپیہ کو فضول باتوں میں صرف کر دیا۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے انگریزوں سے پہلے صنعتی تربیت کا تو گھروں پر ہی انتظام ہو جاتا اور ادبی تعلیم یعنی نوشت و خواند کی قابلیت ایک کم بلند معیار کے مطابق مکتبوں اور پاندہ سکولوں میں دی جاتی۔ لیکن پرائمری سکولوں نے اس پرانے نظام کو بگاڑ دیا اور خود بھی اس کے اچھے نعم البدل ثابت نہ ہو سکے۔ ہندوستان میں قریباً عرصہ ۸۰ سال سے دیہاتی آبادی کی تعلیم کے بارہ میں کوشش کی جا رہی ہے لیکن ابھی تک کوئی خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو سکے اور وجہ صرف یہ ہے کہ نئی روشنی کی ضرورت کے مطابق دیہات کا قصبات سے کوئی گہرا تعلق پیدا کرنے کی

کوشش نہیں کی جاتی تاکہ قصبات کے خوشگوار اثرات دیہات تک پہنچتے رہیں اور دیہاتی بھی ان سے تمتع اندوز ہوتے رہیں۔ اگر ایسی صنعتی اشیا تیار کرنے کی تعلیم عام دیہاتی مدارس میں دی جاتی جن کا مطالبہ زیادہ تر شہری آبادی کی طرف سے ہوتا ہے تو یہی صنعتی اشیا دیہات کا قصبات سے ایک گہرا تعلق قائم کر دیتیں۔ نیز اس سے دیہاتیوں کی مالی حالت بھی سدھر جاتی۔ نہ اُن کو قرضہ لینے کی ضرورت پڑتی اور نہ ہی وہ قرضہ کے بار سے اتنے لاچار ہوتے جتنے کہ موجودہ وقت میں ہوئے ہیں۔

اس وقت دیہاتی تعلیم پر جس قدر خرچ کیا جاتا ہے اُس کا نصف سے زائد حصّہ تو بالکل رائیگان جاتا ہے کیونکہ ۶۰ فی صدی کے قریب پرائمری پاس خواندہ دیہاتی تو چند سالوں کے بعد پھر کورے ہو جاتے ہیں۔ خواندگی کے معیار کو برقرار رکھنے کے لیے بہت کم قیمت دیہاتی اخبارات جاری کرنے کی ضرورت تھی تاکہ دیہاتی اخبار بینی کے شوق سے معمولی نوشت و خواند کی قابلیت نہ کھوتے اور عام ملکی حالات سے اطلاع پاتے رہتے۔

اس کے علاوہ اس امر کی بھی ضرورت تھی کہ کالجوں کو شہروں میں کھولنے کی بجائے ایسے مقامات پر جاری کیا جاتا جن کے اردگرد زیادہ تر دیہات ہوتے۔ یہ کالج رہائشی ہونے چاہیئے تھے۔ طلبا بورڈنگ ہوسٹز میں رہ کر کالجوں میں تعلیم پاتے۔ اس سے ایک تو تعلیم یافتگان دیہاتوں اور دیہاتیوں سے مانوس ہو جاتے دوسرے دیہات میں تعلیم کے ان مرکزوں کی موجودگی عام دیہاتی ذہنیت کو درست رکھتی +

ایک اور بات جو دیہاتوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے یہ ہے کہ پرائمری مدارس کے معلمین کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے۔ ان کی تعداد بڑھائی جائے۔ اور جن کی تعلیمی قابلیت کا معیار بھی پہلے کی نسبت بہت بلند رکھا جائے۔ اگر مدرسوں کی موجودہ تعداد

کو نصف کر کے اُن کے عام معیارِ تعلیم کو ادبی و صنعتی لحاظ سے بلند کر دیا جائے تو بہت بہتر ہو گا۔ کیونکہ اس سے کم از کم وہ محنت جو ۶۰ فی صدی ایسے طلبا پر رائیگان صرف ہوتی ہے جو بہت جلد پھر ان پڑھ ہو جاتے ہیں بچ رہے گی اور جتنے بھی طلبا پرائمری مدرسوں سے تعلیم حاصل کر کے فارغ ہوں گے قابلیت کے معیار کو مستقل طور پر قائم رکھ سکیں گے + اگر ہر پانچ چھ میل کے حلقہ کے اندر ایک ایسا سکول ہو تو کافی ہے +

اس وقت دیہات میں سائیکلوں کا رواج ہو رہا ہے۔ اگر کم قیمت مضبوط سائیکل دیہات کے لیے مہیا کیے جا سکیں تو اس سے بھی تعلیم کے بارہ میں اور عام سطح اور اک کے بلند کرنے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ اگر سستے داموں پر سائیکل مہیا کیے جا سکیں تو بچے اگر مدرسہ دور بھی ہو تو آسانی سے آ جا سکتے ہیں۔ دیہاتوں میں پگ ڈنڈیوں پر اور معمولی رستوں پر آسانی سے سائیکل چل سکتا ہے۔ نیز سائیکلوں کے عام رواج سے دیہاتیوں کی قریب کے قصبات اور شہروں میں عام آمد و رفت بھی بڑھ جائے گی۔ اور اس طرح دیہات اور قصبات کے رہنے والے اور قریب تر ہو جائیں گے۔ گھر سے نکلنے سے بھی ارد گرد کے حالات کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کدھر کو جا رہی ہے اور ہم کدھر جا رہے ہیں۔ موجودہ وقت میں لاریوں کے چلنے سے عام دیہات میں قدرے بیداری پیدا ہو گئی ہے۔ دوسروں کی خوشحالی کو دیکھ کر اپنی پست حالی کا ضرور احساس پیدا ہوتا ہے۔

دیہات میں بیداری پیدا کرنے کے لیے جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے تعلیم یافتہ طبقہ کا شہروں سے اخراج اور دیہات میں انتشار بہت ضروری ہے۔ اگر یہ عمل شروع ہو جائے تو دیہات کی تنظیم آسان ہو جائے گی۔ مثلاً ہر ایک گاؤں میں ایک مقامی انجمن اصلاح قائم ہو جو کم از کم تین ممبروں پر مشتمل ہو۔ اس کا پہلا رکن ایک نہایت اعلیٰ قابلیت رکھنے والا رضا کار ہو۔

اور باقی کے دو اُس کے معاون ہوں ۔اسی طرح ایک اور لیکن قدرے بڑی انجمن ہر ایک ذیل میں قائم کی جائے جس میں ان مقامی دیہاتی انجمنوں کے نمائندے شامل ہوں۔اس سے بڑھ کر ایک ایسی ہی انجمن ہر تحصیل میں اور پھر ہر ضلع میں ہو + اور آخیر میں صوبجاتی مرکزی انجمن اصلاح ضلع کی انجمنیں سہ ماہی یا ششماہی اجلاس منعقد کریں جن میں دیہاتی مقامی انجمنوں کے نمائندے شامل ہوں اور اسی طرح صوبجاتی مرکزی انجمن اپنا سالانہ اجلاس منعقد کیا کرے جس میں صوبہ بھر کے ضلعوں کی انجمنوں کے نمائندے شامل ہوں + اس سے مختلف انجمنوں کے کارندے آپس میں ملتے جلتے رہیں گے اور ذوقِ عمل قائم رہے گا پبلک سپرٹ کی تجدید ہوتی رہے گی اور اخلاقی معیار بھی گرنے نہیں پائے گا + دیہاتی اصلاح کے تمام کام مثلاً دستکاری حفظانِ صحت تعلیم قرضہ ٹمپرنس وغیرہ سے متعلقہ تمام امور اُن کے سپرد ہونے چاہئیں۔اس قسم کے نظام کو اگر قومی لیڈر معرضِ وجود میں لائیں تو بہتر ہوگا۔کیونکہ سرکاری طور پر مفادِ عامہ کے جو محکمے جاری ہوتے ہیں ان میں حقیقی معنوں میں خدمت خلق کی روح موجود نہیں ہوتی اگرچہ اُن کو نہایت اخلاص سے معرضِ وجود میں لایا جاتا ہے لیکن تحکم کی بو اُن کے افسران کے دماغوں میں سے دور نہیں ہوتی۔جب وہ میدانِ عمل میں آکر کام شروع کرتے ہیں تو دیگر انتظامیہ محکموں کے افسران کی دیکھا دیکھی اُن میں بھی حکومت پسندی آجاتی ہے اور وہ اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ اُن کا کام منت سماجت اور پراپاگنڈا سے لوگوں کو راہِ راست پر لانا ہے نہ کہ احکام جاری کرکے + محکمہ اشتراکِ باہمی۔محکمہ صحتِ عامہ اور محکمہ تعلیمات کے افسران کو اکثر شکایت کرتے سنا گیا ہے کہ ہمارے پاس اختیارات نہیں اور اس لیے ہم کام نہیں کرسکتے ہیں۔مفادِ عامہ کے کام اختیارات کے زور سے نہیں کرائے جاسکتے بلکہ یہ پبلک سروس کی سپرٹ اور ذاتی ایثار سے ہی سرانجام پاسکتے ہیں لہٰذا اگر دیہاتی اصلاح کے لیے اس قسم کا کوئی نظام جس کا ذکر کیا گیا ہے

ملکی لیڈروں اور پبلک کی طرف سے معرض وجود میں آئے گا تو اس کے کارندوں کی ذہنیت کے بگڑ جانے کا احتمال نہیں ہو گا۔

تمام مشرقی ممالک کا یہ خیال ہے کہ قانون کسی غیر انسانی طاقت کی طرف سے نفاذ پذیر ہوتا ہے۔ نہ اس میں تبدیلی ہو سکتی ہے نہ ہی ترمیم۔ لہٰذا اس کی سختی سے بچنے کے لیے حیلہ جوئی کے بغیر چارہ نہیں۔ اس عام خیال کو ہندوستانی آبادی کے دلوں سے نکال کر ان پر واضح کرنا چاہیے کہ قانون کو انسان اپنے لیے خود ہی وضع کرتا ہے اور خود ہی اسے اپنے پر عائد کرتا ہے۔ اس کی ترمیم کرنے کا بھی وہ مجاز ہے۔ لہٰذا اس کا احترام لازمی ہے۔ اور اگر اس میں کوئی غلطی ہے یا وہ نامناسب طور پر شدید ہے تو جائز آئینی طریقوں سے اس کی ترمیم یا تنسیخ بھی عمل لائی جا سکتی ہے۔ یہ کام سرکاری افسران سرانجام دے سکتے ہیں۔ اس وقت ہر ایک سرکاری ملازم خواہ ادنےٰ ہو خواہ اعلےٰ اگر اس سے کبھی کوئی کام پڑ جاتا ہے تو وہ اپنے اختیارات کا ضرور احساس کراتا ہے۔ کبھی یہ بتا کر کہ وہ رعایت کر سکتا ہے اور کبھی یہ ظاہر کر کے کہ وہ تنگ کر سکتا ہے+ تمام ہندوستانی لوگوں کی ذہنیت کو درست کرنے کے لیے پہلے سرکاری افسران کی اپنی ذہنیت کا درست ہونا لازمی ہے۔ سرکاری افسر اگر اپنی ذات کا احترام کرانے کی بجائے قانون کا احترام کرانا چاہیں تو ایسا کر سکتے ہیں + اگر محکم ایسی خواہشات بے جا کے بارہ میں اپنے پر ضبط کر کے آپس میں اشتراک عمل کریں تو عام اصلاح کے کام میں سرکاری افسران ممد ثابت ہو سکتے ہیں +

دیہاتی آبادی کی سیاسی تربیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ پرائمری مدارس کے نصاب تعلیم میں ایسی کتب شامل کی جائیں جن میں نہایت سلیس عبارت میں نظام حکومت کی تشریح کی گئی ہو۔ انسانی حقوق بتائے گیے ہوں۔ عوام اور حکومت کے فرائض درج کیے گئے ہوں

اور ملی اتحاد و اتفاق کی ضرورت اور اُس کے فوائد کی تشریح کی گئی ہو۔ اس سے یہ عام خیال کہ حکومت مائی باپ ہے لوگوں کے دلوں سے دور ہو جائے گا اور اُن کو معلوم ہوگا کہ حکومت اُن پر ہی مشتمل ہے۔ اس سے ہر بات کو حکومت پر چھوڑنے کی جو انہیں عام عادت ہے دور ہو جائے گی اور وہ سمجھنے لگیں گے کہ جب تک مفادِ عامہ کے کاموں کے لیے حکومت کیلئے جو اُن کی نمائندہ ہے روپیہ فراہم نہیں کیا جائے گا وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ اس سے اُن کی ذہنیت بدل جائے گی اور وہ اپنی آسائش کے لیے ہر قسم کے ٹیکس ادا کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے نیز ان کو اپنی حالت کے بدلنے کا بھی خیال پیدا ہوگا۔ اگر حکومت اُن پر اس امر کو واضح کر دے کہ حکومت کا کام اُن کی آسائش کے انتظامات کرنا ہے اور اُن کا فرض محنت سے اپنی آمدنی کو بڑھانا اور محاصلات کی ادائیگی سے حکومت کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ ان انتظامات آسائش کو مکمل کر سکے تو اس سے نہایت مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ دیہاتی آبادی کو ابھی تک یہ معلوم نہیں کہ وہ مالیہ اور دیگر محاصل کیوں ادا کرتی ہے۔ موجودہ مالیہ اور مرہٹوں کی چوتھ میں ابھی تک دیہاتیوں کو فرق معلوم نہیں ہوا۔ اُن کو کم از کم اتنا تو پتہ ہونا چاہیے کہ مالیہ کی ادائیگی کس لیے کی جاتی ہے اور اس سے انہیں کیا حقوق ملتے ہیں اور حکومت پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں اس وقت غیر ملکی عیسائی مشنوں نے اشاعت تعلیم کے لیے وسیع پیمانوں پر انتظامات جاری کیے ہوئے ہیں۔ شروع میں اصلاح کے کسی دیہاتی نظام کے قائم کرنے کے راستہ میں جو مالی دقتیں حائل ہو سکتی ہیں اُن کو ان مشنوں کے اشتراکِ عمل سے دور کیا جا سکتا ہے۔ غیر ملکوں سے بھی اپیلیں کی جا سکتی ہیں۔ برطانیہ عظمیٰ اور امریکہ کی مشنری سوسائٹیاں اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے تیار ہونگی۔

اور صوبوں کے متعلق تو وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن پنجاب میں ضروری ہے کہ

ایسے دیہاتی تعلیم یافتہ لوگ جو شہروں میں سکونت گزیں ہو رہے ہیں کسی وقت اقتصادی ضروریات سے مجبور ہو کر دیہات کی طرف رجوع کریں ۔ وجہ یہ کہ پنجاب چھوٹے چھوٹے زمینداروں کا صوبہ ہے ۔ ہر شخص مالکِ اراضی ہے ۔ اور اس سے اس میں ابھی تک اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کی صلاحیت بدستور موجود ہے ۔ دیگر صوبوں میں زیادہ تر تعلقہ داری ہے ۔ ایک شخص مالک ہوتا ہے اور باقی اُس کے مزارع ہوتے ہیں جس سے مؤخرالذکر کی مالی حالت ایسی اچھی نہیں ہوتی کہ وہ رشک کی بنا پر اپنی بہتری اور بچوں کی تعلیم کی طرف آزادانہ توجہ دے سکیں ۔ لیکن پنجاب میں ہر ایک زمیندار اپنے لڑکے کو خود تنگ رہ کر بھی کالج میں بھیج دیتا ہے ۔ اگر زمینداروں کو اس طرف توجہ دلائی جائے تو بہت کم عرصہ میں زمینداروں کے لڑکے بہت زیادہ تعداد میں تعلیم حاصل کرنے لگیں گے اور پھر جب یہ واپس دیہات میں جائیں گے تو اس سے عام دیہاتی آبادی میں بیداری پیدا ہوگی ۔ اور اُن کی تنظیم کی جا سکے گی ۔ اس سلسلہ کی رفتار کو کہ دیہاتی اعلےٰ تعلیم کی طرف رجوع کریں اور پھر جلدی تعداد کے بڑھ جانے کی بنا پر دیہات میں منتشر ہونے لگیں تیز کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ بات جو آج سے پندرہ سال بعد عمل میں آنی ہے دس سال پہلے ہی رونما ہو جائے ۔

ایک اور امر جو دیہاتی بیداری کا موجب ہو سکتا ہے یہ ہے کہ نو آبادیوں میں تعلیم یافتہ دیہاتی لڑکوں کو اراضی دی جائے ۔ اس تجویز پر ایک معمولی حد تک عمل کیا گیا ہے ۔ اور چند لڑکوں کو اس طرح اراضی دی گئی ہے ۔ لیکن اُن کی تعداد کو ایک جگہ مرکوز کر دیا گیا ہے جس سے ان کو عام دیہاتیوں سے ملنے کے بہت کم مواقع ملتے ہیں اور اس طرح ان کا اثر دیہات میں نہیں پھیلتا ۔ اگر اس کے مقابلہ میں ان تعلیم یافتوں کو مختلف گاؤں میں اس طرح اراضی دی جاتی کہ کسی گاؤں میں دو یا تین سے زیادہ ایسے تعلیم یافتہ نہ ہوتے تو یہ بات زیادہ مفید ہوتی ۔ زراعتی کالج

لائل پور کے ملازمین میں سے چند ایسے ملازمین کو جنہیں قلت سرمایہ کی بنا پر ملازمتوں سے سبکدوش کر دیا گیا تھا اس طرح فی کس دو مربعہ اراضی دی گئی تھی ۔ اور اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ کسی گاؤں میں ایسے تعلیم یافتہ معطلی لہم کی تعداد دو سے زیادہ نہ ہو ۔ یہ تجویز پہلی تجویز کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب ہے ۔ پہلی تجویز کے مطابق بہت سے تعلیم یافتوں کی دو جگہوں پر بستیاں بنا دی گئیں جس سے ہر ایک بستی کے تعلیم یافتہ معطلی لہم صرف ایک دوسرے کی صحبت ہی میں رہتے ہیں اور عام دیہاتیوں سے انہیں کوئی واسطہ نہیں پڑتا ۔ برعکس موخر الذکر طریقہ کے مطابق اگر فی گاؤں دو یا تین تعلیم یافتہ شخص زراعت کو اپنا پیشہ بنائیں تو اُن کے اثر سے ضروری ہو کہ بہتر نتائج پیدا ہوں اور باقی ان پڑھ کاشتکار بھی اُن کی تقلید میں اپنی بہتری کا خیال کرنے لگیں ۔

ہمارا احساس کہتری

سب سے اخیر میں ایک اہم ترین بات جسے گوش گذار کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ عام ہندوستانیوں کے لیے اپنے احساس فروتنی کو دور کرنا بے حد لازمی ہے ۔ ہندوستانیوں کو اپنی کسی بات پر فخر نہیں ۔ نہ ملک پر نہ مذہب پر ۔ نہ تہذیب پر نہ عقل پہ نہ اپنی جسمانی و دماغی کوششوں اور کاوشوں کے نتائج ۔ یعنی فنون جمیلہ اور فنون کارآمد مثلاً آرٹ سنگتراشی مجسمہ سازی تعمیر اور دستکاری وغیرہ پر ۔ انہیں ہر بات میں اپنی خردی اور فروتنی کا احساس ہے ۔ یہ احساس مانع جرأت و جدت ہے ۔ گذشتہ کئی صد سالہ غلامی کے اثرات سے ملک بھر کی ذہنیت مسخ ہو گئی ہے ۔ اب جب کہ مسلمانوں کی حکومت نہیں اور اُن کی مقابلتاً برتری بھی معدوم ہے اور وہ صدہا سال سے عام ہندوستانیوں میں گھل مل کر ہندوستانی ہو چکے ہیں ۔ ان سے رقابت و مسابقت کے خیالات کو چھوڑ دینا چاہیئے اور بحیثیت مجموعی

ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی اور باہمی تعاون سے اور اکِ خوردی کو دور کرکے اس کی بجائے احساس برتری پیدا کرنا چاہیئے۔ عام ہندوستانیوں پر کیا ہندو اور کیا مسلمان غیر اقوام کا خوف طاری رہتا ہے اور وہ ہر معاملہ میں اپنے کو اُن کے مقابلہ میں ادنےٰ تصور کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ ان کے نزدیک اگر افغان جسمانی لحاظ سے برتر ہیں تو یورپی اقوام اپنی عقل و دانست کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ اس قسم کی خوف زدہ ذہنیت کو بدل ڈالنا چاہیئے اور اس کا طریقہ وہی ہے جو یورپی اقوام اپنی باہمی رقابت اور مخاصمت کی بنا پر ایک دوسرے کے خلاف برتتی رہتی ہیں۔ ہر ملت دوسری ملت کو ادنےٰ تصور کرتی ہے۔ یورپی اقوام ایک دوسرے کا مذاق اُڑاتی رہتی ہیں۔ انگریز جرمنوں اہل فرانس اور سکاٹ لینڈ والوں کے کارٹون بناتے رہتے ہیں۔ اسی طرح اہل فرانس اہلِ انگلستان اور اہلِ جرمن کا حلیہ بگاڑتے رہتے ہیں۔ اس سے ہر ملک کے باشندے اپنی نظروں میں حقیر نہیں ہونے پاتے۔ اگر انگلستان والے اہلِ فرانس کا مذاق اُڑاتے ہیں تو اس کا اثر اہلِ فرانس پر نہیں ہوتا کیونکہ وہ خود اُن کا مذاق اُڑانے میں اس قدر مصروف ہوتے ہیں کہ توجہ ہی نہیں دیتے اور یہی سمجھتے ہیں کہ وہ ادنےٰ ہیں اور خود اعلےٰ وعلی ہذا القیاس۔

اس معاملہ میں بھی یورپی ممالک کی تقلید کی ضرورت ہے اور ہندوستانیوں کو اور خاص کر ادیبوں اور مصوروں کو چاہیئے کہ وہ اور اقوام کا مذاق اُڑائیں اُن کی عادات و اطوار کو۔ اُن کی وضع قطع کو۔ اُن کی عقل و فکر کو۔ اُن کی ظاہری شکل و صورت کو لطیفوں اور چٹکلوں میں اُڑائیں۔ لیکن شائستگی کے ساتھ۔ اس سے ہندوستانی ذہنیت میں سے وہ احساس فروتنی اور ہیچ مائیگی جو گذشتہ صدیوں کی غلامی اور غیر اقوام کی دست درازیوں کی وجہ سے کوٹ کوٹ کر بھرا جا چکا ہے کسی حد تک خارج ہو جائے گا۔ اور وہ خود کو اوروں کے مقابلہ میں اگر اعلیٰ نہیں تو کم از کم اُن کے

برابر تو تصور کرنے لگیں گے۔ ہندوستانیوں کو اپنی قومی مشترکہ چیزوں پر فخر کرنے کی خو ڈالنی چاہیے۔ ہم اپنے دریاؤں میدانوں جنگلوں اور پہاڑوں پر فخر کر سکتے ہیں۔ ہم اپنے مصوروں اور مغنیوں پر فخر کر سکتے ہیں۔ ہم اقبال ٹیگور اور بوس کی سی شخصیتوں پر فخر کر سکتے ہیں۔ ہم بنگال کے ذہن وذکا اور پنجاب کے دنیا بھر میں بہترین سکھ اور مسلمان فوجی سپاہیوں پر ناز کر سکتے ہیں۔ ہم ہندوستان کے گاندھی ایسے سیاسئین پر ناز کر سکتے ہیں اور ہمارا فخر اور ناز بے جا نہیں ہوگا۔ صرف آنکھیں کھول کر دیکھنے اور اپنے پر فخر کرنے کی عادت ڈالنے کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات ہندوستانی غیروں کا خوف خود ہی ایک دوسرے کے دلوں میں بھر دیتے ہیں۔ کبھی بحیثیت اونکے انکو داد دے کر اور کبھی جاہلانہ اور بزدلانہ طور پر اُن کے کارناموں پر حیران ہو کر۔ ہندوستانیوں کو ایسا کرنے سے باز آنا چاہیے مثال کے طور پر فسانۂ آزاد میں ہندوستانی پہلوانوں کے ساتھ جو ایک ولائتی پٹھان کی کشتی کا قصّہ لکھا گیا ہندوستانی ذہنیت کو پست بنانے والا ہے۔ ہندوستانی بچے جب اس قصے کو پڑھتے ہوں گے تو اُن کے دلوں میں پٹھانوں کی جسمانی قوت اور اپنی کمزوری کا نقش بیٹھ جاتا ہوگا اور بالآخر یہی نقش احساس فروتنی کی صورت اختیار کر کے ان کی تمام ذہنیت پر چھا جاتا ہوگا۔ اس قسم کے قصوں کی بجائے اب اور قسم کے قصے اور واقعات قلمبند کرنے کی ضرورت ہے۔ جو اوروں کا مذاق نہیں اُڑاتے ہمیشہ سرنگوں رہتے ہیں۔ ہندوستانیوں کو ہر طریقہ سے یقین دلایا جانا چاہیے کہ اب اُن میں سر اٹھانے کی طاقت پیدا ہو گئی ہے اور انہیں بغیر جھجھک سر اُٹھانا اور تننا سیکھنا چاہیئے۔ اس کی سخت ضرورت ہے۔ ورنہ دنیا میں ہمارے لیے کوئی جگہ نہیں۔

تعلیم یافتہ طبقہ کو چاہیے کہ وہ عام ہندوستانیوں پر واضح کر دے کہ پیہم کوششوں

اور لگاتار قربانیوں سے حالت خواہ کتنی ہی پست کیوں نہ ہو بدلی جا سکتی ہے اور نامساعد حالات کی تیز دھار سے گھائل ہو کر پچھاڑیں کھانے کی بجائے ضبط کی ٹھوکروں سے حالات کو بدلنا انسان کے بس کی بات ہے۔

"مرد خود دارے کہ باشد پختہ کار
با مزاج او بسازد روزگار
گر نسازد با مزاج او جہاں
مے شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را
مے دہد ترکیب نو ذرات را"

(اقبال)

کھیلیں

اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ جو ٹیمیں دیگر ممالک سے ہندوستان میں آتی رہتی ہیں یا ہندوستانی ٹیمیں دیگر ممالک میں جاتی رہتی ہیں ایک ناواجب کاروائی ہے اور اس سے ملک کا بہت سا روپیہ ضائع ہوتا ہے۔ حقیقت میں کرکٹ ہاکی وغیرہ کے مقابلے پراپاگنڈا کے خیال سے بہت مفید ہوتے ہیں۔ دنیا ہندوستان کے اندرونی حالات سے بالکل ناواقف ہے اور اکثر معاندانہ پراپاگنڈا کے اثر کے تحت یہی خیال کرتی ہے کہ ہند ایک پس ماندہ وحشی اور غیر مہذب ملک ہے۔ اس قسم کا پراپاگنڈا دیگر ممالک کے اہل قلم کی مہربانیوں کا نتیجہ ہے۔ اگر اس پراپاگنڈا کے زہریلے اثرات کو زائل کرنے کے لیے وہی ذرائع اختیار کیے جائیں جو مخالفین نے

اس کے پھیلانے کے لیے برتتے تھے یعنی تصنیف اور زبانی بول چال تو ایسا کرنا بہت گراں خرچ محنت اور وقت طلب ہوگا۔ دیگر ممالک کے باشندوں کے دلوں سے اس پروپاگنڈا کے اثرات کو محو کرنے کے لیے جتنا کام دنیا کا دورہ کرنے والی ایک کامیاب ہندوستانی ٹیم جتنے کم عرصہ میں سرانجام دے سکتی ہے وہ کئی مقرر اور مصنف لاکھوں کے مصارف سے بھی اتنے کم عرصہ میں سرانجام نہیں دے سکتے۔ مقرر اگر دورہ کریں تو بہت کم تعداد پر مشتمل مجمعوں کے سامنے ہندوستان کی طرف سے صفائی پیش کرسکیں گے۔ مصنف اگر ایسا کریں تو اُن کی کتب چند خواندہ اصحاب کے مطالعہ سے ہی گذریں گی اور عوام کے مختلف طبقوں تک شائد وہ پہنچیں بھی نہ۔ لیکن ایک ٹیم خواہ ہاکی ٹیم ہو خواہ کرکٹ ٹیم جب سفرِ عالم اختیار کرتی ہے تو عوام کی توجہ براہ راست اپنی طرف مبذول کرلیتی ہے۔ عوام میچ دیکھنے کے لیے آتے ہیں ہندوستانی کھلاڑیوں کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ ہم نے تو ان لوگوں کے متعلق کچھ اور ہی سمجھا تھا لیکن یہ نکلے کچھ اور ہی ہیں۔ یہ پروپاگنڈا بلا واسطہ طور پر ہوتا ہے اور اس سے ان غیر ممالک کے لوگوں نے جو اثرات اخذ کیے ہوتے ہیں مٹ جاتے ہیں اور مخالفین نے سالوں کی محنت اور کاوش سے جو ایک رائے عامہ قائم کردی ہوتی ہے اس کی فوراً ترمیم ہوجاتی ہے ہماری ہاکی ٹیم کا اثر دنیا پر یہی ہوا ہے۔ اس ٹیم کے ذریعہ ہندوستان کا تعارف ممالکِ عالم سے ایک شاندار طریقہ سے ہوا اور یہ ایک نہایت موثر طریقہ تھا۔ ہندوستان کی آبادی کی مشترکہ ملیت کے اظہار و اعلان کیلئے اس قسم کی ٹیموں کی حوصلہ افزائی نہایت مفید ثابت ہوسکتی ہے۔

ملیت کے نقطۂ نگاہ کے پیشِ نظر ہندوستان کے حالات مختصراً عرض کردیے گئے ہیں اُن کو سامنے رکھ کر اپنی کمزوری کا اندازہ کرنا لازمی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کمزوری کا اندازہ کرکے ہندوستانی اپنے دلوں میں ایک ادراک فروتنی پیدا کرلیں۔ بلکہ

مقصد یہ ہے کہ وہ اس کمزوری کا احساس کرتے ہوئے اس کو دور کرنے کی کوشش کریں تاکہ ان کی ملی اور اقتصادی ترقی ممکن ہو سکے ۔ نیز ان کو حکومتِ انگلشیہ کی طاقت کا بھی احساس ہونا چاہیے ۔ ہندوستان میں اس وقت انگریزوں کی کل تعداد ۱۲۵۰۰۰ ہے ۔ اور ہندوستانیوں کی کمزوری کی یہ حالت ہے کہ اگر موجودہ حالات قائم رہیں تو انگریزوں کی کل تعداد کی عدم موجودگی میں بھی گورنر جنرل اور اس کے ماتحت ہر صوبہ میں ایک گورنر ہندوستان کو قابو میں رکھ سکتا ہے ۔ ہماری کانگرس کی گذشتہ مساعی اور اغیار حکومت کی طاقت کے پیش نظر کچھ حقیقت نہیں رکھتے ۔ ابھی اور زیادہ ایثار، اور زیادہ مصلحت انگیز احساسِ غلامی اور اپنی بہتری کے لئے انگریزوں سے مزید مخلصانہ لیکن باعزت اشتراکِ عمل کی ضرورت ہے ۔

ضمیمه

مغربی تہذیب

اُس مسابقت کی بنا پر جو مشرق کو مغرب سے ہے اکثر و بیشتر ہم مغربی تہذیب پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں لیکن باوجود اس نکتہ چینی کے ہم اُس کے اثرات سے نہیں بچ سکے۔ مشرق اس وقت مغربیت کے رنگ میں رنگا جا رہا ہے۔ لیکن یہ رنگ محض سطحی ہے۔ ہم ظواہر کو مغربی تہذیب تصور کر کے اُن پر کاربند ہو جاتے ہیں لیکن جب جغرافیائی اور اقتصادی حالات کی بنا پر چند مجبوریاں سدِ راہ ہوتی ہیں تو ان سے بیزار ہو کر مغربی تہذیب پر نکتہ چینی شروع کر دیتے ہیں اور یہ محض اُن ظاہری اثرات کے متعلق خوردہ بینی تک ہی محدود رہتی ہے۔ تہذیب کو جس سے مراد وہ اصول، طریق اور دستور ہوتے ہیں جن کی مدد سے فرد کو اس کی ذات اور اس کی جماعت کے لیے مفید بنایا جاتا ہے سمجھنے کی ہم کبھی کوشش نہیں کرتے ہم نے ان معانی میں مغربی تہذیب کو جاننے کی شاذ و نادر ہی کوشش کی ہوگی۔ بسا اوقات تہذیب اور اس سے پیدا ہونے والے ظواہر میں تمیز نہیں کی جاتی۔ تہذیب بنیادی اصولوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اور ظواہر اس تہذیب سے پیدا ہونے والے ان ضمنی اثرات پر مشتمل ہوتے ہیں جن میں وضع قطع، چال ڈھال، طرزِ گفتار، اطوار، سلیقہ اور لباس وغیرہ سی چیزیں شامل ہیں۔ اکثر جب ہم کسی تہذیب پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو اس وقت تہذیب سے ہماری مراد اس کے یہی ظواہر ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان ظواہر کی اتنی اہمیت نہیں ہونی چاہیے جتنی کہ اس تہذیب کے بنیادی اصولوں کو حاصل ہے۔

اگر بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو مغربی تہذیب کی تہ میں جتنے بھی اصول کارفرما ہیں ان سب کی بنا فقط ایک خیال ہے۔ اس خیال کو خواہ مطمحِ نظر کہیں یا نصب العین کے نام سے موسوم کریں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ قرونِ وسطےٰ میں تمام مغرب کی ذہنیت میں ایک تبدیلی واقع ہوئی جسے نشاۃِ ثانیہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ نشاۃِ ثانیہ سے پہلے دنیا اور خاص کر مغرب کا نصب العین رہبانیت کی تحریک سے نفس کُشی یا صغارتِ نفس تھا۔ لیکن اس کے بعد یہ نصب العین بدل گیا اور اس کی جگہ ایک ایسے نصب العین نے لی جو اس کی بالکل ضد تھا۔ یعنی شہامتِ نفس۔ اب چونکہ لوگوں کا مطمحِ نظر بالکل مختلف ہو گیا تھا۔ وہ نفس کشی، ترکِ نفس، نفیِ خودی، گوشہ نشینی وغیرہ کو بھول کر اثباتِ خودی کے قائل ہو گئے اور ان میں احساسِ فروتنی کے دور ہونے سے احساسِ برتری پیدا ہو گیا جس کا لازمی نتیجہ انفرادیت یا ارتقائے تشخص تھا۔

مغربی تہذیب کی تہ میں جو پانچ بنیادی اصول کارفرما ہیں۔ ان میں سے سب سے پہلا اور سب سے زیادہ اہم ارتقائے تشخص کا خیال ہے۔ باقی کے چار اصول جو بلا واسطہ یا بالواسطہ اس سے پیدا ہوئے یہ ہیں:۔

۱۔ پابندیِ آئین۔ ۲۔ آزادہ روی۔ ۳۔ قومیت۔ ۴۔ اور جمہوریت۔ قرونِ وسطےٰ سے پیشتر سیاسیات یا اجتماعیات میں عوام کے مختلف گروہوں یا جماعتوں کو اہمیت دی جایا کرتی تھی۔ لیکن جونہی ارتقائے تشخص لوگوں کا نصب العین بنا یہ اہمیت فردِ واحد کو ملنے لگی۔ کیونکہ اس کی طرف سے اس کا پُرزور مطالبہ ہونے لگا تھا۔ ارتقائے تشخص سے مراد خاص اثرات پیدا کرنے کے لیے شخصیت کی جسمانی و باطنی خصوصیات کو ترقی دینا تھا۔ یعنی اماراتِ نفس۔ امارتِ نفس سے انسانی تگ و تاز کے لیے دو راستے کھل گئے۔ اول اجتماعیات میں تالیفِ قلوب

یعنی فرد کا اپنی ذاتی خصوصیات کے طفیل جماعت پر تسلط جما کر اس کی رہبری کرنا۔ دوم قدرت میں تسخیرِ عناصر یعنی سائنس کی ترقی جس میں آرٹ بھی شامل ہے۔ کیونکہ یہ بھی آرٹسٹ کے نفسی تاثرات کا عناصر کے ذریعہ اظہار ہوتا ہے۔

"خویش را چوں از خودی محکم کنی
تو اگر خواہی جہاں برہم کنی"

اگر کسی جماعت کے ہر ایک فرد کو ایک خاص شخصیت حاصل ہو اور اس میں خودی یا "میں پن" کا خیال بدرجۂ اتم محکم ہو جائے تو پھر شدید پابندی قانون کے بغیر اس جماعت کا قائم رہنا ناممکن ہوتا ہے۔ اس لیے انفرادیت کا اگر ایک طرف تقاضا یہ تھا کہ فرد کی ذاتی مرضی پر کوئی پابندی عائد نہ ہو اور وہ آزاد ہو تو دوسری طرف اس کو اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ فرد کی ہستی محفوظ ہو جائے۔ اس لیے اگر جماعت کے افراد میں آزادہ روی تھی تو اس کے ساتھ ہی اُن میں آئین کی پابندی اور قانون کے احترام کا جذبہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ لہذا آزادی سے جو مراد لی جانے لگی وہ یہ تھی۔ جماعت کا اپنے وضع کردہ قوانین کو اپنے آپ پر نافذ کرنا اور اُن کے سامنے تمام افراد کو مساوی حیثیت عطا کرنا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ قانون نے فرد کی ذاتی آزادی کو بچایا۔ اور فرد کی آزاد رہنے کی تمنا نے قانون کو غیر ضروری طور پر سخت، کڑا ناقابلِ ترمیم اور ہنگامی حالات سے بے نیاز نہ ہونے دیا۔ اور چونکہ ضروریاتِ زمانہ کے مطابق اس میں ترمیم ہوتی گئی اس لیے وہ ترقی کی راہ میں حائل نہ ہوا۔ حتیٰ کہ انفرادیت انانیت میں بدل کر تسخیرِ قدرت کی طرف مائل ہوئی۔ سائنس نے ترقی کی اور ان ذرائع کی مدد سے جو قدرت کو رام کرنے سے اہلِ یورپ کو ہاتھ لگے اُنھوں نے استیلاء و غلبہ حاصل کیا اور دنیا پر چھا گئے۔ اگر قانون ناقابلِ ترمیم ہوتا تو سائنس کی ترقی نہ ہوتی اور اس کے ذریعہ سے جو فائدہ آج

یورپ کو ہوا ہے کبھی نہ ہوتا۔ انفرادیت کا چوتھا اثر یہ تھا کہ جماعت کا ہر رکن اپنے آپ کو دوسرے رکن کے برابر سمجھنے لگا یعنی مساوات کا خیال پیدا ہو گیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ شہنشاہیت کا وقار کم ہو جاتا۔ اور عوام جمہوریت کے دلدادہ بن جاتے۔ جمہوریت کے معنی ایک نکتۂ نگاہ سے یہ بھی ہونے لگے کہ ایک ایسی حکومت جس میں ہر فرد واحد کو اپنے ذاتی جوہر یا کمال کی بنا پر برسر کار آنے کا موقع میسر آسکے۔

ارتقائے تشخص کے نصب العین نے جو چوتھی بات اہل مغرب میں پیدا کی وہ وطنیت کا جذبہ تھا۔ جماعت فرد کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اگر فرد " وانمودن خویش را خودئے خودی ست" کا قائل ہوتا ہے تو جماعت میں یہ خیال بدرجۂ اتم علاً ظاہر ہو جاتا ہے۔ جماعت بھی اثباتِ خودی کے اصول پر محکم ہو کر شہامت چاہنے لگتی ہے۔ لیکن اس کے لیے افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کرنا اور ان میں یکسانیت اور یگانگت پیدا کرنا لازمی ہوتا ہے۔ اور یہ وہ جذبہ ہے جسے عام طور پر وطنیت یا قومیت وغیرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ نسلی، ملکی اور دیگر جغرافیائی حالات کی وجہ سے کسی خاص ملک کے باشندوں میں یہ جذبہ پہلے سے موجود تو ہوتا ہے لیکن انہیں اس کا شعوری طور پر احساس پیدا نہیں ہوا ہوتا۔ جب جماعت میں خودی کا جذبہ پیدا ہو کر نفسِ اجتماعیہ کا اظہار یعنی استیلا اور استبداد چاہتا ہے تو یہ جذبہ شعوری طور پر ظاہر ہو کر ان کو ایک کر دیتا ہے۔ اور چونکہ فرد کا مفاد جماعت کے مفاد کے مقابلہ میں کچھ اہمیت نہیں رکھتا اس لیے اُسے قربان بھی کیا جا سکتا ہے۔ مغربی تہذیب کا یہی ایک درخشاں پہلو ہے کہ فرد جماعت کے وسیع مفاد کے مقابلہ میں اپنی ذات کو قربان کر دیتا ہے۔ شروع میں اس جذبہ کے تحت یورپین ممالک نے ایک دوسرے کو مغلوب کرنے کی کوشش کی۔ لیکن چونکہ وطنیت کا جذبہ ہر ایک ملک میں موجود تھا اس لیے کوئی غیر ملک

دوسرے ملک پر تا دیر غلبہ قائم نہ رکھ سکا۔ اور جب مختلف یورپین ممالک ہر اعتبار سے ایک دوسرے کے ہم پلہ ہو گئے اور استیلاء کی خواہش یورپ میں رہ کر پوری نہ ہو سکی تو اُنہوں نے دوسرے براعظموں کی طرف رخ کیا۔ ایشیا، افریقہ، امریکہ اور آسٹریلیا میں وہ کامیاب ہو گئے ؎

"زندگانی قوتِ پیدا ستے
اصلِ او از ذوقِ استیلا ستے"

ان کے علاوہ ایک ضمنی نتیجہ جو انفرادیت سے مترتب ہوا۔ وہ کنبے یا خاندان کی اہمیت کی کمی اور کنبے کی طرف سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں سے فرد کی آزادی پر مشتمل تھا۔ ہر بالغ شخص اپنے آپ کو اپنے سیاہ و سفید کا مالک سمجھنے لگا۔ والدین اور بہن بھائیوں سے مل کر جو ایک کنبہ بنتا ہے اس کی ایک حد تک تنسیخ ہو گئی۔ بعض اوقات انسان اپنے آپ کو خطرے میں محض اس لیے نہیں ڈالتا کہ اس کے کنبے کے باقی افراد کو اس کے تلف ہو جانے یا اُسے کسی قسم کا نقصان پہنچنے سے تکلیف نہ ہو۔ اگرچہ یہ ایک قسم کا ایثار ہے لیکن مانع جرأت۔ اگر کنبہ کے افراد کا آپس میں اس قسم کا تعلق قائم نہ رہے تو فرد چونکہ اُس پہ اوروں کی طرف سے کوئی ذمہ داریاں عائد نہیں ہوتیں نڈر ہو جاتا ہے اور کسی زیادہ اعلےٰ و ارفع مقاد کی خاطر اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے سے دریغ نہیں کرتا۔ اسے برتری حاصل کرنے کی خواہش کو کنبہ کی خاطر قربان کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کی ذاتی سرگرمیاں نہیں رکتیں اور سائنس کی ترقی ماند نہیں پڑتی۔ تحقیق و تدقیق، سیر و سیاحت، ایجاد و دریافت کا جذبہ جو اس وقت یورپ میں موجود ہے اس کی وجہ کنبے کے علائق کی کمی اور فرد کی محکم شخصیت ہی ہے۔

"ممکنات قوتِ مردانِ کار
گردد از مشکل پسندی آشکار"...

ان بنیادی اصولوں کو بیان کر دینے کے بعد ہم مغربی تمدن کے چند ظواہر کو لیتے ہیں جن سے اس وقت اہلِ مشرق اور اہلِ مغرب دونوں بیزار نظر آتے ہیں۔ یہ ظواہر لباس کی زیبائش، سامانِ تزئینِ حسن، نمودِ حسن اور دیگر کمزوری اخلاق پر منتج لوازم پر مشتمل ہیں لوگ اِن ظواہر ہی کو مغربی تہذیب سمجھ کر اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ یہ ظواہر صرف چند حالات کی وجہ سے اہلِ یورپ میں پیدا ہو گئے تھے۔ شروع میں ان کی وجہ تشخص ہی تھا۔ سوسائٹی میں افراد اپنی شخصیت کو ہر طرح ممتاز دکھانے کے متمنی تھے۔ اس کے لیے متناسب الاعضا خوبصورت جسموں کی اور اُن پر اچھے لباسوں کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یہی خیال اچھی جسمانی حالت اور درست لباس رکھنے کا محرک ہوا۔ لیکن یورپ کی موجودہ ہوس کا رانہ زندگی جنگِ عظیم کی متعاقب ہے۔ پُر تکلف اور خلافِ اخلاق اطوار جنگ ہی کا نتیجہ ہیں۔ جنگِ عظیم یورپ کے لیے ایک سخت ترین مصیبت تھی۔ اہلِ مغرب لاکھوں کی تعداد میں جنگ میں شامل ہوئے۔ ان کو بھوک پیاس، تھکاوٹ، بیماری، غریب الوطنی ایسے ہر قسم کے مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ مورچوں کی زندگی سے اُکتا گئے۔ کئی سال کے بعد جب جنگ ختم ہوئی اور جو بچے وہ واپس گھروں کو گئے تو ان میں ایک ردِعمل شروع ہوا۔ جنگ سے واپس آنے کے بعد وہ اس اصول پر کاربند تھے۔ کہ

"بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"

عیش پرستی اور ہوس پرستی بڑھ گئی۔ اس وجہ سے تھیٹروں اور شراب خانوں کی رونق میں اضافہ ہو گیا۔ تھیٹروں کے مینجروں نے وہی چیزیں بہم پہنچائیں جن کا مطالبہ

تھا۔ یورپ کی زندگی غیر متین ہوگئی۔ ناچ رنگ اور عیش وعشرت بڑھ گیا۔ گردنیں۔ سینے پنڈلیاں اور بازو ہوس کی توجہ منعطف کرانے کے لیے برہنہ ہو گئے۔ لپ سٹک پوڈر وغیرہ کا استعمال بھی شروع ہوا اور آغاز میں یہ سب کچھ تھیٹروں تک ہی محدود رہا۔ لیکن بعد میں عام سوسائٹی میں پھیل گیا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جنگ میں بہت سے مرد مارے گئے تھے۔ اور مردوں کی تعداد عورتوں کے مقابلہ میں کم ہوگئی تھی۔ قدرتاً اس سے عورتوں میں ایک جدوجہد کا بازار گرم ہوگیا۔ چنانچہ ہر قسم کے حربے استعمال کیے جانے لگے اور زیبائش اور تزئینِ حُسن و نمودِ حسن کی تدبیریں عام سوسائٹی نے اختیار کرلیں۔ اور مردانہ جذبات سے ہر ممکن طریقہ سے اپیل کرنا شروع کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ (SLIMMING) سلمنگ یا جسم پتلا کرنے کی تہ میں بھی یہی راز پنہاں ہے کہ عورت کی کمزوری کی طرف توجہ دلا کر مرد کے رحم کے جذبات سے اپیل کی جائے تاکہ وہ مربی، مددگار اور محافظ بننے پر آمادہ ہو جس طرح اہلِ مشرق اور خاص طور پر اہلِ ہند مغربی تہذیب کے دیگر ظواہر کی نقل کرتے ہیں دخترانِ ہند نے بھی ان نئے رجحانات کو اپنا شعار بنانا شروع کر دیا ہے۔ اگر تعلیم یافتہ ابنائے وطن کی اچھی مغربی پوشش کا مقابلہ اُن کی ردی جسمانی حالت سے کیا جائے تو حافظ کا "طوقِ زریں" والا مصرع یاد آجاتا ہے۔ ابنائے وطن اگر جسمانی اور باطنی خوبیوں سے عاری ہوں گے تو صرف مغربی لباس اور زبان انہیں حکمرانوں کے ہم پلہ نہیں بنا سکتے۔ کیونکہ یہ مغربی حکمران اخلاص اتحاد، اشتراکِ عمل اور ایثار سے۔ ع

"خویش را از خود بروں آوردہ اند"

کاش کہ اہلِ مشرق مغربی تہذیب کی حقیقت کو جانیں اور اس کے ان بنیادی اصولوں پر کاربند ہوں۔ جن پر عمل پیرا ہونے سے یورپ نے موجودہ امتیاز حاصل کیا ہے ظاہریت کی

نقل کرنا آسان ہوتا ہے ۔ لیکن حقیقت کو سمجھ کر اُس کے مطابق عمل کرنا مشکل ۔ جن معانی میں مغربی تہذیب کو یہاں پیش کیا گیا ہے اگر ہم ان کے مطابق مہذب ہو جائیں تو یہ ہماری عین خوش قسمتی ہو گی ۔ ورنہ مغربیت محض لباس اور زبان تک ہی محدود نہیں ۔ اگر ہم اس کو انہیں چیزوں تک محدود کرنے پر مصر ہوں گے تو مفادِ مشرقی کے پیشِ نظر دردمندانِ مشرق کا یہ خیال بہت حد تک درست ثابت ہو گا ۔

"طبِ مغرب کے مزے میٹھے اثر خواب آوری"

جمہوریت

پر

مختصر نوٹ

جمہوریت سے مراد

جمہوریت کو اکثر جمہوری حکومت کے مترادف خیال کیا جاتا ہے۔ لنکن کی مشہورِ عالم تعریفِ جمہوریت میں بھی یہی تصور کیا گیا ہے کہ جمہوریت اور جمہوری حکومت ایک ہی چیز ہیں لنکن نے جمہوریت کی جو تعریف کی ہے وہ یہ ہے۔ عوام کی حکومت عوام کے لیے اور عوام کی طرف سے۔ جمہوری حکومت کی اس تعریف کا مطلب ایک ایسی حکومت ہے جس کو عوام قائم کریں اور عوام کے مفاد کے لیے قائم کریں اور اس میں عوام ہی حکمران ہوں اور عوام ہی محکوم۔ اس قسم کی کوئی حکومت نہ تو کبھی قائم ہوئی ہے اور نہ ہی قائم ہو سکے گی۔ جمہوری حکومت دراصل ایک ایسی حکومت ہوتی ہے جس میں بالواسطہ طور پر ضبط و نظم کے اختیارات یا انتہائی سیاسی اختیارات تمام جمہور کو حاصل ہوتے ہیں۔ جمہوریت سے مراد صرف جمہوری حکومت ہی نہیں بلکہ جمہوریت کسی سوسائٹی یا قالیطی (پالیٹی) کی بھی صفت ہو سکتی ہے۔ جب لفظِ جمہوریت کسی سوسائٹی یا قالیطی کی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد ایک ایسا نقطۂ خیال اور ذہنیت ہوتی ہے جس کی بالعموم موجودگی کسی خاص قوم یا جماعت کے افراد کو جمہور کہلانے کا مستحق بنا دیتی ہے۔ اس نقطۂ خیال یا ذہنیت کے لیے چند معتقدات اور لوازمات کی موجودگی

لازمی ہے۔ پہلا عقیدہ یا معتقدیہ ہے کہ لوگ باہمی طور پر مساواتِ عامہ کے قائل ہوں یعنی ہر شخص کم وبیش یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ سب انسان ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ نہ کوئی بڑا ہے اور نہ کوئی چھوٹا۔ اور تمام امتیازات جن کی بنا پر سوسائٹی مختلف طبقوں میں بٹی ہوئی ہے امر اتفاقیہ ہیں۔ دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ کم وبیش تمام جماعت کا یہ خیال ہو کہ انسان فطرتاً نیک اور شریف الطبع واقع ہوا ہے اور جب اسے کوئی اختیار یا طاقت دی جاتی ہے تو وہ اس کا ذمہ دارانہ اور شریفانہ استعمال کرتا ہے۔ تیسرا ضروری عقیدہ یہ ہے کہ جماعت کے سب افراد اس بات کے قائل ہوں کہ ہر ایک انسان میں کچھ نہ کچھ عقل سلیم اور کوئی نہ کوئی قابلیت ضرور موجود ہوتی ہے جس کی تربیت اور نشوونما سے وہ اپنے آپ کے لیے نیز اپنی جماعت کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

لوازمات میں سے پہلا لازمہ یہ ہے کہ جماعت بذاتہ ایک وحدانی حیثیت حاصل کر چکی ہو۔ دوسرا لازمہ یہ ہے کہ بحیثیتِ مجموعی اس جماعت میں رائے عامہ کی ترقی ہو چکی ہو اور عام رجحانات اور خیالات کے مدِنظر بھی اس کے افراد میں کسی حد تک ایک یکسانیت موجود ہو۔

جمہوریت کے متذکرہ صدر تین معتقدات کے پیشِ نظر ہند وستانی آبادی کے مسلم اور سکھ عنصروں کے متعلق وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ان میں جمہوریت موجود ہے۔ لیکن آبادی کے ہندو عنصر کے بارہ میں یہ دعوےٰ کرنا محال ہے۔ ذات پات کی تمیز اور چھوت چھات جمہوریت کے منافی ہے۔

جمہوری طرزِ حکومت

حکومت کے دیگر نظاموں سے جمہوری نظام اس لحاظ سے مختلف ہوتا ہے کہ اس میں

انتہائی سیاسی اختیارات جمہور یعنی عوام کو حاصل ہوتے ہیں اور جمہور ہی ان اختیارات کو اپنے نمائندوں کو تفویض کرتے ہیں۔ اور اُن کے نمائندے اُن کی بجائے نہ کہ بطور خود ان تمام اختیارات کا استعمال کرتے ہیں۔ جمہوری نظامِ حکومت کی تین قسمیں ہیں۔ اول صدارتی اس میں جمہور شعبۂ انتظامیہ، شعبۂ عدلت گستری اور شعبۂ قانون ساز کو علیحدہ علیحدہ معرضِ وجود میں لاتے ہیں اور یہ تینوں شعبہ جات بلحاظ حیثیت اور اہمیت ایک دوسرے کے مساوی ہوتے ہیں اور ان میں سے کوئی ایک کسی دوسرے کے ماتحت نہیں ہوتا۔ ہر ایک براہِ راست حسن کارکردگی اور اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے جمہور کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ ہوتا ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں اس قسم کی جمہوری حکومت قائم ہے۔

دوسری قسم کی جمہوری حکومت وہ ہے جسے حکومت کابینہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس میں اور قسم اوّل میں یہ فرق ہوتا ہو کہ شعبۂ انتظامیہ اور شعبۂ عدلت گستری اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی کے لیے مجلسِ قانون ساز کے سامنے جواب دہ اور ذمہ دار ہوتے ہیں اور اُن کا براہِ راست جمہور سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جمہور ان پر اپنے نمائندوں کے ذریعہ سے جو مجلسِ قانون ساز کے رکن ہوتے ہیں ضبط و نظم قائم رکھتے ہیں۔ مجلسِ قانون ساز ہی ان کی حسن کارکردگی کے لیے ذمہ دار ہوتی ہے۔ فرانس اور انگلستان کی حکومتیں اس قسم کی ہیں۔

جمہوری حکومت کی تیسری قسم ڈکٹیٹرشپ (آمریت) ہے اس میں جمہور کسی فردِ واحد کو اپنی طرف سے ہر سیاہ و سفید کا مالک بنا دیتے ہیں۔ اور وہ ہر قسم کے انتہائی سیاسی اختیارات کے استعمال کا مجاز ہوتا ہے۔ اٹلی، جرمنی اور ترکی کی حکومتیں اس قسم کی ہیں۔

مختلف پہلوؤں سے جمہوریت کے مقاصد اور نصب العین

جیسا کہ اشارۃً بیان کیا جا چکا ہے جمہوریت کے لیے عوام میں اس عقیدہ کی موجودگی لازمی ہے کہ ہر ایک شخص میں کوئی نہ کوئی قابلیت اور کچھ نہ کچھ عقل سلیم ہوتی ہے۔ اس عقیدہ کے پیش نظر جمہوریت کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص کی قابلیت کو استعمال میں لایا جائے تاکہ ہر ممکن عام انسانی قابلیت کے ہر ممکن استعمال سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر سوسائٹی کا ارتقا جلد عمل میں آسکے۔

دوسرے پہلو سے جمہوریت کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ سیاسی اختیار دیا جائے جس کی بنا پر وہ حکومت کے قائم کرنے میں شریک ہو کر حکومت یا اس کے ملازمین کے استبداد سے محفوظ ہو جائے۔ نیز حکومت قانون کا نفاذ کرتے وقت سب اشخاص کی حیثیت کو برابر تصور کرتے ہوئے غیر جانبدارانہ طور پر عمل کرے۔ اور سب لوگ قانون کی نظروں میں برابر ہو جائیں۔

جمہوریت کا نصب العین یہ ہے کہ سب کو یکساں طور پر حد درجہ کی مسرت آرام فرصت اور خوشحالی بہم پہنچائی جائے تاکہ ہر فرد واحد کو جسمانی و روحانی ترقی کرنے کے بیش از بیش مواقع یکساں طور پر مل سکیں۔

جمہوریت سے وابستہ خطرات

جمہوریت کی سرشت میں دو خطرے پنہاں ہیں۔ اوّل یہ کہ آغازِ جمہوریت میں اوسط درجہ کی قابلیت اور استعداد رکھنے والے بااثر اشخاص برسرکار آکر قوت حاصل کرتے ہیں اور

اعلیٰ قابلیت اور حد درجہ کی استعداد رکھنے والے اشخاص کو خدمتِ خلق کا موقع نہیں ملتا وکیل سیاسیئین زمیندار یا سرمایہ دار جاہ طلب اپنی چرب زبانی یا اثر سے امورِ عامہ سے متعلقہ امتیازی حیثیتیں حاصل کر لیتے ہیں اور مفادِ عامہ کے پیش نظر جمہور اور جمہوری حکومت کے لیے ان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی مثالیں اس وقت جبکہ ہمارے ملک میں جمہوریت کا آغاز ہے عام مل سکتی ہیں۔ لیکن جمہوریت کا ہمیشہ یہی تقاضا رہتا ہے کہ زمامِ حکومت حقیقی معانی میں قابل اور اہل اشخاص کے سپرد کی جائے۔ کم و بیش یہ خطرہ جمہوریت کو ضرور پیش آتا ہے۔ لیکن جمہور کی جوں جوں سیاسی اور ادبی تربیت ہوتی جاتی ہے اس کا امکان بھی کم ہو جاتا ہے۔ اگر اس خطرہ کو جلد دور نہ کر دیا جائے تو بالآخر جمہوری حکومت کی آڑ میں حکومت امرار کار فرما ہو جاتی ہے۔ عوام سے اختیارات چھن جاتے ہیں اور چند امرار ان کو غصب کر کے استبدادیت کی طرح ڈالتے ہیں۔ اس خطرہ کی تصریح حسب ذیل شعر میں کی گئی ہے:۔

"دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری"

اقبال

دوسرا خطرہ جو جمہوریت کو اکثر رہتا ہے یہ ہے کہ جمہور میں فرداً فرداً آزادہ روی اس قدر زیادہ آ جاتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی طبع مطلق العنانی چاہنے لگتی ہے۔ جس سے نظم و نسق اور اتحاد و اشتراک کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ ان قباحتوں کی عدم موجودگی میں جمہوریت مشیتِ ایزدی کے مطابق ہے اور آوازۂ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو ایک پُرمعنی حقیقت ہے۔ آوازِ خلق حق اور سچائی کی حامل ہوتی ہے۔ اگر اقلیت راستی پر ہو تو وہ بہت جلد

اکثریت میں بدل جاتی ہے +

"باضعیفاں گاہ نیروے پلنگاں مے دہند
شعلۂ شاید بروں آید زفانوسِ حباب!"